
بابائے قوم شہید محمد مقبول بٹ

کی زندگی، جدوجہد، قربانیوں، انکے خطوط،
تحریر، تقاریر، اخباری کافرنسوں، نظریات
و افکار پر مبنی دستاویز

روشنی کا شہید اول

مرتب

محمد حسین الطاف

شائع کردہ: جموں کشمیر لبریشن فرنٹ مقبول منزل سرینگر

اے روشنی کے شہید اول۔۔۔۔۔ قسم خدا کی تو سرخرو ہے

اے رات بھر کے جھکے مجاہد	گواہ رہنا، گواہ رہنا
اے روشنی کے شہید اول	وہ نوع مقدس وہ جان معظم
آزادیوں کا نصاب تم ہو	وہ نام افضل وہ ذات اعلیٰ
شجاعتوں کی کتاب تم ہو	وہ حرف خوشبو وہ لفظ عقیدہ
جو مائیں دیکھیں وہ خواب تم ہو	زبان پیبر وہ بات اعلیٰ
لہو چمن کا گلاب تم ہو	وہی پیبر۔۔۔۔۔ وہی عقیدہ
ضعیف ہم ہیں شباب تم ہو	کروڑ انسان ہیں سرخیدہ
اے رات بھر کے جھکے مجاہد	کہاں تو سویا خبر نہیں ہے
اے روشنی کے شہید اول	قبر نہیں ہے
قبول مولا، قبول کرنا	مگر یہ بندے نثار تیرے
گواہ رہنا گواہ رہنا	کروڑ دل ہیں مزار تیرے
وہ زوری کا گیارہواں دن	تو نور حق کا چراغ زندہ
ستم زدہ دن، وہاں تو ان دن	تو غیر فانی دماغ زندہ
آزاد سورج لہو چہرہ کتا	تو روشنی کا شہید اول
طلوع ہوا تھا	کرن کرن آفتاب زندہ
غلام شرق کے پر بتوں پر	قبول حق کے رو بہو ہے
لہو ہوا تھا لہو ہوا تھا	قسم خدا کی تو سرخرو ہے
لہو میں اٹھڑا وہ بیکران دن	سلام اقدس، سلام اقدس
وہ زوری کا گیارہواں دن	اے رات بھر کے جھکے مجاہد
قبول مولا قبول مولا	اے روشنی کے شہید اول۔۔۔۔۔ محمد یابین

شہید بابائے قومؒ
کوئے یار سے
سوئے دار تک

بسم الله الرحمن الرحيم

حرف اول

زندہ اور باشعور قومیں اپنے محسنوں، بہی خواہوں، راہنماؤں اور انقلابی دانشوروں کو اپنی عمومی، اجتماعی اور قومی زندگی کا حصہ بنا لیتی ہیں۔ یہ سلسلہ ان عظیم نفوس کے افکار، نظریات، خیالات اور تذکروں کی وساطت سے نسل در نسل قومی و ملی اٹاٹے کی صورت میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس اٹاٹے کی مستقل ترسیل قوموں کی زندگی کا ضامن ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام زندہ اقوام اپنے قائدین، شہداء، اور مفکرین کے نظریات کی روشنی میں اپنے لئے قومی زندگی کا لائحہ عمل بناتیں ہیں۔ جدید امریکہ کے بانی صدر ابراہم لنکن، مارٹن لوتھر کنگ، جی کوریا، نپلسن منڈیلا، یاسر عرفات، شیخ یاسین، قائد اعظم محمد علی جناح، ماہتا گاندھی، اور ان جیسے دوسرے قائدین کے نظریات کو آج بھی ان کے ممالک اور ان کی قوموں نے اپنا اٹاٹہ بنا کے رکھا ہے۔ جموں کشمیر کے اندر رفاہی اور پھر اغیار کے جبر و تسلط نے اس جذبے کو از حد متاثر کیا۔ دراصل استعمار اور ظلم و جبر کی طاقتیں ہمیشہ اسی کوشش میں رہتی ہیں کہ ان کے زیر تسلط اقوام اور افراد اپنے قائدین، شہداء اور حقیقی محسنوں کے افکار اور خیالات سے دُور رہیں۔ قوموں کے اصل قائدین اور راہنماؤں سے متعلق حالات و کوائف کو یا تو چھپا دیا جاتا ہے یا پھر انہیں بگاڑ کر رکھا جاتا ہے۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ قوموں کو ان کی منزل اور جدوجہد سے دور رکھا جائے اور انہیں مستقلاً احساس کمتری کا شکار رکھا جائے۔ جموں کشمیر کی تاریخ کی ایک پُر عزم شخصیت شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کی زندگی کے بھی بے شمار گوشے آج تک پوشیدہ ہیں کیونکہ بھارت کی حکومت نے انہیں پردہ اخفاء میں رکھنے کیلئے جانے کتنے ہی حربے آزمائے ہیں۔ شہید قائد سے متعلق کتنی ہی دستاویز، انکے اپنے ہاتھوں سے تحریر کئے ہوئے خطوط، ڈائریاں، ان کی یادداشتیں ہیں جو تباہ و برباد ہیں ان سے چھین لئے گئے تھے اور ان کی جسدِ خاکی کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کا یہ زریں اٹاٹہ بھی تک بھارت کی قیدی

میں ہے۔ ستم بالائے ستم پاکستانی حکام نے بھی سینسر (censor) کے نام پر شہید کے کتنے ہی قلمی نمونے، اور شہید کی زندگی کے کتنے ہی راز اپنی تحویل میں دبائے رکھے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کشمیر کے ہائی کورٹ، اور دوسری عدالتوں وغیرہ کے سامنے دیئے گئے ان کے بیانات بھی آج تک مخفی ہیں۔ جبر اور ظلم کے ان ضابطوں کے باوجود بھی کئی اصحاب جن میں جناب سعید اسد، خواجہ رفیق وغیرہ قابل ذکر ہیں کی کاوشیں رنگ لاپکی ہیں اور شہید بابائے قوم سے متعلق ایک قابل قدر مواد ان کے خطوط اور تقاریر وغیرہ کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ ایک اہل اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قربانیاں اور جدوجہد ضائع نہیں ہوتے۔ دنیا کی کوئی بھی تحریک آزادی آج تک ناکام نہیں ہوئی ہے۔ دیر لگ سکتی ہے لیکن پُر خلوص اور قربانیوں سے عبارت تحریک کامیابی سے ہمکنار ہونا طے ہوتا ہے۔ ۱۱/ فروری ۱۹۸۴ء کو، بھارتی حکمرانوں نے شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کو تختہ دار پر لٹکایا، اس سوچ کے ساتھ کہ اس اقدام سے کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے گا۔ لیکن محض ۴ سال کے مختصر عرصے کے اندر دنیا نے دیکھا کہ وہ قوم کہ جس کے رہبر عوام گہری نیند میں سو رہے تھے یکایک مقبول کی پکار پر اٹھ کھڑے ہو گئے اور ایک ایسا انقلاب پیا ہوا جس میں لاکھوں مقبول دیوانہ وار راہ عزیمت کے راہی بن گئے۔ شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کی شہادت کے بعد معروف شاعر جناب مظفر وارثی نے کہا تھا۔

”اس قدر رہبر ہم ہو اقل سفارت کار پر بند نے لٹکا دیا مقبول بٹ کو دار پر

کیا خبر اس کو شہید حریت کی موت سے نغمہ ہستی لکھا ہے وقت کی دیوار پر۔“

واقعاً مقبول بٹ کی شہادت نے کشمیریوں کیلئے نغمہ ہستی کو ناز و نوکریا۔ مقبول کی شہادت نے اس قوم کے اندر نئی زندگی ڈال دی تھی۔ اسے ستم ظریفی کہنے کی شومنی قسمت یا پھر ہماری اجتماعی قومی غفلت کہ جس شخص کی شہادت نے ہمیں قومی زندگی سے نوازا اسی کی زندگی کے بے شمار گوشے آج تلک ہم پر پوشیدہ ہیں۔ ہم مقبول بٹ کا نام تو لیتے ہیں لیکن ان کے افکار، خیالات اور نظریات کو جاننے کی جستجو ہمارے اندر ہونی چاہئے تھی وہ موجود نہیں ہے۔ اگرچہ شہید بابائے قوم پر آزاد

کشمیر اور پاکستان میں کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں لیکن وہ کتابیں کشمیر کے اس حصے تک نہیں پہنچ پائی ہیں۔ پھر ایک اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے زیر تسلط اس حصہ جموں کشمیر میں چند ایک کے سوا دانشوروں اور قلم کاروں نے اجتماعی طور پر مقبول بٹ کے ساتھ پہلو تہی کا ہی رویہ اپنایا ہے۔ یہاں دوسری قوم کے قائدین اور بزرگوں پر لکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن اپنوں پر کسی نے بھی قلم اٹھانے کی زحمت کو اٹھانے کی ہے۔ یہ میرا گلہ بھی ہے اور شکوہ بھی۔ جب میں نے اپنے قلیل اور ناقص علم کے ساتھ اور سیاسی طور پر انتہائی مصروف رہتے ہوئے شہید مقبول بٹ سے متعلق موجود مواد کی ورق گردانی کی تو یقیناً جانے کہ ہر ورق کو لکھتے اور پڑھتے ہوئے میری آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے تھے۔ مقبول بٹ جیسی نابغہ روزگار شخصیت کے ساتھ ہم کیسے اتنی بے رحمی دکھا سکتے ہیں؟ میں سوچ کر بھی حیران ہوں۔ مقبول سے متعلق موجودہ مواد ہی کا مطالعہ کیا جاتا تو بھی ان کی عظمت کو جاننے کیلئے کافی تھا۔ راقم ایک خاصہ وقت تک متحدہ حریت میں رہا۔ وہاں سے لیکر آج جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے آفس پر کام کرتے ہوئے میرا واسطہ کتنے ہی ایسے طلباء اور اسکالرز سے رہا ہے جو تحریک آزادی لبریشن فرنٹ پر تحقیقی مقالے، پی ایچ ڈی وغیرہ کا کام کرتے رہے ہیں۔ اس عرصے میں، میں بھی ان اُبھرتے ہوئے دانشوروں کے سامنے شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ سے متعلق چند پمفلٹوں کے سوا کوئی مواد نہیں رکھ پایا، کیونکہ ایسا کچھ ہمارے پاس موجود ہی نہیں تھا۔ لیکن الحمد للہ اب یہ صورت حال تبدیل ہو رہی ہے۔ آج مقبول بٹ شہید پر ایک الگ ویب سائٹ www.maqboolbutt.com موجود ہے۔ آج سعید اسد اور خولہ رفیق جیسے قلم کاروں کی کاوشوں کی بدولت ہمارے سامنے شہید قائد کے خود تحریر کردہ خطوط، مضامین، ان کی تقاریر، ان کے افکار، ان کی پریس کانفرنسیں، اور ان کے زندگی کے حالات موجود ہیں۔ زیر نظر کتاب کا بیشتر حصہ دراصل انہی دو اصحاب کی کاوشوں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس کیلئے ہم ان دونوں اصحاب دل کے از حد ممنون ہیں۔ زیر نظر کتاب کوئی فلمی شاہکار یا ادبی نمونہ نہیں ہے نہ ہی اس کی اشاعت سے ہمیں ایسی کوئی غرض ہے۔ اس کتاب کا واحد مقصد کشمیر کے اس حصے میں موجود

قلم کاروں، دانشوروں، محققوں، مفکروں اور اصحاب ذوق کے سامنے شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کرنا ہے، اس اُمید کے ساتھ کہ ہماری اس کاوش کو یہ اہل ہنر آگے بڑھائیں گے اور جموں کشمیر کے اس عظیم قائد پر مدید تحقیق کی جائے گی اور مدید تحاریر رقم ہوں گی۔ یہ پھر ہماری نوجوان نسل کیلئے اپنے اس عظیم قائد کو جاننا انتہائی ضروری ہے اور اگر اللہ کا فضل شامل حال رہا تو یہ کتاب اس مقصد کو حاصل کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کا اصل حصہ جناب سعید اسد کی تحریر ”شعور فردا“ اور جناب خواجہ رفیق کی کاوش ”سفر حریت“ سے ماخوذ ہے لیکن اس میں چند ایک مقالات یا مشمولات کئی دوسرے لوگوں کی تحاریر سے بھی لی گئی ہیں۔ اس کیلئے ہم ان اصحاب کے بھی شکرگزار ہیں۔ کتاب اگرچہ اصلاً اردو میں ہے لیکن اس میں ایک حصہ انگریزی زبان میں بھی رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد اردو سے واقفیت نہ رکھنے والے لوگوں کیلئے بھی شہید اعظم جموں کشمیر کی زندگی کو مختصر اپیش کرنا ہے۔ شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کا مطالعہ کرنے سے ایک بات ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ وہ قرآن و سنت پر عمل پیرا ایک سچے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وسیع المطالعہ شخصیت تھے۔ اپنے خطوط میں جا بجا قرآنی حوالوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں دوسرے مذاہب اور دانشوروں کے حوالے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ شہید اعلیٰ ترین سوجھ بوجھ کے حامل ایک دانشور تھے۔ ان کا نظریہ زندگی شفاف تھا اور اس کیلئے وہ اللہ کے کلام اور نبی آخر زمان ﷺ کے فرمودات سے ضیاء پاتے رہتے تھے۔ اپنے لوگوں کو غلامی سے آزادی دلانے کی جستجو اُن کے نزدیک ایمان کا درجہ رکھتی تھی اور اس کام کو وہ انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا کام مانتے تھے۔ وہ مکمل طور پر منافقت اور فریب کاری سے دور تھے۔ ان کا اپنے لوگوں کیلئے آزادی کا تصور دائروں اور حد بندیوں سے بالاتر تھا۔ علامہ اقبالؒ کے شاہین کی علامت شہید مقبول بٹؒ آزادی کیلئے جہد مسلسل اور عزم مصمم کا عملی نمونہ تھے۔ ان عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس کتاب کو حتیٰ الوسع غیر جانبداری سے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور قارئین سے میری یہی گزارش ہے کہ وہ بھی کھلے قلب و ذہن سے

شہید مقبولؒ کا مطالعہ کریں۔ میں نے اس کتاب کو تیار کرنے، مواد کو جمع کرنے، اسے ٹائپ کرنے، مواد کی تصحیح کرنے وغیرہ پر محنت شاقہ سے کام لیا ہے، لیکن انسان کا ہر کام غلطی اور خطا سے مبرا ہونا از حد مشکل ہے۔ اس کتاب میں بھی بے شمار غلطیاں اور کمیاں رہی ہوں گی جن کا مجھے اعتراف ہے۔ میری تاریخین کرام سے بس اتنی ہی گزارش ہے کہ میری غلطیوں کی نشاندہی کریں تاکہ اُن کا زائد کیا جاسکے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے درکار ضروری معاملات و مواد کا جمع کرنا بھی ایک کاردار مسئلہ تھا، اس کام میں بہت سے حضرات نے ہماری مدد کی۔ کچھ دوستوں اور دوستوں کے احباب جس انداز میں اس کام میں شریک ہوئے ہیں یا شریک ہونے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ ہم اُن سب سے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ہم برادر بشیر احمد، برادر محمد سلطان، برادر فاروق احمد اور برادر محمد نسیم کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے اس کاوش میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اللہ نیک جزا دینے والا ہے۔

سو خنجر تھے پیوستہ گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تر ازو تھے دل میں جب ہم نے سفر کا آغاز کیا۔

وما توفیقی الا باللہ / احقر العباد
محمد حسین خان الطاف / سری نگر
مورخہ: ۲۳ / جنوری / ۲۰۱۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کے خاندانی و ذاتی حالات

”جو ر کے تو کوہ گراں تھے جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہ یا رہم نے قدم قدم تجھے یا دگار بنا دیا“

واوی کشمیر کے شمال مغرب میں ضلع بارہ مولہ سے متصل کپواڑہ کا علاقہ ہے۔ کپواڑہ پہلے بارہ مولہ ضلع میں شامل تھا لیکن اب اسے ایک الگ ضلع کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس ضلع کی موجودہ تحصیل بندواڑہ کے شمال مغربی جانب ”ترہگام“ نامی ایک قصبہ واقع ہے۔ آج سے نصف صدی قبل کشمیر کے باقی دیہی علاقوں کی طرح یہ علاقہ بھی کافی پسماندہ تھا۔ ڈوگرہ استبداد نے یہاں بھی غریب کشمیریوں کی زندگی ابھرنے کی گنجائش نہ دی تھی۔ لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی اور زمینداری کرتے یا قریبی قصبوں میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ ترہگام چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کی طرز معاشرت دیہی تھی۔ لوگ بمشکل روزی کما کر گزارہ کرتے تھے۔ کشمیر کی کئی نامور ہستیاں اس علاقے میں پیدا ہوئیں۔ ترہگام کے قصبہ سے ”کھمل“ نامی ایک بڑا مالہ گزرتا ہے۔ اس مالے کے کنارے آج ایک صدی سے زائد عرصہ قبل غلام محمد بٹ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ غلام محمد بٹ کے دو بیٹے غلام قادر بٹ اور عبد العزیز بٹ تھے۔ یہ خاندان محنت مزدوری کر کے گزارا کرتا تھا۔ غلام محمد بٹ کے بڑے بیٹے غلام قادر بٹ کے ہاں ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء کو ایک بیٹا پیدا ہوا۔ والدین نے نومولود کا نام ”مقبول“ رکھا۔ یہی مقبول، کشمیر کی تاریخ کا ایک نامور فرزند مقبول بٹ تھا۔ ان کا خاندان ایک عام کشمیری خاندان تھا۔ ابھی یہ نوجوان اور معصوم ہی تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کی وفات کے وقت مقبول بٹ کی عمر تقریباً گیارہ یا بارہ سال تھی۔ مقبول بٹ کے بھائی غلام نبی ابھی بہت چھوٹے تھے۔ غلام قادر بٹ کو جب بچوں کی پرورش میں

مشکلات پیش آئیں تو انہوں کچھ عرصہ بعد دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی سے ان کے ہاں دو بیٹے ظہور بٹ، منظور بٹ اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح مقبول بٹ کے کل ۷ بہن بھائی تھے۔ دو حقیقی اور پانچ سوتیلے۔ سوتیلی والدہ نے بچوں کی پرورش بڑی توجہ اور محنت سے کی لیکن حقیقی والدہ کی شفقت سے محرومی ایک بڑا حادثہ تھی جس سے مقبول دو چار ہوئے۔ اس حادثے نے ان کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے۔

مقبول بٹ کے کردار کی تشکیل میں ان کے گھریلو اور عمومی حالات نے گہرا اثر چھوڑا۔ جس وقت مقبول بٹ شعور کی منزلیں طے کر رہے تھے وہ دور عجیب اضطراب اور کشاکش کا دور تھا۔ مقبول بٹ کی عمر ابھی نو سال تھی کہ برصغیر سے انگریز رخصت ہونے لگا۔ اسی دوران کشمیر کے لوگوں نے ڈوگرہ مہاراجہ سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بغاوت کر دی۔ بغاوت تیزی سے پھیلتی گئی۔ مقبول بٹ کا علاقہ اس جنگ سے براہ راست متاثر ہوا۔ ان حالات میں المیہ یہ ہوا کہ اہل کشمیر آزادی کی منزل کے قریب آ کر دُور ہو گئے۔ کشمیر جنگ کے نتیجے میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور مقبول بٹ کا علاقہ اور وادی کشمیر جنگ کے نتیجے میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور مقبول بٹ کے علاقے اور وادی کشمیر کے دیگر حصوں سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے آزاد علاقے میں چلے گئے۔ مقبول بٹ کا خاندان وہیں مقیم رہا۔ مقبول اگرچہ نو عمر تھے لیکن اس جنگ نے ان کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ ان کا وطن آزادی کی منزل کے بہت قریب پہنچ کر دور ہو گیا تھا۔ مقبول بٹ کے بچپن میں کشمیر میں تعلیم کی سہولتیں بہت کم تھیں۔ مسلمان گھرانے زیادہ تر بچوں کو گھر پر مذہبی تعلیم دلاتے تھے اور اگر ممکن ہوتا تو ساتھ ہی ساتھ مروجہ تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مقبول بٹ کی تعلیم کی ابتدا بھی گھر میں مذہبی تعلیم سے ہوئی۔ اس وقت تہگام میں ایک پرائمری سکول تھا۔ مقبول بٹ کے والد نے مقبول کو اس سکول میں داخل کروا دیا۔ اس طرح انہوں نے مروجہ تعلیم بھی حاصل کرنا شروع کی۔ ان کی تعلیم کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں بھی ان کی تعلیم کسی نہ کسی طور جاری رہی۔ جنگ بندی کے بعد جب کسی قدر امن ہو گیا

توان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ چونکہ ان کا سکول پر امری تھا۔ اس لئے انہیں مزید تعلیم کے لئے کہیں اور جانا پڑتا۔ لیکن مقامی لوگوں نے مل کر کچھ جدوجہد کے بعد اسی اسکول کو ہائی اسکول کا درجہ دلوا لیا۔ لوگوں نے جب اس اسکول کو ہائی اسکول کی منظوری دینے کا مطالبہ کیا تو مقبول ہٹ نے بھی ان کوششوں میں حصہ لیا بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ انہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

”کیا میں نے زندگی کا یہ سب سے زیادہ جذباتی اور ہنگامہ خیز دور یونہی چپ چاپ گزاردیا؟ تو۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مسلسل ایجنٹیشن کے ذریعے اپنے گاؤں کے پر امری سکول کو میٹرک کے درجے تک پہنچایا۔“ اس طرح اپنی ہی کوششوں سے بنے ہوئے ہائی اسکول میں ۱۹۵۴ء میں مقبول نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۴ء میں ہی مزید تعلیم کی غرض سے وہ بارہ مولہ آگئے اور یہاں سینٹ جوزف کالج میں داخلہ لیا۔ یہ کالج اس وقت پرائیویٹ تھا اور عیسائی مشنریوں کے تحت چل رہا تھا۔ فادر شنکس یہاں کے پرنسپل تھے۔ کالج میں داخلے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے ایک اور بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ مقبول ہٹ کے دور پار کے ایک رشتہ دار غلام احمد بارہ مولہ میں رہتے تھے۔ مقبول انہیں کے گھر رہائش پذیر ہو گئے۔ غلام احمد خود بھی ایک مذہبی آدمی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک مامور عالم دین مولانا شاہ عبدالولی کے بہت بڑے معتقد تھے۔ غلام احمد کے گھر رہائش کی وجہ سے مقبول ہٹ کو بھی مولانا شاہ عبدالولی سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ یوں مذہب میں بھی ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ اسی مذہبی ماحول کی وجہ سے ایک عیسائی تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم ہونے کے باوجود انہوں نے عیسائیت کا کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ اپنے دین مکہ میں کے ساتھ ان کا لگاؤ مدید گہرا گیا۔ کالج کا زمانہ مقبول ہٹ کے لئے بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ چونکہ وہ خود ابتداء سے ہی احتجاج اور اپنی بات منوانے کے عادی تھے اور انہوں نے اپنے علاقے میں ہائی سکول بھی اسی طریقے سے منظور کروایا تھا۔ اس لئے کالج میں آکر ان کی یہ ہنگامہ خیزی عروج پر رہی۔ وہ ایک بہترین مقرر تھے اس لئے عموماً پڑجوش تقاریر کیا کرتے تھے۔ ان کے احتجاج

اور ہنگامہ خیزیوں کا اثر یہ ہوا کہ کورنمنٹ نے کالج سرکاری تھویل میں لے لیا۔ مقبول بٹ کی کالج میں سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ان کی پر جوش اور جذباتی تقاریر کو سامنے رکھ کر کالج کے پرنسپل فادر شنکس نے کہا تھا۔

”اگر یہ نوجوان کنھن حالات سے گزر گیا تو بہت بڑا آدمی بنے گا۔ لیکن اس قسم کے لوگ عموماً اس معاشرے میں شدید مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے نوجوان جس آزادی کے طلبگار ہوتے ہیں اس کا حصول بہت دشوار ہوتا ہے، نتیجتاً ایسے لوگ آزادی کی راہ میں قربان ہو جاتے ہیں۔“

مقبول بٹ کے استاد یہ دیکھ چکے تھے کہ یہ نوجوان ایک شعلہ جوالہ ہے اور اس معاشرے میں ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مقبول بٹ نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ بی۔ اے کا امتحان سرینگر میں مارچ / اپریل میں منعقد ہوا۔ اس سے قبل دسمبر ۱۹۵۷ء میں جب بھارتی حکومت نے شیخ عبداللہ کو رہا کیا تو وادی میں ہنگاموں اور ہڑتالوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مقبول بٹ ”بھی احتجاج میں شامل ہو گئے بلکہ اس سلسلے میں انتہائی سرگرم رہے۔ اسی دوران مارچ ۱۹۵۸ء میں بی۔ اے کا امتحان شروع ہوا۔ ۲ مارچ کو حکومت نے احتجاج سے تنگ آ کر شیخ عبداللہ کو پھر گرفتار کر لیا اور اسی کے ساتھ پوری وادی میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ مقبول بٹ اگرچہ اس وقت امتحان دے رہے تھے لیکن احتجاج میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ پہلے ہی حکومت کی نظروں میں کھٹک رہے تھے۔ لہذا ان کی گرفتاری بھی یقینی تھی۔ مقبول بٹ نے کسی نہ کسی طرح ۱۲ / اپریل کو آخری پرچہ دے دیا اور اسکے بعد فوراً ہی روپوش ہو گئے (بعض لوگوں کے مطابق اس دوران مقبول بٹ ایک گاؤں آرونی کے ایک اسکول میں بحیثیت مدرس کام کرتے رہے تھے۔ اگر بالفرض وہ بحیثیت مدرس کام کرتے بھی رہے تھے تو یہ عرصہ بہت ہی مختصر تھا۔ مقبول بٹ نے کہیں اسکا ذکر نہیں کیا ہے۔) مقبول بٹ کے اپنے بیان کے مطابق بی۔ اے کا امتحان دینے کے بعد وہ روپوش رہے۔ اور رزلٹ نکلنے کے بعد پاکستان چلے آئے تقریباً تین

ماہ کی روپوشی کے دوران ہی جب انہوں نے محسوس کیا کہ مزید یہاں رہنا اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا ممکن نہیں تو انہوں نے دیگر خاندان والوں کے صلاح مشورے سے فیصلہ کیا کہ انہیں آزاد کشمیر ہجرت کر جانا چاہئے۔ آزاد کشمیر آنے سے قبل مقبول بٹ نے تین ماہ تک بی۔ اے کے رزلٹ کا انتظار کیا اور اس انتظار کے دوران روپوش رہے۔ اگست میں جب رزلٹ آیا تو مقبول بٹ نے اپنے والد کو عارضی نتیجہ نامہ لے لایا۔ والد صاحب عارضی نتیجہ نامہ لے آئے تو مقبول بٹ نے ہجرت کے لئے پروگرام طے کر لیا۔ ان کے چچا عبدالعزیز بٹ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ممکن ہے کوئی اور بھی ہجرت کے اس سفر میں ان کے ساتھ شریک رہا ہو۔ بہر حال ان لوگوں نے ترہگام سے پیدل سفر شروع کیا۔ ٹیڈال کے بلند دبالا پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے یہ لوگ آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ آزاد کشمیر میں داخل ہوتے ہی سرحدی محافظوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور مظفر آباد پولیس کے پاس بھیج دیا۔

مقبوضہ کشمیر سے مقبول بٹ کی ہجرت کے پس پردہ کیا عوامل کا فرما تھے؟ اس سلسلہ میں پہلی بات واضح ہے کہ مقبول بٹ کی پر جوش سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا یہاں مزید رہنا اور تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ اگر وہ گرفتار کر لئے جاتے جیسا کہ حکومت کی کوشش تھی، تو پھر ان کے اور ان کے خاندان کے لئے بہت سے مسائل جنم لے لیتے۔ مقبول بٹ غالباً یہ بھی سمجھتے تھے کہ آزاد کشمیر جا کر تعلیم کے ساتھ ساتھ وطن کی آزادی کے لئے اپنی سرگرمیاں بھی جاری رکھ سکیں گے۔ سرحدی محافظوں نے تفتیش کی غرض سے مقبول بٹ اور ان کے چچا کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے اپنے طریق کار کے مطابق ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی۔ ایک انسر کے بیانات لینے پر مقبول بٹ نے صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کیا اور واضح کیا کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں اپنے آپ کو غلام سمجھتے تھے اور وہ غلام ملک میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہجرت کر کے آزاد کشمیر آ گئے ہیں۔ مقبول بٹ کے چچا عبدالعزیز ایک جہاندیدہ آدمی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پولیس کو اس قسم کے جذباتی بیانات سے کوئی غرض نہیں اور اس طریقے سے وہ پولیس سے اپنی جان نہیں چھڑوا سکیں گے۔

انہوں نے اپنی مظلومیت کا اظہار کرتے ہوئے واضح کیا کہ وہ بے سروسامانی کی حالت میں یہاں آئے ہیں اور انہیں پناہ چاہئے۔ اگرچہ مقبول بٹ نے چچا کے مصلحت آمیز بیان کو پسند نہیں کیا لیکن چچا نے انہیں سمجھایا کہ اس وقت جذباتیت کے بجائے مصلحت کی ضرورت ہے اور ہم اسی طریقے سے پولیس سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی پولیس نے اس بیان کے بعد انہیں رہا نہیں کیا، جس سے مقبول بٹ کو گہرا دھچکا لگا۔ انہوں نے اس ماروا سلوک کے خلاف احتجاج کیا تو تھانیدار سے ان کی تلخ کھامی بھی ہو گئی۔ تاہم چچا کے جاننے والے چند لوگ ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے بعد یہاں مقیم تھے، ان لوگوں میں غلام نبی زرگر اور غلام نبی میر بھی شامل تھے جو مقبول اور ان کے چچا کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ ان لوگوں کو کسی طرح یہ اطلاع ملی کہ مقبوضہ کشمیر سے انکے علاقے کے چند افراد ہجرت کر کے آئے ہیں اور تھانے میں پولیس کی حراست میں ہیں۔ ممکن ہے کہ مقبول اور ان کے چچا کے پاس ان لوگوں کے ایڈرس ہوئے ہوں یا پولیس نے خود ہی تلاش کر کے انہیں بتا دیا ہو۔ بہر حال جیسے ہی انہیں معلوم ہوا یہ دونوں آدمی فوراً تھانے میں پہنچ گئے۔ تھانے میں انہوں نے بیان دیا کہ مقبول بٹ اور عبد العزیز دونوں ان کے واقف کار ہیں اور ان کے مہمان ہیں۔ لہذا انہیں رہا کر دیا جائے۔ اس موقع پر پولیس نے ایک بار پھر ان دونوں کے بیانات لئے۔ بیانات لینے کے بعد ان دونوں کو غلام نبی میر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔

آزادی کے مسافروں کا یہ مختصر سا توافلہ تین روز تک مظفر آباد میں غلام نبی میر کے ہاں مہمان رہا۔ تین دن کے بعد یہ لوگ راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ غالباً راولپنڈی میں بھی انہیں کسی شناسا کی تلاش تھی جو انکی راہنمائی کر سکے۔ غلام نبی میر نے مظفر آباد سے روانہ ہوتے وقت انہیں ماسٹر مقبول نامی شخص کے نام ایک خط بھی دیا تھا۔ ماسٹر مقبول ایبٹ آباد میں مقیم تھا۔ یہ لوگ راولپنڈی سے ایبٹ آباد چلے گئے اور ماسٹر مقبول کے ہاں پہنچ گئے۔ ماسٹر مقبول ان لوگوں کے قریبی عزیز تھے جن کے ہاں رہ کر بارہمولہ میں مقبول بٹ نے تعلیم حاصل کی تھی۔

اس لحاظ سے مقبول بٹ اور انکے چچا بھی ماسٹر مقبول کو جانتے تھے۔ ماسٹر مقبول کے ہاں یہ دونوں چار پانچ دن مقیم رہے۔ مقبول بٹ کے سامنے اس وقت دو بڑے مسئلے تھے۔ اول اپنے روزگار اور رہائش کا کہیں بندوبست کرنا اور دوم اپنی تعلیم کی تکمیل۔ مزید تعلیم کے حصول کے سلسلے میں وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخلے کے خواہشمند تھے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں کوئی رہائش اور روزگار بھی ڈھونڈنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔ یہی سوچ کر مقبول بٹ ایبٹ آباد میں چند دن رہنے کے بعد اپنے چچا کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور میں کشمیر سے آئے ہوئے اس اجنبی نوجوان کی راہ میں بے شمار دشواریاں حائل تھیں۔ نہ تو وہ لاہور شہر سے واقف تھے اور نہ ہی یہاں ان کی کسی سے شناسائی تھی۔ مقبول بٹ نے ایم۔ اے میں داخلہ لینے کی پوری کوشش کی لیکن انہیں اپنے مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اسی سلسلے میں وہ منصورہ بھی گئے تھے۔ شاید جماعت اسلامی سے منسلک افراد سے اس سلسلے میں مدد چاہتے ہوں۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود مقبول بٹ کو ایم۔ اے میں داخلہ نہ مل سکا اور نہ ہی کسی معقول روزگار اور رہائش کا مسئلہ حل ہو سکا۔ جب لاہور میں مقبول بٹ کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو وہ پشاور روانہ ہو گئے۔ پشاور میں کپوارہ کے علاقے ہائے ہامہ کے ایک کشمیری صحبت خان ہجرت کے بعد سے مقیم تھے۔ وہ پشاور یونیورسٹی میں ملازم تھے۔ مقبول بٹ کے چچا عبدالعزیز بٹ کسی حوالے سے صحبت خان کو جانتے تھے۔ پشاور پہنچ کر ان لوگوں نے صحبت خان سے رابطہ کیا۔ صحبت خان کی کاوشوں سے ان کی رہائش کا مسئلہ حل ہوا۔ ایک ہندو کامیٹر کو مکان شکستہ حالت میں تھا۔ صحبت خان نے کوشش کر کے مقبول بٹ اور ان کے چچا کو یہاں کی رہائش دلا دی۔ رہائش کا مسئلہ حل ہونے کے بعد عبدالعزیز بٹ محنت مزدوری کرنے لگے اور مقبول بٹ نے پشاور یونیورسٹی میں داخلے کے لئے کوشش کی۔ صحبت خان کی مدد سے انہیں یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ حالات موافق پاتے ہی مقبول بٹ کی بے چین روح انگڑائی لے کر بیدار ہوا شروع ہو گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مقبول بٹ اس قسم کی مریحہ اور روایتی زندگی گزارنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ جس طرح

عظیم لوگ زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اسی طرح مقبول بٹ کے نزدیک بھی اس زندگی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کسی خاص مقصد کے لئے گزارنا چاہتے تھے۔ اور وہ مقصد تھا محکوم دھرتی کی آزادی۔ جلد ہی یہ بے چین روح اپنے راستے پر گامزن ہو گئی اور تیزی سے اپنا حلقہ احباب وسیع کر لیا۔ روزگار کے سلسلہ میں ایک مقامی اخبار میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس طرح ان کے تعلیمی اخراجات کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اسکے علاوہ رہائش اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے بھی ہر ماہ معقول رقم میسر ہونے لگی۔ روزگار اور تعلیم کے معاملے میں مقبول بٹ اور ان کے چچا کسی حد تک مطمئن ہو گئے تو عبدالعزیز بٹ نے ان کی شادی کے متعلق سوچا۔ اسی عرصے میں عبدالعزیز بٹ واپس مقبوضہ کشمیر چلے گئے واپس جانے سے پہلے ان کے دو واقف کاروں، عطاء محمد اور محمد سبحان جو آپس میں بھائی تھے اور ایبٹ آباد والے ماسٹر مقبول کے رشتہ دار بھی تھے نے ان سے گزارش کی وہ مقبوضہ کشمیر میں مقیم ان کی بہن کو واپسی پر اپنے ہمراہ لے آئیں۔ عبدالعزیز کو چونکہ رہائش اور معاش کی طرف سے کسی حد تک اطمینان ہو گیا تھا لہذا وہ اپنے کنبہ کو بھی پاکستان لانا چاہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے یہ طے کر آئے تھے اگر پاکستان میں مناسب حالات میسر آئے تو وہ اپنے خاندان کو بھی یہیں لے آئیں گے۔ عبدالعزیز بٹ مقبوضہ کشمیر گئے اور واپسی پر اپنی بیوی کے ساتھ عطاء محمد اور سبحان کی ہمیشہ کو بھی ساتھ لے آئے جس کا نام رلہ بیگم تھا۔ ابتداء میں رلہ بیگم اپنے رشتہ دار ماسٹر مقبول کے ہاں رہائش پذیر ہو گئیں۔ پھر کچھ عرصے بعد رلہ بیگم اپنے بھائیوں کے پاس پشاور چلی گئیں۔ ماسٹر مقبول نے عبدالعزیز بٹ کو یہ تجویز دی کہ رلہ بیگم کی شادی مقبول بٹ سے کر دی جائے۔ عبدالعزیز بٹ راضی ہو گئے۔ غالباً انہوں نے مقبول بٹ سے مشورہ بھی کیا۔ ۱۹۶۱ء میں مقبول بٹ کی شادی رلہ بیگم سے ہو گئی۔ رلہ بیگم ایک گھریلو اور سیدھی سادی کشمیری خاتون تھیں۔ اس دوران مقبول بٹ کو روزگار کے سلسلے میں کافی تنگ و دو کرنی پڑی۔ روزنامہ ”انجام“ سے وہ کافی عرصہ وابستہ رہے۔ چونکہ ان کے اپنے ذہن میں بھی ایک مقصد تھا۔ اس لئے اپنے مقصد اور ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے صحافت سے وابستگی انکی

ضرورت بھی تھی۔ صحافت میں کچھ تجربہ ہونے کے بعد انہوں نے ”خیبر ونگلی“ نام سے ایک اپنا جریدہ بھی نکالا لیکن نامساعد مالی حالات کی وجہ سے جلد ہی اسے بند کرنا پڑا۔ ۱۹۶۲ء میں مقبول بٹ کے پہلے بیٹے جاوید مقبول بٹ پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں شوکت مقبول بٹ پیدا ہوئے۔ بچوں کی پیدائش سے مقبول بٹ کی گھریلو ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ اپنے بچوں کی انہوں نے بڑی شفقت سے پرورش کی۔ لیکن ابھی ان کے بیٹے معصوم ہی تھے کہ وہ ایسی راہوں پر چل پڑے کہ ان کے لئے گھریلو زندگی گزارنا ناممکن ہو گیا۔ مقبول بٹ کی پہلی بیوی رہہ بیگم اس دوران بہت بیمار رہنے لگیں۔ اسی دوران مقبول نے ذکرہ بیگم نامی ایک سکول معلمہ سے دوسری شادی کر لی۔ دوسری شادی کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی لیکن شاید مقبول بٹ سمجھتے تھے کہ انکی سرگرمیوں اور رہہ بیگم کی خراب صحت کے باعث گھریلو نظام با احسن طریقے سے نہیں چل سکے گا۔ ذکرہ بیگم چونکہ ایک پرہیزگار خاتون تھیں اور اسکے ساتھ باروزگار بھی تھیں، اسلئے مقبول بٹ نے یہ سمجھا کہ اس طرح ان کے گھریلو حالات درست ہو جائیں گے اور ان کی عدم موجودگی میں انکی دوسری اہلیہ گھر کا نظام سنبھال سکیں گی۔ ۱۹۶۶ء میں مقبول بٹ کی دوسری بیگم سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام لہنی شاہین رکھا گیا۔ ۱۹۶۶ء ہی میں مقبول بٹ مقبوضہ کشمیر چلے گئے اور اس کے بعد وہ مسلسل ایک ایسی جدوجہد میں مصروف ہو گئے کہ جس میں گھریلو زندگی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ آزادی کا یہ مسافر ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۴ء تک مسلسل ایک ایسے راستے پر چلتا رہا جس نے بالآخر اسے شہادت جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کر دیا۔ مقبول بٹ کے بڑے بیٹے جاوید مقبول نے حصول تعلیم کے لئے بڑی محنت کی اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی اور آج کل مصروف ملازمت ہیں۔ جبکہ چھوٹے بیٹے شوکت مقبول بٹ نے اپنے والد کے راستے کو منتخب کرتے ہوئے تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں حصہ لیتا شروع کر دیا۔ لہنی شاہین اپنی والدہ کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔ مقبول بٹ کے والد نادر بٹ انتقال کر گئے ہیں۔ جبکہ ان کے چچا عبدالعزیز بٹ پاکستان ہی میں مقیم رہے اور کچھ عرصہ قبل ایبٹ

آباد میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ مقبول بٹ کے سوتیلے بھائی بھی تحریک آزادی میں اپنا کردار کر رہے ہیں جبکہ ان کے برادر اصغر غلام نبی بٹ کو بھی بھارتی آرمی نے اپنی گاڑی کے نیچے لا کر شہید کیا ہے۔ غلام نبی بٹ تادم مرگ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے ساتھ منسلک رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مقبول بٹ کی ذاتی زندگی بہت مختصر رہی۔ ان کی زندگی تو قومی زندگی تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کو قوم کے مستقبل پر قربان کر دیا۔ مقبول بٹ ذاتی طور پر بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ جو بھی ان سے ایک بار ملتا، ان کی ذہانت، اعلیٰ خیالات اور جذبات سے ضرور متاثر ہوتا۔ اس کا اظہار میر عبد القیوم اورم۔ش نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات مقبول بٹ کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہی بہت متاثر ہوئے۔ م۔ش (میاں محمد شفیع) نے اپنے ایک کالم میں لکھا ”یہ نوجوان کشمیری قوم کا ایک بہترین رہنما ہے اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے“۔ مقبول بٹ نے اتنی ہنگامہ خیز زندگی گزاری کہ جس میں وسیع مطالعے اور سنجیدہ سوچ کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ لیکن مقبول بٹ ایک وسیع المطالعہ شخص ہونے کے علاوہ سنجیدہ فکر انسان بھی تھے۔ انہوں نے آزادی کی تحریکوں کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اگرچہ تحریک آزادی میں ان کے کردار کا دورانیہ مختصر ہے لیکن اس مختصر دورانیے میں انہوں نے کشمیری قوم کو وہ راہ دکھائی جو حقیقی معنوں میں ایک غیرت مند قوم کی راہ ہے اور پھر اس راہ کو اپنے خون سے رنگین کیا۔ کشمیر کی جدید تاریخ میں بلاشبہ وشبہ مقبول بٹ کو سب سے محترم اور بلند مقام حاصل ہے۔ تاریخ کشمیر کبھی اپنے اس عظیم فرزند کو فراموش نہیں کر سکے گی۔

سیاسی سفر

ترہگام قصبہ جہاں مقبول بٹ پیدا ہوئے ڈوگرہ دور میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا انہیں صرف ایک پرائمری سکول تھا۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد ریاست دو حصوں میں منقسم ہو گئی اور ترہگام کا قصبہ مقبوضہ کشمیر میں شامل رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہاں کے طلبہ نے حکومت سے مطالبہ کیا

کہ ان کے پر امری سکول کو ہائی سکول کا درجہ دیا جائے۔ ہائی سکول کے لئے احتجاج کرنے والوں میں ایک نمایاں لڑکا محمد مقبول بٹ تھا۔ مقبول بٹ کے سیاسی سفر کا آغاز درحقیقت اسی واقعے سے ہو جاتا ہے جب وہ ہائی سکول حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اسی ہائی سکول سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۴ء میں جب وہ سینٹ جوزف کالج بارہمولہ میں داخل ہوئے تو یہاں بھی مسلسل متحرک رہے۔ ان کے اپنے ایک بیان کے مطابق وہ بہت زیادہ احتجاج اور ہڑتالیں کرتے تھے۔ حکومت نے اسی وجہ سے تنگ آ کر ان کا کالج سرکاری تحویل میں لے لیا۔ کالج کے دور میں بھی وہ باقاعدہ ایک سیاسی کارکن کی طرح متحرک رہے۔ بہترین مقرر ہونے کی وجہ نہایت پر جوش تقاریر کیا کرتے تھے۔ اسی خصوصیت کے باعث وہ جلد ہی حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔ ۱۹۵۸ء میں جب شیخ عبداللہ کی رہائی کے بعد احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا تو مقبول بٹ نے نمایاں طور پر احتجاج میں حصہ لیا۔ چنانچہ انہوں نے انہی سرگرمیوں کے دوران بی، اے کا امتحان دیا اور روپوش ہو گئے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مقبول بٹ نے شعور کی واوی میں قدم رکھتے ہی شد و مد کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران وہ پاکستان آ گئے۔ پاکستان آ کر پہلے تو انہوں نے ذاتی مسائل پر توجہ دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی شخصیات سے بھی رابطہ رکھا۔ پشاور میں قیام کے دوران ان کا حلقہ احباب کافی وسیع ہو گیا۔

۱۹۶۱ء میں کے۔ ایچ خورشید جو اس وقت آزاد کشمیر کے صدر تھے، نے پہلی بار بنیادی جمہوریتوں کے تحت انتخابات کروائے۔ مقبول بٹ کو اس وقت آزاد کشمیر آئے ہوئے محض تین سال ہی گزرے تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ان انتخابات میں حصہ لیا۔ اور حیرت انگیز طور پر کامیابی بھی حاصل کی۔ یہ تین سال پہلے مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے آنے والے نوجوان کے لئے ایک اعزاز تھا۔ کے۔ ایچ خورشید نے خود صدارت کا انتخاب لڑا۔ مقبول بٹ نے صدارتی انتخاب میں کے ایچ خورشید اور سٹیٹ کونسل کے انتخاب میں جی۔ ایم لون کی حمایت کی۔ یہ دونوں

امیدوار کامیاب ہوئے۔ مقبول بٹ کی سیاست میں دلچسپی اور عملی شرکت نے ان دونوں حضرات سے قریبی تعلقات پیدا کرنے میں بے حد مدد کی۔ بالخصوص جی۔ ایم۔ لون سے مقبول بٹ کی گہری شناسائی پیدا ہو گئی۔ انہی کے حوالے سے دیگر نظریاتی دوستوں سے ان کی واقفیت پیدا ہوئی۔ اور اس طرح مقبول بٹ آزاد کشمیر اور پاکستان میں مقیم کشمیریوں کی سیاست میں عملًا شریک ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستان کے اُس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ کے درمیان کشمیر کے مسئلہ پر مذاکرات ہو رہے تھے۔ ہر بیدار اور محب وطن کشمیری کو ان مذاکرات سے گہری دلچسپی تھی۔ انہی مذاکرات کے دوران تقسیم کشمیر کی تجویز بھی سامنے آئی۔ یہ تجویز سن کر کشمیریوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ کوئی بھی کشمیری خواہ وہ کسی نظر سے منسلک ہو۔ کشمیر کی تقسیم کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ مقبول بٹ نے ان حالات و واقعات میں محسوس کیا کہ پاکستان میں اقتدار کی کرسیوں پر براجمان لوگوں اور افسر شاہی کو کشمیری عوام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں صرف ایک علاقے سے دلچسپی ہے اور وہ کشمیر کو صرف اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ کشمیری عوام کے بجائے انہیں اپنے مفادات عزیز ہیں۔ اس قسم کی تجاویز جب سامنے آئیں تو کچھ حضرات نے مل کر ریاست جموں و کشمیر کی وحدت کے تحفظ کے لئے ۱۹۶۲ء میں ایک تنظیم قائم کی۔ اس کا نام کشمیر انڈی پینڈنس کمیٹی KASHMIR INDEPENDENCE COMMITTEE رکھا گیا اور اس کے سربراہ جی ایم لون مقرر ہوئے۔ مقبول بٹ بھی اسی تنظیم میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس تنظیم میں غلام نبی گلکار، قاضی خورشید عالم، ملک عبد المجید، ڈاکٹر غلام احمد جراح، میر عبد القیوم، میر عبد اعزیز، میر عبدالرشید، عبدالخالق انصاری، ایم۔ اے فاروق، امان اللہ خان، سعید شاہ مازکی، علی محمد ملک اور مجید امجد بٹ وغیرہ بھی اس تنظیم میں شامل تھے۔ اس تنظیم کے قیام کا براہ مقصد ریاست جموں و کشمیر کی وحدت و سالمیت کے تحفظ کے لئے متحرک رہنا تھا، تاکہ کشمیر کے سلسلے میں کی جانے والی کسی بھی مایاک کوشش کو روکا جاسکے۔ کشمیر انڈی پینڈنس کمیٹی کچھ عرصہ فعال رہی۔ چونکہ تقسیم کشمیر کے کسی منصوبے کا عملی طور پر وجود نہیں

رہا تھا۔ اور یہ محض تجویز کی حد تک محدود تھا اس لئے کشمیر انڈی پنڈنس کمیٹی بھی کسی حد تک غیر فعال ہو گئی۔ کشمیر انڈی پنڈنس کمیٹی کے قیام کے تین سال کے بعد انہیں حضرات نے مل کر محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں لایا۔ اس سے قبل مقبوضہ کشمیر میں اس کا قیام اپریل ۱۹۶۵ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ کشمیر انڈی پنڈنس کمیٹی کے اکثر ممبران محاذ رائے شماری میں شامل ہو گئے۔ قیام کے فوراً بعد حلف برداری کی ایک زامی تقریب منعقد ہوئی۔ سیالکوٹ کے نزدیک بھارتی مقبوضہ کشمیر کے گاؤں ”سوچیت گڑھ“ جا کر تمام ممبران نے وطن کی مٹی کو ہاتھ میں لے کر حلف اٹھایا کہ وہ کشمیر کی آزادی کے لئے اپنے خون کی قربانی تک دینے سے گریز نہیں کریں گے۔

مقبول ہٹ بھی اس حلف کی تقریب میں شریک تھے اور غالباً انہوں نے پورے ایمانی جذبے سے یہ حلف اٹھایا تھا کہ اگر وطن کی آزادی کے لئے جان کی قربانی کی ضرورت بھی پڑی تو وہ اس گریز نہیں کریں گے۔ اور خدا کو واہ ہے کہ انہوں نے انتہائی پروتار طریقے سے اس حلف کو پورا بھی کیا۔ مقبول ہٹ محاذ رائے شماری کے پلسٹی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس طرح مقبول ہٹ محاذ رائے شماری کے پلیٹ فارم سے بھی عملی سیاست میں متحرک ہو گئے۔

مقبوضہ کشمیر سے آئے انہیں سات آٹھ برس گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے پاکستان اور آزاد کشمیر کی سیاست کا گہری نظر سے جائزہ لیا تھا اور بڑی اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ نہ تو پاکستانی قیادت کشمیری عوام کے لئے مخلص ہے اور نہ ہی آزاد کشمیر میں اقتدار کی خاطر الجھنے والوں کو اپنے حقیقی مقصد سے کوئی دلچسپی ہے۔ آزاد کشمیر جو آزادی کشمیر کا بیس کمپ تھا وہاں اقتدار کی خاطر کھینچا تانی جاری تھی اور وزارت امور کشمیر کا بڑا فریضہ یہی تھا کہ وہ کشمیری سیاست دانوں کو باہم لڑاتے رہے۔ دوسری طرف پاکستان کے اہل اقتدار اور نوکر شاہی کے اذہان کشمیری عوام کے متعلق کسی قسم کی سنجیدہ سوچ سے خالی تھے۔ ان حالات میں مقبول ہٹ نے شدت سے محسوس کیا کہ کشمیریوں کو اپنی آزادی کی جنگ خود لڑنا پڑے گی اور آزادی کی یہ جنگ وظیفہ خور سیاست اور اقتدار پرست سیاسی کارکن کی بڑی سے بڑی تعداد بھی نہیں لڑ سکتی۔ اپنے اندر یوں انہوں

نے کہا۔

”ایک بات بڑی شدت سے اس وقت بھی محسوس کی اور اب بھی کر رہا ہوں کہ وہ لوگ جو اپنی کوشش سے دو وقت کی روٹی نہیں کما سکتے وہ قوم کو آزادی کی منزل سے کیسے ہم کنار کر سکتے ہیں۔ وظیفہ خور سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کی بڑی سے بڑی تعداد بھی آزادی کی جنگ نہیں لڑ سکتی۔“

انہی احساسات کے ساتھ انہوں نے کشمیر کی آزادی کے لئے انقلابی خطوط پر سوچ و چار شروع کیا۔ ان کے نزدیک آزادی کی یہ جنگ محض سیاسی میدان میں نہیں لڑی جاسکتی تھی بلکہ اس کے لئے عملی اور مسلح جدوجہد بھی ضروری ہے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے منظم اور مسلح جدوجہد کا تصور ان کے ذہن میں کب پیدا ہوا، اس کے متعلق وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

”ہمارے ذہنوں میں شروع سے یہ بات تھی کہ سیاسی جدوجہد کے ساتھ مسلح جدوجہد کے سلسلے میں بھی کچھ کریں۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں سیالکوٹ میں محاذ کی بنیاد رکھی گئی اور ابتداء سے ہی مسلح جدوجہد کی منصوبہ بندی شروع کر دی گئی۔ پاک بھارت جنگ کے دوران یہ منصوبہ تعطل کا شکار رہا۔ اعلان تاشقند کے ساتھ ہی ہم نے زور شور سے کام شروع کر دیا“

مسلح جدوجہد کے متعلق ان کے تصورات کی پختگی کے ساتھ ہی اپنی مختصر سی سیاسی زندگی میں مقبول ہونے لگی یہ بھی محسوس کر لیا کہ کشمیریوں کو آزادی کی حقیقی منزل اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک تحریک مکمل طور پر وہ خود اپنے ہاتھوں سے نہ چلائیں۔ تحریک کی قیادت کشمیریوں کے ہاتھ میں ہو اور وہ خود ساری تحریک میں آگے آگے ہوں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

”۱۹۶۵ء میں شیخ عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے بعد میرے خیالات میں انقلاب آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جس قوم کی آزادی کی جنگ لڑی جا رہی ہے INITIATIVE اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ شروع سے اب تک ساری تحریک میں یہی بنیادی خامی ہے۔ انقلابات عالم کی تاریخ پر دھیں تو معلوم ہوگا کہ جب قوم کی نجات کا سوال ہو تو اس قوم

کے امر کو منظم کیا جاتا ہے۔ جب تک قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے آمادہ نہ کر لیا جائے، وہ کوئی رول اور نہیں کر سکتی۔“

انہی تصورات کے ساتھ مقبول ہٹ پوری سنجیدگی سے تحریک آزادی میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے آگے بڑھتے رہے۔ یعنی ان کے ذہن میں دو باتیں واضح ہو گئیں تھیں ایک یہ کہ کشمیریوں کو آزادی کی جنگ خود لڑنی ہوگی اور دوسرا یہ کہ آزادی کی جنگ محض سیاسی میدان اور مذاکرات کے ذریعے نہیں بلکہ مسلح ہو کر باقاعدہ کوریڈر جنگ کے ذریعے بھی لڑنی ہوگی۔ اسی طریقے سے دشمن کو سیاسی میدان میں شکست دینا ممکن ہوگا۔ اس دور میں الجزائر اور فلسطین میں کوریڈر کی جنگ پوری شدت سے جاری تھی اور پوری دنیا ان کی حمایت کر رہی تھی۔ مقبول ہٹ یہ سمجھتے تھے کہ کشمیری بھی اسی طریقے سے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر دے سکتے ہیں۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں محاذ رائے شماری کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ اس میں مقبول ہٹ نے اپنے نظریات کے مطابق تحریک آزادی کے لئے باقاعدہ مسلح جدوجہد شروع کرنے کی تجویز دی۔ محاذ کی مجلس عاملہ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس وقت محاذ میں بہت سے ایسے حضرات شامل تھے جو شیخ عبداللہ کے معتقد تھے۔ یہ لوگ شیخ عبداللہ کے تصور سیاست اور نیشنل ازم کے قائل تھے۔ اس لئے وہ مسلح جدوجہد جیسے کسی نظریے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ مقبول ہٹ کو محاذ میں اپنے تصورات کے مطابق جدوجہد کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو انہوں نے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ملکر ایک منظم تنظیم قائم کرنے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ تاکہ اپنے تصور کے مطابق عملی جدوجہد کر سکیں۔ چنانچہ میر عبدالقیوم اور مہاجر امان اللہ خان کے مشورے سے یہ تنظیم این۔ ایل۔ ایف (قومی محاذ آزادی) کے نام سے ۱۳/ اگست ۱۹۶۵ء کو پشاور میں قائم کی گئی۔ اس تنظیم کو الجزائر کے ایف۔ ایل۔ این کی طرز پر منظم کیا گیا۔ مختلف شعبے بنا کر ان کے الگ الگ انچارج بنائے گئے۔ مقبول ہٹ کو مختلف شعبوں کے درمیان رابطے کے امور کا سربراہ بنایا گیا۔ مقبول ہٹ اور ان کے رفقاء اپنے اپنے شعبوں میں سرگرم ہو گئے۔ تنظیم کے قیام کے فوراً بعد ہی چونکہ پاک بھارت جنگ

شروع ہو گئی۔ اس لئے ہر کشمیری کی طرح ان لوگوں کی توجہ بھی اس جنگ کی طرف رہی۔ اس سے قبل جب مقبوضہ کشمیر میں کوریلا آپریشن ”جبرالٹر“ شروع تھا تو مقبول ہٹ نے مظفر آباد جا کر اپنی خدمت پیش کی لیکن انہیں اہمیت نہیں دی گئی۔ مقبول ہٹ نے شدت سے محسوس کیا کہ جنگ تو کشمیر کی آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے اور خود اہل کشمیر پر اعتماد نہیں کیا جا رہا۔ ان کے نزدیک ایسے حالات میں آزادی کا حصول دشوار تھا اور ایسی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ جنگ ستمبر کے بعد تنظیم سرگرم رہی اور مختلف مواقع پر مظاہرے کئے جاتے رہے۔ عملی طور پر یہ لوگ محاذ رائے شماری کے پلیٹ فارم پر ہی سرگرم تھے اور این۔ ایل۔ ایف فی الحال خفیہ طور پر قائم تھی۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ لوگ اپنے اپنے شعبہ کی حد تک سرگرم عمل تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں عملی جدوجہد کے لئے فنڈز درکار تھے۔ میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان نے اس سلسلہ میں کافی قربانیاں دیں۔ میجر امان اللہ خان ☆ اسلحہ جدوجہد کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆ میجر امان اللہ خان غیر متقسم ہندوستان میں لڑیں آری کے ایک کپٹن تھے۔ ان کے والد مرحوم سیف اللہ خان ضلع کپواڑہ کے علاقہ ہائے ہامہ کے مشہور و معروف دیکس تھے۔ میجر امان اللہ ایک جری سپاہی تھا۔ اس کے اندر جذبہ حریت موجزن تھا۔ اس لئے دوسری جنگ عظیم کے دوران انڈین آرمی کو چھوڑ کر سہا ش چندریوس کی ”آزاد ہند“ فوج میں شامل ہو گیا۔ بعد ازاں جنرل شاہنواز خان کی آزاد ہند فوج میں میجر کی حیثیت میں کام کر رہے تھے کہ بغاوت کے اثر میں گرفتار ہو گئے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد انہوں نے نپاکستان آری میں جانے کا فیصلہ لیا اور نپاکستان چلا گیا۔ جہاں میجر امان اللہ نے آزاد کشمیر کی فوج منظم کرنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ 1947ء میں جب قبائلی حریت پسندوں کو بارہمولہ اور اوڑی سے واپس لانا پڑا تو میجر امان اللہ کو یہ سپاہی بہت شاک گذری۔ اس نے اس وقت کی عبوری حکومت کے قاعدے قانون سے باہر نکل کر بہت ہی محدود وسائل کے ساتھ نئی فوج ترتیب دی اور جنوری 1948ء میں کیرن کے راستے سے سینر فائر لائن عبور کر لی اور اسی علاقے میں ایک حاضی انتظامی ڈھانچہ بھی قائم کیا۔ جس میں علاقہ منرگام چے کیل کی ایک معزز حریت پسند شخصیت مرحوم میر باز خان تحصیلدار مقرر ہوا۔ اور موضع مگروس کا ایک معروف عرفانض نولیس حاجی امیر الدین والی نائب تحصیلدار مقرر کیا گیا۔ لیکن پریل 1948ء میں میجر امان اللہ کے مجاہدین کو بھارت کی فوج سے ہٹا ہوا پڑا۔ میجر خان کو اپنے کچھ رشتہ داروں سمیت واپس آزاد کشمیر جانا پڑا لیکن ان کی والدہ حنیفہ بیگم۔ اس کا بھائی محبت خان اور محبت خان کی حاملہ بیوی گرفتار ہو گئے۔ چند دن درگولہ کیمپ میں رکھے گئے بعد انہیں سرینگر سٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ میجر امان اللہ کی بھانجی کاٹا وین کے مقام پر پہچ

پیدا ہوا جسے بھارتی فوج نے وٹا وین ہل کے پاس سڑک پر پھینک دیا۔ قصبہ سوپور کے لوگوں نے ان دونوں کو فوج کے قبضے میں رکھنے پر احتجاج کیا۔ محبت خان کو جیل بھیج دیا گیا لیکن ان عورتوں کو ضمانت پر رہائی کے بعد کوئی اپنے گھر لینے پر تیار نہ ہوا۔ آخر خدیجہ عبداللہ پنڈت اور سوپور کی ٹڈا برادری نے ذمہ داری قبول کر لی حالانکہ اس دوران لوگوں پر بہت خوف طاری تھا۔ اسی دوران کراہ ٹینک کے غلام رسول بٹ مانی ایک مخلص انھیں ضمانت پر اپنے گھر لے گیا لیکن بہت جلد خوفزدہ ہو گیا۔ پھر سونواری کے ایک اور شہری نیر لون نے تمام خطرات کے باوجود ان بے سہارا عورتوں کو پناہ دی۔ اسی دوران بھارتی فوج نے ہائے ہامہ میں منجر امن اللہ خان کے مکانات، جو تمام سہا سیدائیں رائل کر دی۔ جب یہ عورتیں گھرواپسی کی پٹریاں توڑ رہی سیف الدین خان کی دیکس زادیوں کو سر چھپانے کے لئے جگہ نہیں تھی۔ آخر ہائے ہامہ کے مشہور سماجی و سیاسی کارکن رستم علی خان کے برادر اکبر عبداللہ نے انھیں سہارا دیا۔ بعد ازاں وہ اپنے باقی رشتہ داروں کو لے کر واپس آزاد کشمیر چلے گئے لیکن منجر امن اللہ جین سے نہ بیٹھ سکے۔ انہوں نے آزاد کشمیر میں وہاں ایک مربوط و منظم سیاسی جماعت جموں و کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کی بنیاد ڈالی تاکہ جدوجہد آزادی جاری رکھی جاسکے۔ لبریشن فرنٹ کے موجودہ چیئرمین امن اللہ خان کو تنظیم کا جنرل سیکریٹری مقرر کیا۔ منجر امن اللہ استورا اسکرود کے امن اللہ خان کو پہلے سے ہی جانتے تھے۔ امن اللہ خان کی ہمشیرہ منجر خان کے خاندان میں بیای گئی تھی۔ اس لئے منجر خان، امن اللہ خان کی سرگرمیوں اور کشمیر سے وابستگی کو جانتے تھے۔ امن اللہ خان نے اپنی تعلیم ہندو اور سرینگر میں حاصل کی تھی۔ چودھری غلام عباس کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ اس لئے گر بچپن کے بعد پاکستان چلے گئے۔ منجر امن اللہ کو کشمیر میں تحریک کو زندہ و فعال بنانے کے لئے ایک سخت جان بہادر و سیاسی طور سنبھے اور بالغ نظر شخص کی ضرورت محسوس ہوئی۔ منجر صاحب کی تجربہ کار نظریں جلدی مقبول ہٹ پر جم گئیں۔ ان دنوں مقبول ہٹ پشاور میں رہتے تھے۔ انہوں نے خود کو مصروف رکھنے کے لئے پہلے ڈبل ایم اے کیا۔ پھر پشاور کے ایک اخبار میں کام کیا۔ لیکن ان کا دل وطن عزیز میں اٹکا ہوا تھا۔ وطن کی آزادی کی شدید تڑپ تھی۔ اس لئے جلد ہی منجر امن اللہ کی تنظیم میں شامل ہو گیا۔ سال 1962ء میں منجر امن اللہ شہید مقبول ہٹ، منجر کا لے خان، وراہا جہاگیر کو لے کر کشمیر میں داخل ہوا اور صلح کپواہ کے جنگوں میں ڈیڑے اے اور وادی میں تنظیمی سرگرمیاں شروع کیں۔ اس دوران شہید مقبول ہٹ وادی کے ہر علاقے میں ایک مسافر کی طرح کھولا زندہ ضمیر کے ہر دروازے پر دستک دی۔ بہت سے نوجوانوں سے رابطہ قائم کیا۔ مقبول ہٹ خاصا پڑھا لکھا تھا اور ان کی Motivation کی صلاحیت غضب کی تھی۔ ان کی دلیل اور خلوص نیت کے ساتھ بڑے بڑے لوگ مطیع ہو جاتے۔ اسلام آباد سے ہندو اڑہیک انہوں نے ایک بڑا حلقہ بنایا اور حسب ضرورت ہتھیار بھی فراہم کئے۔ 1947ء کے تجربات کی بنیاد پر اس نے کشمیری پنڈتوں کو بھی اعتماد میں لینے کی کوشش کی تاکہ انقلاب کی صورت میں وہ کسی بحران کا شکار نہ ہوں۔ پنڈت برادری سے ذلتی رسم و راہ قائم کی۔ قلعے تحائف کا تبادلہ بھی کیا۔ (از شہید خدیجہ عبداللہ لونی)

☆☆☆☆☆☆☆☆

ابتدائی تیاریوں کے بعد جون ۱۹۶۶ء میں این۔ ایل۔ ایف کا پہلا مشن مقبوضہ کشمیر

چلا گیا۔ اس میں میجر امان اللہ خان، مقبول بٹ، گلگت کا ایک نوجوان اورنگ زیب اور صوبیدار کالا خان شامل تھے، صوبیدار کالا خان جو مظفر آباد کے رہنے والے تھے ۱۹۴۷ء کی جنگ میں اہم خدمات انجام دے چکے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ مقبول بٹ مقبوضہ کشمیر میں خفیہ طور پر این۔ ایل۔ ایف کو متعارف کرا کر اس کی رکنیت حاصل کریں گے اور لوگوں کو عملی طور پر اس مقصد کیلئے تیار کریں گے۔ جبکہ میجر امان اللہ ان کی تربیت کا انتظام کریں گے۔ اور اس کے بعد آزاد کشمیر سے اسلحہ مہیا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تین ماہ تک مقبول بٹ اور ان کے ساتھی مقبوضہ کشمیر میں سرگرم رہے۔ تین ماہ بعد واپسی کے دوران بھارتی خفیہ سروس کا ایک افسر امر چند مقبول بٹ کے ساتھی اورنگ زیب کے ہاتھوں مارا گیا۔ تین ماہ تک مقبوضہ کشمیر میں سرگرم رہنے سے بھارتی خفیہ سروساں اداروں کو مقبول بٹ اور ان کے رفقاء کی سرگرمیوں کا علم ہو گیا تھا۔ مقبول بٹ کو اپنے مقصد میں کافی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مختلف شہروں میں این۔ ایل۔ ایف کی خفیہ شاخیں قائم ہو گئیں تھیں۔ اور لوگ عملاً مقبول بٹ کے تصورات کے مطابق جدوجہد کرنے کیلئے تیار تھے۔ اس دوران امر چند کا واقعہ قوے پذیر ہوا۔ امر چند کے قتل کی وجوہات کیا تھیں؟ مقبول بٹ کے ایک ساتھی میجر امان اللہ کے مطابق ماگزیر وجوہات کی بنا (جن کی انہوں نے وضاحت نہیں کی) پر امر چند قتل کر دیا گیا۔ بہر حال یہ اس مشن کے ساتھ پیش آنے والا اتفاقی حادثہ تھا جس کا مشن کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ امر چند کے قتل کے فوراً بعد فوج نے وسیع علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور سخت مقابلے کے بعد ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس مقابلے میں گلگت کا نوجوان اورنگ زیب شہید ہو گیا۔ مقبول بٹ، کالا خان اور میر احمد نامی نوجوان گرفتار ہو گئے۔ غالباً بھارتی خفیہ ایجنسیاں ان لوگوں کی ساری سرگرمیوں سے آگاہ تھیں۔ اس لئے ان کے ساتھ بہت سے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتاری کے بعد ان لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس سے قبل تفتیش کے دوران ان لوگوں کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مقبول بٹ اور ان کے ساتھی چار پانچ ماہ تک سرینگر کے باغ ماہتاب نروگیشن سنٹر میں رہے۔ ایک کشمیری عبداللہ ڈار کو شدید اذیتیں دے کر وعدہ معاف

کواہ بنایا گیا اور اسی بنیاد پر مقبول ہٹ اور ان کے ساتھیوں پر غداری، دشمن کا ایجنٹ ہونے اور امر چند کے قتل میں ملوث ہونے کا مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ نیل کلٹھ گنجوا می جج کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس مقدمہ کی تفصیلات تو دستیاب نہیں ہیں البتہ بعض لوگوں کی روایت کے مطابق جب اس مقدمہ میں مقبول ہٹ کو بیان دینے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے اپنے بیان میں تاریخی الفاظ کہے

”میں عدالت کی طرف سے لگائے گئے ہر الزام کو تسلیم کر لوں گا لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے دشمن کا ایجنٹ نہ کہا جائے بلکہ صرف دشمن کہا جائے۔ میں بھارت کے کسی دشمن کا ایجنٹ نہیں بلکہ صرف اور صرف دشمن ہوں۔ مجھے اچھی طرح پہچان لیں میں ہی اس کا دشمن ہوں“

یہ مقدمہ ڈیڑھ سال تک چلتا رہا اگست ۱۹۶۸ء کو مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ فیصلے کے مطابق مقبول ہٹ اور ان کے ساتھی میر احمد کو موت اور کالا خان کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ مقبول ہٹ نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر فیصلہ سنا۔ جب نیل کلٹھ گنجو فیصلہ سنا چکا تو مقبول ہٹ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”جج صاحب ابھی وہ رسی تیار نہیں ہوئی جو مقبول ہٹ کو پھانسی دے سکے“۔ فیصلے کے بعد مقبول ہٹ اور ان کے ساتھیوں کو اپیل کا حق دیا گیا اور جیل میں ان کو باقی لوگوں سے الگ کر دیا گیا۔ مقبول ہٹ نے جیل ہی میں بیٹھ کر خود سزائے موت کے خلاف اپیل تحریر کی۔ اپیل تحریر کرنے کے ساتھ وہ فرار کی منصوبہ بندی بھی کرتے رہے۔ مقبول ہٹ نے سرینگر جیل سے فرار کی منصوبہ بندی کس طرح کی؟ وہ جیل سے کیسے فرار ہوئے؟ اور کس طرح دہسیر کی منجند کر دینے والی سردی میں ہزاروں فٹ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کو عبور کیا؟ اور آزاد کشمیر پہنچے۔ اس کی روداد انہوں نے خود تحریر کی تھی۔ اور یہ روداد ماہنامہ حکایت لاہور میں ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔

سنٹرل جیل سری نگر سے فرار

(شہید کی تحریر کردہ روداد)

دشمن کی جیل یا فوجی کیمپ سے فرار کی کوشش حریت پسند ہمیشہ کرتے چلے آئے ہیں اور گوریلا سرگرمیوں میں ایسی کوششوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ سرینگر مرکزی جیل سے میرا فرار اتفاقاً نہیں، ایک مکمل منصوبہ بندی اور نہایت احتیاط سے وضع کیے ہوئے آپریشن کا نتیجہ تھا۔ جب سے میں گرفتار ہوا تھا، فرار کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ ۱۹۶۷ء کے وسط میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس تحریک کے لئے جس میں کام کرنے کی غرض سے پاکستان سے مقبوضہ کشمیر آیا تھا، میرا فرار لازمی ہے۔ این۔ ایل۔ ایف کے عسکری بازو کے سربراہ میجر امان اللہ آزاد کشمیر واپس چلے گئے تھے اور میرا جیل سے نکل کر اس بازو کو منظم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پہرے کی سختیوں اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فرار میں باہر کے کسی آدمی سے مدد نہ لی جائے۔ اس فیصلے کی بنیادی وجہ یہ خیال تھا کہ اگر ایسی کوئی کوشش کام ہو گئی تو میرے ساتھ ساتھ ان حریت پسندوں کو بھی مصیبت میں مبتلا کر دے گی جو جیل سے باہر تھے اور جن سے فرار میں مدد لینا۔ ۱۹۶۷ء کے موسم خزاں میں سیوریٹی سے متعلق بعض افراد جو سری نگر جیل میں تھے، جیل کے اس حصے میں منتقل کر دیئے گئے جس میں ہم بند تھے۔ جیل کے اس حصے کو جہاں ہماری رہائش تھی زمان خانہ کہتے تھے۔ اسے زمانہ جیل بھی کہا جاتا تھا۔ ان پاکستانی قیدیوں میں گل زمان، جاموس خان اور غلام یاسین شامل تھے۔ اول انزک ۱۹۶۵ء کی جنگ میں آزاد علاقے سے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے تھے۔ اور غلام یاسین مقبوضہ کشمیر میں پاکستان کے لئے جاسوسی کے الزام میں گرفتار تھا۔ ان تینوں کا تعلق آزاد کشمیر سے تھا۔ ان کے آنے سے ہماری تعداد چھ ہو گئی۔ میرے ساتھ پہلے سے صوبیدار کالا خان اور میر احمد قید تھے۔ ہم بیرک کے کمرہ ”اے“ میں رہتے تھے۔ کمرہ ”بی“ کو ہم

باورچی خانہ، غسل خانہ اور رات کے لئے بیت الخلاء کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان دونوں کمروں میں بجلی کے بلب بھی تھے لیکن اس کے باوجود باہر سے ہم پر کڑی نگرانی کی جاتی۔ ہر وقت دو سے چار محافظ وہاں موجود ہوتے تھے۔ ایک کے پاس مشین گن یا ٹائی گن ہوتی اور تین راکٹوں سے مسلح ہوتے تھے۔ یہ محافظ بھارتی فوج کی سیکورٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ فرار کے لئے ہم نے جو منصوبہ بندی کی اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جیل حکام اور انتظامیہ کے ساتھ ہمارے تعلقات، محافظ اور پیرے داروں سے سلوک اور پیرک میں ہماری طرز رہائش۔۔۔ جہاں تک جیل حکام اور انتظامیہ سے تعلقات کا سوال ہے۔ میری پالیسی یہ تھی کہ انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہم نہایت مہذب اور معقول افراد ہیں۔ چنانچہ ان کے سخت ترین ضابطوں پر بھی ہم مسکراتے ہوئے تعاون کرتے اور کسی بھی وقت میں نے یا میرے ساتھیوں نے انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم جیل کے عام قیدیوں کی طرح انتظامیہ کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کسی قسم کی شکایت ہوتی تو میں نہایت معقول طریقے سے ایک کاغذ پر سپر انڈنٹ جیل تک پہنچاتا اور شدید اصرار کے بعد ہم نے منویا کہ وہ جواب تحریری شکل میں ہم تک پہنچائے۔ اس طرح جیل حکام کو ہم سے کسی قسم کی تکلیف یا عدم تعاون کی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ جیل کے بالائی حکام کے بعد ہم نے زیادہ توجہ نیچے والے سٹاف کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پر مرکوز کی۔ سٹاف میں وارڈن اور نمبر دار (پرانے قیدی) خاص طور پر شامل تھے۔ اسے ہماری خوش قسمتی سمجھے کہ ان کی اکثریت مسلمان تھی اور سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ہم سے تھوڑی بہت رعایت روا رکھتے تھے۔ کبھی کبھار ہمیں ان میں سے ایک آدھ کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا اور کوئی محافظ نہ سن رہا ہوتا تو ہم واضح کرتے کہ جن باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ہمیں گرفتار کیا گیا ہے، ان کا تعلق کسی طور لوٹ مار، چوری یا ڈاکوئی سے نہیں۔ بلکہ ہم کشمیر کی آزادی چاہتے ہیں اور غریب عوام کی بہتری کے خواہش مند ہیں۔ یہ صورت حال سیاسی آزادی کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ چند ماہ کی کوشش سے سٹاف میں سے خاص طور پر ہمیں کچھ ایسے ہمدرد مل گئے جو

ہمارے چھوٹے چھوٹے بے ضرر کام مثلاً عام جیل میں بند دوستوں یا ساتھیوں تک پیغامات پہنچانا وغیرہ، خوشی انجام دینے لگے۔

جہاں تک محافظوں کا تعلق ہے ہم ان سے کسی قسم کی توقع نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ باقاعدہ مسلح افواج سے آئے تھے اور اپنا فرض پوری مستعدی سے انجام دیتے تھے۔ البتہ ہم انہیں زیادہ سے زیادہ اطمینان بہم پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی بھی ایسا موقع نہ دیتے کہ ان کے لئے ہماری نگرانی مشکل ہو۔ نئے آنے والے پہرے داروں کو عموماً یہ تاثر دیا جاتا تھا کہ ہم نہایت خوفناک قسم کے مجرم ہیں۔ چنانچہ ہماری پہلی کوشش یہ ہوتی کہ اس تاثر کو ختم کریں اور انہیں گھنٹے میں ساٹھ منٹ تک مسلسل ہماری حرکات کے معائنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے آپس میں اور موقع ملے تو ان سے گفتگو میں ہم یہ ظاہر کرتے کہ ہمارے ذہنوں میں بھارتی فوجیوں کے خلاف کوئی دشمنی نہیں۔ ہم خود باغی، ڈاکو اور لٹیئر نہیں۔ بلکہ سلجھی اور سنبھلی ہوئی فوجی ذہنیت کے سپاہی ہیں۔ تنظیم اور نظم و ضبط کے نہ صرف خود پابند ہیں بلکہ اپنے پہرے داروں سے بھی اسی کی توقع کرتے ہیں۔ جب کبھی ان سے بات کا موقع ملتا، میں انہیں یقین دلاتا کہ جہاں تک ان کی ذیوائی کا تعلق ہے اور ہم پر عائد شدہ پابندیوں کا سول ہے ہم ان کے لئے مسئلہ بننے کے بجائے از خود ان پابندیوں کا اہتمام کریں گے۔ البتہ ہم ان سے مجرموں اور ڈاکوؤں جیسا سلوک نہیں بلکہ اچھے سپاہیوں کے سلوک کی توقع رکھتے ہیں۔ چنانچہ جتنے محافظ بھی آئے ہم نے ہمیشہ انہیں خوش رکھا اور ان کی عزت کی۔ جس کے بدلے میں ہمیں اچھا طرز عمل ملا۔ ہم ہمیشہ اپنے محافظوں کو چائے اور تمباکو پیش کرتے اور اگرچہ وہ انکار کر دیتے تاہم انہیں جواب میں مسکراتا پڑتا۔ ہم جانتے تھے کہ یہ محافظ بھارتی فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم ان کے سامنے جیل اور عام ریاستی پولیس کا مسئلہ اڑاتے۔ اس طرح انہیں برتری کا احساس ہوتا۔ باتوں ہی باتوں میں ہم ان کے شانستہ رویے کی تعریف کرتے اور ان کے نظم و ضبط کو سراہتے۔ چونکہ ایک صوبیدار میرے ماتحت کام کرتا تھا اس لئے محافظوں نے سمجھا کہ میں کمیشنڈ آفیسر ہوں۔ چنانچہ بھارتی فوج سے تعلق رکھنے والے

سپاہی اور چھوٹے انسرفید میں ہونے کے باوجود فوجی انداز میں میرے لئے خصوصاً احترام کا مظاہرہ کرتے۔ ان کو مزید متاثر کرنے کے لئے جب بھی ان کا مائڈ ریا بنالین کماڈر معائنے کے لئے آتا تو میں اسے ہیلو کہتا۔ اور ایسے خصوصاً انداز میں بات چیت کرتا جیسے ایک فوجی انسرفی دوسرے فوجی انسرفی سے بات کرتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق مخالف فوج سے ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا کرنے سے باہر کھڑے پھرے داروں پر میں یہ تاثر چھوڑتا کہ میں باغی، ڈاکو یا لٹیرا نہیں بلکہ ایک قابل احترام فوجی انسرفی ہوں۔ اس کے علاوہ مہینوں تک میں نے اپنے پھرے داروں کی خصوصاً عادات اور ان کے ذہن کی رفتار کا مشاہدہ کیا۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام تھا۔ لیکن بہر طور کرنا پڑا۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے ان میں نظم و ضبط اور تنظیم پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ باہم عزت و احترام، اعتماد اور محبت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے ہم نے مسلسل کوششیں کیں۔ میں نے ہر قسم کی قصہ کوئی، اونچی آواز میں ہنسنا، ہر کوشیاں، زور شور کی بحث اور اختلافی مسائل پر گفتگو ممنوع قرار دے دی۔ کیونکہ ان سے آپس میں کشیدگی پیدا ہو سکتی تھی۔ میرے ساتھیوں نے میری درخواست پر عمل کیا اور طریق کار طے پایا کہ جب کبھی ان میں کوئی اختلاف پیدا ہو معاملہ صوبیدار کالا خان کے سامنے پیش کیا جائے اور اگر اس کے فیصلوں سے بھی اختلاف باقی رہ جائے تو معاملہ مجھ تک لایا جائے نیز میرے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ایک اور مسئلہ جس پر اختلاف ہو سکتا تھا، وہ کام کاج کی تقسیم کا تھا۔ میں نے کھانے پکانے اور کپڑے دھونے کا کام ڈیوٹی کے مطابق تقسیم کر دیے۔ اس کے علاوہ زمان خانے کے صحن میں چھوٹا سا باغیچہ لگانا شروع کر دیا تاکہ بیکار وقت میں ذہن اور جسم کو مایوسانہ خیالات سے محفوظ رکھا جائے۔ روزمرہ ٹائم ٹیبل میں جسمانی ورزش کے لئے ایک گھنٹے کا وقت مقرر کیا گیا۔ شام کو ہم سب کوریڈا سرگرمیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے اور ہر شخص اپنے سابقہ تجربات دھراتا۔ میں چاہتا تھا کہ ذہنوں میں مایوسی اور قنوطیت پیدا نہ ہو اور حوصلے بلند رہیں۔ جہاں تک فرار کا تعلق ہے۔ میں ان ساتھیوں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران دشمن کی قید سے بھاگنے والوں کی داستان سنانا اور کشمیر کے پس منظر میں فرار

کے مختلف طریقوں پر بحث کرتا۔ ۱۹۶۸ء تک ہم ذہنی طور پر اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ جیل سے فرار ممکن ہے اور چھوٹی چھوٹی مشینیں اور ڈرامے ترتیب دے کر، اپنے خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے فرار کے منصوبوں کی کارگردگی کا جائزہ لیتے۔ ہم میں سے کچھ پہرے دار بنتے اور کچھ قیدی۔ اور آپس میں شدید بحثیں ہوتیں کہ مخصوص حالات میں قیدی کیا محسوس کرتا ہے اور پہرے دار کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ شروع میں ہمیں جیل کے عام باورچی خانے سے کھانا ملتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ہمیں دوسری مرتبہ عدالت کے سامنے لایا گیا تو میں نے تحریری درخواست میں کھانے کی خرابی اور برتنوں کے انتہائی گندہ ہونے کی شکایت کی۔ اس کے علاوہ صابن، تیل، کمر اور چٹائیوں کے بھی ناقص اور کم ہونے کی شکایت بھی کی۔ جج نیل کڈھ نے وعدہ کیا کہ وہ تحقیقات کرے گا۔ اس نے میری تحریری درخواست پر کچھ لکھ کر جسے میں نہ پڑھ سکا۔ سپرائنٹ جیل کو پہنچا دیا۔ اس دن کے بعد ہمیں خشک راشن ملنے لگا۔ اب ہم خود کھانا پکا سکتے تھے۔

بعد ازاں جاموس خان، گل زمان اور غلام نبین کو ہمارے احاطے میں بھیج دیا گیا۔ جنہیں سی کلاس ہونے کی وجہ سے تین روپے روزانہ خوراک کے لئے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ پانچ روپے ماہوار کپڑوں کا صابن اور شیشری خریدنے کے لئے دیئے جاتے۔ ہر صبح ایک سکھ وارڈن سوداگر سنگھ ہمارے پاس آتا اور کھانے پینے کی چیزوں کے آرڈر لے جاتا، اس کے علاوہ ہمیں انگریزی اخبار ”انڈین ایکسپرس“ اور مقامی اردو اخبار ”آفتاب“ اور سگریٹ بھی دیئے جاتے۔ سردیوں میں ہمیں جلانے اور کمرہ گرم رکھنے کے لئے کوند ملتا تھا، اس کے ساتھ ہمیں لوہے کی بنی ہوئی آنکھٹی دی گئی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ان سے بعد میں ہمیں فرار میں بڑی مدد ملی۔ زمان خانہ ایک پرانی عمارت پر مشتمل تھا جس کی دیواروں پر مٹی کی لپائی کے نیچے سامنے کی دیوار پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ احاطے کی اندرونی دیواریں ایک اینٹ کی موٹائی پر مشتمل تھیں۔ چھت سینماؤں کی طرح ٹین کی اور خرطی تھی اور اس کے نیچے لکڑی کی چھت تھی۔ روم ”اے“ میں دو کھڑکیاں اور دروازے تھے۔ ایک دروازہ آنے جانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ دوسرے میں آہنی سلاخیں

لگی ہوئی تھیں۔ روم ”بی“ کی دو کھڑکیاں اور لکڑی کا ایک دروازہ تھا۔ کھڑکیوں میں قفل پڑے تھے۔ کھوٹھری مکمل تاریک ہو جاتی تھی۔ کھوٹھری نمبر ۲ سٹور کا کام دیتی تھی۔ اسی میں ناقابل استعمال اور متروک کمر، لپٹی ہوئی چٹائیاں اور دوسرا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ اس کے دروازے کو لکڑی کے تختوں اور میخوں کی مدد سے بند کر دیا گیا تھا۔ روم ”اے“ اور ”بی“ کے فرش پختہ سیمنٹ کے تھے اور کھوٹھری نمبر ۱ کا فرش کچا تھا۔ فرش اور دفن کی بلندی تک دیواریں نرم اور سیم زدہ تھیں۔

۲۱/ اگست ۱۹۶۸ء کو جج کے فیصلے کے خلاف میں نے مقبوضہ کشمیر کے چیف جسٹس کے پاس اپیل دائر کی۔ اس کا مضمون تین سو صفحات پر مشتمل تھا اور یہ اپیل میں نے کھوٹھری نمبر ۱ کے سیم زدہ فرش پر بیٹھ کر لکھوائی تھی۔ یہ اپیل شہید کا ایک ایسا نایاب نسخہ ہے جسے ہائی کورٹ کے ریکارڈ میں موجود ہونا چاہئے تھا لیکن بسیار تلاش کے بعد بھی اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ ممکن ہے نئے Right of information قانون کے تحت یہ دستاویز حاصل کی جاسکے گی۔ چند روز کے بعد جیل حکام نے میری کھوٹھری میں لکڑی کے دروازے کے بجائے لوہے کا دروازہ لگوا دیا۔ ہمارے مطالبے پر انہوں نے فرش پختہ کر لیا اور دیواروں پر سفیدی پھرا دی۔ ہم نے بلب کے لئے کہا لیکن یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ سزائے موت کے قیدیوں کے لئے اندرونی روشنی کی اجازت نہیں۔ البتہ رات کے وقت ایک بے ہنگم سی لائٹیں سلاخ دار دروازے کے باہر جلا کر رکھ دی جاتی۔ جس سے تھوڑی بہت روشنی اندر آ جاتی تھی۔ ہماری درخواست پر ٹھیکیدار نے (جس نے دیواروں پر سفیدی کروائی تھی) کھوٹھری کی دیوار میں کپڑے اور قرآن حکیم لٹکانے کے لئے چھ انچ لمبا ایک کیل گاڑ دیا۔ دیگر حفاظتی اقدامات سخت کر دئے گئے۔ چونکہ مجھے اور میر احمد کو سزائے موت ملی تھی اس لئے احاطے میں گھومنے اور ہیٹ الخلاء وغیرہ جانے کے دوران ہمیں ہتھکڑیاں لگا دی جاتیں۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ہم نے باقاعدہ کام کا آغاز کیا۔ ادھر ہائی کورٹ میں اپیل کا مسئلہ چل رہا تھا اور ادھر میں نے آہستہ آہستہ درج ذیل معلومات جمع کر لیں۔ زنان خانہ جیل کی بیرونی دیوار سے صرف آٹھ فٹ کے فاصلے سے شروع ہوتا تھا۔ جیل کی بیرونی اور بڑی دیوار سے باہر کھیت تھی جہاں سبزی بوئی جاتی

تھی اور بے ضرر قیدیوں کو مشقت کے لئے وہاں لے جایا جاتا تھا۔ بیرونی اور بڑی دیوار کے باہر کوئی محافظ نہ تھا۔ فرار کے لئے سردیوں کا موسم بہترین تھا۔ کوٹھری نمبر ۲ جس میں چیزوں کا سٹور تھا جیل کی بیرونی دیوار پر ختم ہوتی تھی۔ اس کوٹھری کی بیرونی دیوار پر سیمنٹ کا پلاسٹر تھا اور اندر کول پتھر اینٹوں اور چوڑے کے گارے سے چٹائی گئی تھی۔ فرش پر اس دیوار کی چوڑائی تین فٹ کے قریب تھی۔ کوٹھری نمبر ۱ (جسمیں ہم رہتے تھے) اور کوٹھری نمبر ۲ (جسمیں سٹور تھا) کے درمیان اینٹوں کی دیوار تھی اور اس دیوار کے دونوں اطراف گارے کا لپ کیا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء کے آخر میں گل زمان، جاموس خان اور غلام نبین نے جو کمرہ ”اے“ میں رہتے تھے۔ جیل حکام سے احتجاج کیا کہ وہ صوبیدار کالا خان کو، جو ان کی فوج کا آفیسر ہے کو، ہمارے لئے کھانا پکاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ اسماعیل نامی ایک کشمیری کو جس پر جیب ترشی اور چوری کے الزامات تھے، ہمارے باورچی کے طور پر بھیجا گیا۔ اس سے میں نے درج ذیل معلومات حاصل کیں۔ اینٹوں کی دیوار توڑنا مشکل کام ہے۔ پتھر کی دیوار میں سے ایک پتھر نکالنا آسان ہے۔ پتھر کی دیواروں میں شکاف کرتے وقت اس مسئلے کو توڑنا مشکل ہے جس سے پتھر جوڑے جاتے ہیں۔ میر احمد کے ساتھ مل کر میں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ہم کوٹھری نمبر ۱ اور کوٹھری نمبر ۲ کے درمیان مشترکہ دیوار میں شکاف کریں تاکہ بوقت ضرورت ہم میں سے کوئی شخص کوٹھری نمبر ۲ میں جاسکے۔ کوٹھری نمبر ۲ میں پرانے کمبلوں کے ڈھیر کے وسط سے گزر کر بیرونی دیوار تک پہنچا جاسکتا تھا اور اس دیوار میں شکاف ڈل کر ہم جیل سے باہر نکل سکتے تھے۔ ہمارے اندازے کے مطابق کوٹھری نمبر ۱، اور ۲ کے مابین جو دیوار تھی، اس میں شکاف ڈالنا ایسا مشکل کام نہ تھا۔ لیکن کوٹھری نمبر ۲ کی بیرونی دیوار کو توڑنا تقریباً ناممکن نظر آتا تھا کیونکہ یہ کوٹھری جی کی نہیں جیل کی بھی آخری دیوار تھی اور اس دیوار سے باہر جیل کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوٹھری نمبر ۱ اور ۲ کے درمیان کیے جانے والے شکاف کو پہرے داروں کی نظر سے کیونکر چھپایا جائے۔ سردیوں کے آخر میں ہم نے دیکھا کہ کوٹھری کی دیواروں میں نمی اور سیم زیادہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ چند کمبل لے کر ہم

نے فرش سے لیکر اڑھائی فٹ اوپر تک دیواروں پر لگائے۔ پہرے داروں سے ہم نے کہا کہ نمی سے ہمارے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ نگلی دیواروں سے سردی بھی اندر آتی ہے۔ کمبل لگانے سے جگہ گرم ہو جائے گی۔ پہرے داروں نے اس پر اعتراض نہ کیا اور اسے معمول کے مطابق سمجھا۔ ہم نیل سپرائنٹ، کمپنی کمانڈر اور بنالین کمانڈر کے معمول کے دورے کا انتظار کرنے لگے۔ ان تینوں اصحاب نے دورہ کیا لیکن ان میں سے کسی نے اس تبدیلی پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے سپرائنٹ نیل سے شکایت کی کہ سخت سردی میں لکڑی کے فریم اور سلاخوں والے دروازے سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ براہ کرم اس کی جگہ بند دروازہ لگا دیا جائے۔ نیل سپرائنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس پر عمل درآمد کروائے گا۔ اسی دوران ہم نے اجازت لے لی کہ موجودہ سلاخ دار دروازے پر ایک کمبل لٹکالیں اور صرف اوپر کے حصے کو ایک فٹ کے قریب کھلا چھوڑ دیں تاکہ پہرہ دار اندر جھانک کر دیکھ سکے۔ اور باہر رکھی جانے والی لائٹن کی روشنی اندر آ سکے۔ سوداگر سنگھ ہر شام ہمارے لئے اخبار لایا کرتا تھا۔ دہلی کے اخبار سرینگر میں بالعموم شام کو ہی پہنچتے تھے اور ہم کو نیل حکام کے سنسر کے بعد رات گئے ملتے۔ اخبار پڑھنے کے بہانے میں دروازے کے پاس کھڑا ہو جاتا اور کمبل کے اوپر کھلے دروازے سے باہر جھانکتا۔ اخبار پڑھنے کا مرحلہ دس سے پندرہ منٹ تک مکمل ہو جاتا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں دس پندرہ منٹ ایسے ہوتے کہ جن میں کوٹھری کے اندر کوئی کاروائی کی جاسکتی تھی۔ بظاہر میں اخبار پڑھتا رہتا لیکن میری ساری توجہ کامرکز وہ پہرہ دار ہوتا جو سامنے ڈیوٹی دیتا تھا یہ پندرہ منٹ ہمیں پانچ سے چھ بجے کے درمیان میسر آتے تھے۔

پہلے مرحلے میں ہم نے چوبیس گھنٹوں میں سے میسر آئے ہوئے ان پندرہ بیس منٹ کو غنیمت جانا۔ میرا حمد نے چھ انچ لمبے کیل سے جو ہم نے کپڑے لٹکانے کے لئے دیوار میں لگوا دیا تھا اور جس کی جگہ بعد میں ہم نے چھوٹا سا کیل لگا لیا تھا، کوٹھری نمبر ۱۱ اور کوٹھری نمبر ۲ کی درمیانی دیوار میں شکاف ڈالنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ گارے کے ٹکڑے اور مٹی وغیرہ جو دیوار کھودنے سے برآمد ہوتی اسے چٹائی کے نیچے چھپا دیا جاتا تھا۔ یہ کام نہایت آہستگی سے کیا جاتا کہ کمبل سے ڈھانپے ہوئے

دروازے کے دوسری طرف گھومنے والے کسی پہرے دار کو آواز نہ سنائی دے۔ اس کے بعد اینٹیں برآمد ہوتیں انہیں ہم نے اپنے تئیکے تلے چھپایا، بعد ازاں جب شکاف بڑا ہوا اور کوٹھری نمبر ۲ میں داخل ہونا ممکن ہو گیا تو اینٹیں، پلاسٹر، گارے اور مٹی وغیرہ کو کوٹھری نمبر ۲ میں کمبلوں کے نیچے چھپا دیا گیا یہ سارا کام روزانہ پانچ سے دس منٹ تک ہوتا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ہمیں انگریزی کا اخبار مل جائے اور میں اسے بظاہر پڑھنے کے بہانے دروازے کے پاس جا کر رکھی ہوئی لائٹن کی روشنی حاصل کر سکوں اور پہرے دار پر نظر رکھ سکوں۔ جب کسی روز اخبار نہیں آتا تو کام بند کرنا پڑتا۔ چنانچہ یہ چھوٹا سا شکاف جس میں سے ایک شخص بمشکل ریگ کوٹھری نمبر ۲ میں پہنچ سکتا تھا مکمل کرنے کے لئے ہمیں آٹھ دن لگے۔ چونکہ شکاف کے اوپر کمبل کا پردہ لٹکا ہوتا تھا جو فرش سے اڑھائی فٹ تک کمرے کی چاروں دیواروں پر لگا دیا گیا تھا اس لئے دن میں پہریدار قریب آ کر دروازے کے اوپر جھانکتے تو بھی شک نہ گزرتا۔

نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہم نے دوسرے مرحلے پر کام شروع کیا۔ اب کوٹھری نمبر ۲ کے کمبلوں میں سے جن کا انبار چھت تک لگا ہوا تھا، کوٹھری کی بیرونی دیوار تک پہنچنے کا راستہ بنایا گیا۔ میں نے میرا احمد کو غسل خانے سے بلید لا کر دیا اس نے کمبل کے ایک گھٹے کو کاٹا۔ بہت سے سڑے بے، لمبے بدبودار کمبل اپنی کوٹھری میں پہنچا دیے گئے۔ ہم نے کمبلوں کو بڑی آہستگی اور ہوشیاری سے اپنے بستروں کے نیچے بچھالیا۔ اوپر سے یہ کمبل دکھائی نہیں دیتے تھے اور ان کے بچھانے سے کمرے کی سطح اتنی بلند نہ ہوئی تھی کہ باہر سے جھانکنے والا کوئی اندازہ قائم کر سکتا۔ اب ہم نے کام کا وقت بدلا۔ ہمیں کوٹھری نمبر ۱ میں کوئی کام نہ تھا۔ لہذا اخبار پڑھنے والی ترکیب ختم کر دی گئی۔ البتہ معمول کے مطابق اخبار لیتے ہی میں دروازے کے پاس چلا جاتا تا کہ کسی کو شک نہ پڑے۔ اب رات کا چھپا پھر موزوں تھا۔ بارہ بجے سے دو بجے تک کا وقت نسبتاً محفوظ ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بارہ بجے تک ہم بظاہر سوئے رہتے اور سولہ بارہ بجے کے قریب میرا احمد دیوار پر لگا ہوا کمبل اٹھا کر ریگتا ہوا کوٹھری نمبر ۲ میں پہنچ جاتا۔ اس دوران وہ اسی شکاف سے کمبل کا ایک گٹھا میرے حوالے کرتا

اور میں اس کے بستر پر کمبلوں کو رول کر کے اس طرح بچھا دیتا کہ وہ ڈمی کا کام دیتے ہئا کہ کوئی پہریدار قریب آ کر دیکھے تو اسے شک نہ پڑے۔ ایک سے دو بجے تک میں مسلسل جاگتا اور میرے کان پہریدار کے قدموں کی چاپ کی طرف لگے رہتے۔ بلیڈ اور آہنی کیل ہمارے کل ہتھیرتھے۔ اس مرحلے سے گزرنے میں ہمیں آٹھ سے دس روز لگے۔

اگلا مرحلہ بہت مشکل تھا۔ اس میں ذیل کی بڑی دیوار میں نقب لگانا مقصود تھا۔ میرا احمد کو اس کام میں بیس سے پچیس دن لگے۔ اس مرحلے میں کیل کے علاوہ آنکھیں سے اکھاڑی ہوئی لوہے کی دس انچ لمبی سلاخ نے ہمیں بہت کام دیا۔ سب سے پہلے کیل کے ساتھ بیرونی ٹیپ اکھاڑی جاتی۔ پھر پتھر کے اطراف کو لوہے کی بڑی سلاخ سے خالی کیا جاتا۔ لکڑی کی ایک چھڑی سے جسے ہم نے ایندھن سے اٹھایا تھا گرتے ہوئے پلاسٹر کو سہارا دیا جاتا۔ یہ سارا کام نصف شب کے قریب آدھ پون گھنٹے کے لئے ہوتا۔

کیم یا دو نومبر ۱۹۶۸ء کو ہمارے احاطے کے پہریدار تبدیل ہو گئے۔ نئے پہریداروں کا تعلق حسب معمول بر اور است بھارتی فوج سے تھا۔ وہ سی۔ آر۔ پی ہٹلین مدراس سے تعلق رکھتے تھے۔ سپاہی اور ان کے چھوٹے افسر نو عمر تھے۔ وہ اردو تو کیا ہندی بھی پوری طرح نہیں بول سکتے تھے۔ یہ لوگ انگریزی پڑھ سکتے تھے یا پھر تامل۔ حسب معمول ہم نے انہیں تھوڑے عرصے میں اپنی بنیدگی، ہمتانت اور وقار کا احساس دلایا۔ ان کی باتوں سے میں نے تھوڑی بہت تامل سیکھنی شروع کی۔ بے چارے میدانِ علاقوں سے آئے تھے اور جنوب کے گرم موسم کی فہست سرینگر کا رخ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ شروع میں ہم نے کانگریاں پیش کیں۔ بعد ازاں انہیں کوند اور بڑی آنکھیاں ذیل حکام سے مل گئیں۔ رات کے وقت چاروں پہرے دار بڑی آنکھیں میں کوند جلا کر بیٹھ جاتے۔ چائے پکاتے اور گپ شپ لڑاتے اور یہ سمجھتے کہ کوٹھڑیوں کے اندر قیدی سو رہے ہوں گے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم اندر کسی اور کام میں مصروف رہتے ہیں۔

۱۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو بھارتی وزیر داخلہ مسٹر چاون نے اعلان کیا کہ ”حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۲

نومبر ۱۹۶۸ء کے بعد سزائے موت پانے والے سارے قیدیوں کی باقی سزا کو عمر قید میں بدل دیا جائے گا۔“ قیدیوں کو یہ رعایت مہاتما گاندھی کی بیس سالہ برسی کے موقع پر دی گئی۔ بھارت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہزار ہا سزائے موت پانے والے قیدی اس رعایت کی وجہ سے عمر قیدی بن گئے۔ چنانچہ اگلے روز جیل سٹاف کے کچھ ممبران ہمیں مبارک باد دینے آئے۔ محافظ پھریاروں اور جیل حکام کا خیال تھا کہ ہمیں ان کوٹھریوں سے نکال کر دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ اس صورت حال سے ہم بہت گھبرائے کیونکہ فرار کا تین چوتھائی کام مکمل ہو چکا تھا اور ہم کوٹھری نمبر ۲ کے درمیان اور جیل کی بیرونی دیوار میں دھندلکاٹ ڈال چکے تھے ان کی مٹی اور اینٹیں کوٹھری نمبر ۲ کے کمبلوں کے نیچے جا چکی تھیں۔ کوٹھری نمبر ۲ کے سوراخ کو کمبل کے گٹھے اور کوٹھری نمبر ۱ کے سوراخ کو دیوار پر لگائے ہوئے کمبلوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ ہم نے جیل سٹاف سے کہا کہ ہمارے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہونے اور یہاں رہنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معلوم ہوا کہ باقاعدہ بھارتی صدر کے سرکاری احکام کے آنے تک ہماری حیثیت سزائے موت کے منتظر قیدیوں کی ہی رہے گی۔ اس کے باوجود ہم پر سختیاں کم کر دی گئیں اور ہمیں باہر لے جاتے وقت ہتھکڑی نہ لگائی جاتی۔ میں نے سوچا ہمیں فرار میں جلدی کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں کسی دوسری جگہ تبدیل کر دیا جائے۔ پھریار کی گفتگو سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جنوبی ہند سے آئے ہوئے یہ پھریار شمالی ہند کی بلا دستی سے خوش نہیں۔ جب کبھی میں انہیں مدراسی کی خبریں سناتا یا اخبار میں کسی مدراسی لیڈر کا بیان پڑھ کر سناتا تو ان کے چہرے خوشی سے کھل جاتے۔

نومبر ۱۹۶۸ء میں اسماعیل باورچی کاروم اے کے باسیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے جیل حکام سے کہہ کر اپنا تاولہ دوبارہ عام جیل میں کروالیا۔ ہم دونوں کے لئے غلام بیسین کو کھانا پکانے پر مامور کیا گیا۔ اسی مہینے کے تیسرے ہفتے میں رمضان شروع ہو گیا۔ غلام بیسین افطار و سحری کے اوقات کے علاوہ نمازوں کے وقت بھی کوٹھری نمبر ۱ میں آنے لگا۔ جہاں میں اور میر احمد قید تھے۔ پھریاروں نے ان غیر معمولی اوقات میں اس کی آمد پر رمضان اور ہمارے مذہبی نظریات کے

پیش نظر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چنانچہ ہم صبح کی نماز کوٹھری نمبر ۱ میں پڑھتے۔ بعد ازاں قرآن مجید سے میں انہیں جہاد کے بارے میں آیات سنا تا کہ ان کا حوصلہ بلند رہے۔ پہلے مرحلے میں کوٹھری نمبر ۱ اور نمبر ۲ کا سوراخ میرے سامنے مکمل ہوا تھا۔ دوسرے اور تیسرے مرحلے کا کام میرا احمد نے تنہا اور مکمل تاریکی میں انجام دیا تھا۔ آخری رپوٹ کے مطابق وہ بیرونی دیوار کا شگاف مکمل کر چکا تھا۔ صرف بیرونی تہہ مصلحتاً چھوڑ دی گئی تھی، تاکہ بوقت ضرورت اسے توڑا جائے۔ اور وقت سے پہلے باہر سے کوئی شخص دیوار کو ٹوٹا ہوا نہ دیکھ سکے۔ بیرونی دیوار دہری تھی۔ ایک رات میرا احمد اس آخری کام کو سر انجام دینے گیا اور ریگلتا ہوا واپس آیا تو اس کی سانس پھولی ہوئی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے اندر دہ لہجے میں کہا۔ ”شاید قدرت کو شاید ہماری آزادی منظور نہیں۔ جیل کی بیرونی دیوار میں ایک پتھر ایسا ہے جو بالکل نہیں ہلتا۔ اب کیا کریں؟ نہ اب سرنگ بند کر سکتے ہیں اور نہ اس میں سے فرار ہو سکتے ہیں۔“ میں نے میرا احمد کو تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ پتھر کے دونوں اطراف کھدائی کا کام جاری رکھے۔ میرا احمد کا خیال تھا کہ اس کام میں تین سے چار روز صرف ہو گئے۔ اگلے روز یعنی آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی شب میرا احمد معمول کے مطابق کام پر گیا اور بڑے پتھر کے ساتھ والے پتھر کو کھودنا شروع کر دیا۔ یہ پتھر نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس کے پلتے ہی بڑا پتھر جو ہماری نقب میں رکاوٹ تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میرا احمد خوشی خوشی واپس آیا۔ میں کن الفاظ سے بیان کر سکتا ہوں کہ اس کے چہرے پر کس قدر مسرت کے آثار تھے۔ وہ اس قدر جوش میں آیا ہوا تھا کہ مجھ سے لپٹ گیا اور میرا ماتھا چوم لیا۔ دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہم نے دو بجے تک انتظار کیا۔ نئے پہریدار آئے اور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ غلام نسیم کو کمرہ نمبر ۱ سے نکالا گیا۔ اور ہمارے پاس پہنچا دیا گیا تاکہ معمول کے مطابق سحری تیار کر سکے۔ اس نے آنکھٹی میں آگ جلائی۔ ہم نے دودھ گرم کر کے پیا۔ پھر غلام نسیم نے دروازے کے پاس جا کر سردی کی شکایت کرتے ہوئے کمبل کو مزید پھیلا دیا۔ یہ سحری گھر کی سردی تھی جسے آپ تصور میں نہیں لا سکتے۔ پہرے دار بڑی انگلیٹھی کے گرد حسب معمول آگ تاپ رہے تھے اور ہماری طرف سے بالکل مطمئن نظر

آتے تھے۔ ہم نے نیسین کو پروگرام سمجھایا۔ میرا احمد سب سے پہلے سرنگ میں گھسا۔ پھر غلام نیسین اور بعد ازاں میں۔ اس کام میں صرف پندرہ منٹ لگے۔ ہمارے کھانے پینے کی چیزوں میں چار روٹیاں مکھن کی دوٹکیاں تھوڑی سا کھانڈ، ایک پونڈ خشک دودھ، لپٹن ٹی کا ایک پاکٹ، تکیے کے غلاف میں بندھے ہوئے ایک درجن ابلے ہوئے اندھے اور سگریٹ کی ایک ڈبیا موجود تھی۔ میرا احمد نے یہ سامان اٹھا رکھا تھا۔ نیسین کے پاس قرآن مجید اور نظر بندی کے کاغذات اور سری نگر جیل میں میرے مقدمے کی مکمل فائل تھی۔ جبکہ میرے پاس دو مکمل تھے۔ یہاں ایک لمحے کے لئے رک کر ہم اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچا جو ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے۔ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران جب سے ہم نے اندازے کے مطابق فرار کی تاریخ مقرر کی تھی وہ پہلے متذبذب اور بعد ازاں کھلے بندوں کہنے لگے کہ فرار بہت مشکل ہے۔ اور اتنی شدید سردی میں برنپوش پہاڑوں اور اوایوں کو عبور کر کے آزاد کشمیر تک پہنچنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ چنانچہ آخری مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مکمل طور پر انکار کر دیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ وہ منزل کے قریب پہنچ کر پلٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر میں نے ان سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے بار بار پوچھا وہ کیوں ہچکچا رہے ہیں؟ تو ان کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ اقدام خودکشی سے کم نہیں اور ہم کسی طرح جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو آزاد کشمیر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ انہیں مزید پریشان نہ کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ناراض ہو جائیں یا جذباتی طور پر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں اور اس طرح ہمارا بھید کھل جائے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ ہمارے ساتھ نہیں آنا چاہتے تو نہ سہی لیکن ہم سے استعد تعاون ضرور کیجئے کہ اس سلسلے میں آپ کوئی لفظ زبان پر نہ لائیں۔ آگے ہم جانیں اور ہمارا کام۔ انہوں نے بخوشی اسے قبول کر لیا میں سمجھتا ہوں کہ وہ محض خوف زدہ تھے۔ شدید خوف زدہ۔ بھاگنے کا موقع آیا تو ان پر خوف کا ایسا شدید غلبہ طاری ہوا کہ وہ اپنے اندر اسکی جرات پیدا نہ کر سکے کہ وہ یہ کام کر سکیں۔

۹ دسمبر ۱۹۶۸ء کو شروع ہوئے دو گھنٹے سے زائد گزر چکے تھے۔ رات کے ٹھیک ڈھائی بجے ہم تینوں

میں، میرا احمد، اور غلام نبین نے وہ ہری دیوار کی نقب میں داخل ہو کر ریگنا شروع کیا، چند ہی منٹ بعد ہم جیل کی بیرونی دیوار سے باہر سبزیوں کے کھیت میں کھڑے، سرینگ کی تازہ ہوائیں سانس لے رہے تھے۔ یہ سب کچھ اتنا جلدی ہوا کہ مجھے خود اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور سارا جسم کسی آہٹ یا کھٹکے کو محسوس کرنے کے لیے پوری طرح مستعد تھا۔ لیکن چاروں طرف سخت سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے پودوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سبزیوں کے کھیت سے گزر کر ہم بادام واری پہاڑی کے دامن کی طرف بڑھے اور پندرہ منٹ کے بعد ایسی نہر پر پہنچے جو جھیل ڈل سے نکلتی ہے۔ اس نہر کو عبور کر کے ہمارے جسم سردی سے اکڑ گئے۔ یہ آزادی کا جذبہ اور ایمان کی حرارت تھی کہ ہم نے سردی کو شکست دی، ورنہ ماہل حالات میں ٹانگیں بے کار ہونا یقینی تھا۔ ہماری دائیں جانب میماون (غالباً یہ زیرِ بون پہاڑی سلسلے کے بارے میں لکھا گیا ہے) پہاڑ کھڑا تھا، جس کی چوٹی سے ہم اپنی سمت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ یہاں ہم نے سڑک چھوڑ دی اور سب کے باغات میں سے دوسری سمت چلنے لگے۔ ان باغات سے گزر کر ہم تیل بل گاؤں پہنچے۔ اس گاؤں میں باہر نہر میں بے اندازہ پٹنیں تیر رہی تھیں۔ ہم دبے پاؤں وہاں سے گزرے۔ پھر بھی ہماری آہٹ سے وہ بدکیں اور پھر شور مچانے لگیں۔ ہم گھبرائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ گاؤں والوں کو یا کسی پہریدار کو ہماری موجودگی کا علم ہو جائے۔ لیکن گاؤں میں کوئی شخص جاگ نہیں رہا تھا۔ دسمبر کی شدید سردی میں رات کے تین بجے یوں بھی کسی تنفس کا بلا بچہ گھر سے باہر ملنا ممکن نہ تھا۔ اس گاؤں سے گزرنے کے بعد ہم سرینگ سے خاصے فاصلے پر نکل آئے اور اب ہمیں تسلی ہو گئی۔ یہاں علاقہ اسی قسم کا تھا کہ اگر کوئی ہمارا تعاقب کرتا تو ہم با آسانی کچھ دیر کے چھپ سکتے تھے۔ گاؤں سے نکل کر آزاد کشمیر پہنچنے میں ہمیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کس طرح ہم زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرے، کیونکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کیا اور کیونکہ بالآخر خدا نے ہمیں کامیاب و کامران کیا۔ اس داستان کو بیان کرتے وقت میں خاص طور پر احتیاط سے کام لیتا چاہتا ہوں۔ بعض ایسے راستوں، اشخاص

اور مقامات کا ذکر دانستہ طور پر اس لئے نہیں کروں گا کہ حریت پسندوں کے ہمدردوں کا علم بھارت کو نہ ہو جائے۔ مجھے احساس تھا کہ جیل سے ہمارے فرار کو دشمن کی حفاظتی افواج اپنے لئے چیلنج تصور کریں گی۔ ہمیں گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ لہذا ضروری تھا کہ آزاد کشمیر پہنچنے تک کے سفر کی منصوبہ بندی اس طرح کی جائے جو ہر طرح سے محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے حسب ذیل پیش بندیاں کیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جن لوگوں سے ہماری رشتہ داریاں تھیں یا جن سے مسلح کاروائیوں کے دوران رابطہ ہوا تھا، ان سے دور رہا جائے، کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ جیل سے ہمارے فرار کے بعد دشمن کی توجہ سب سے پہلے انہی لوگوں کی طرف ہوگی۔ اپنے پیچھے اس قسم کا کوئی نشان نہ چھوڑا جائے جس سے دشمن کو ہمارے سفر کی سمت یا ہماری نقل و حرکت کے بارے میں کوئی اشارہ مل سکے۔ اس قسم کا بھی کوئی نشان نہ چھوڑا جائے جس سے دشمن کو یہ پتہ چل سکے کہ ہمیں کسی بھی جانب سے کوئی بھی امداد ملتی ہے۔ عوام سے رابطے سے گریز کیا جائے اور بہت ہی مجبوری کی حالت میں کسی شخص سے رابطہ کرتے وقت حفاظتی انتظامات کو پیش نظر رکھا جائے۔ ہمیں امید تھی کہ ہم پانچ میل فی گھنٹہ رفتار سے چل سکیں گے۔ باوجود اس کے کہ طویل عرصے تک ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے ایسا کرنا دشوار تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فرار کے بعد ندی ماٹے اور جھیلیں عبور کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ دشمن اگر تربیت یافتہ کتے استعمال کرے تو تعاقب کو غیر موثر بنایا جاسکے۔ کیونکہ یہ کتے عام طور پر پانی کے قریب پہنچ کر اپنے شکار یا مغرور کی بوکھو بیٹھتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ ہمارا سفر دریائے جہلم کے شمالی علاقوں میں سے ہوگا یہ علاقے سرینگر، گاندرمل، بانڈی پور، تحصیلوں پر مشتمل ہیں۔ اس علاقے سے میں ذاتی طور پر واقف تھا اور تمام راستوں کا علم بھی تھا۔

کسی مغرور کو گرفتار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے گردناک بندی کی جائے۔ اس میں عام سڑکوں، راستوں، گزرگاہوں، دریائی گھاٹیوں پر مخصوص دائرے کے اندر حفاظتی اقدام کرنا شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ حفاظتی دستے اس علاقے میں وسیع پیمانے پر مغرور کی تلاش میں کو نہ کو نہ چھان

مارتے ہیں۔ اور گھر گھر تاشی لی جاتی ہے۔ اپنے معاملے میں مجھے یقین تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں انٹیلی جنس کی تمام مشینری کو حرکت میں لایا جائے گا اور اس طرح سے ہماری گرفتاری کے لئے حفاظتی افواج سے پوری پوری مدد ملی جائے گی۔ بعد میں ملنے والی اطلاعات سے میری یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ ۹ دسمبر ۱۹۶۸ء کو اڑھائی بجے ہم سرینگر نیل سے باہر تھے اور یہ موقع تھا جب ہم طویل مدت کے بعد سرینگر کی کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ جیل سے ملحق سبزیوں کے کھیت عبور کرنے کے بعد ہم نے کچی دیواریں پھاندتے ہوئے مغرب کی طرف مارچ کیا۔ ہم جلد ہی ہری پر بت کے دائرے میں پہنچ گئے۔ بادام واری کو عبور کرتے ہوئے جیل کو ہم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد جھیل ڈل سے نکلی ہوئی ایک ندی عبور کر کے ہم سرینگر کی ایک مضافاتی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ بستی کے باسی گہری نیند سوئے ہوئے تھے ہم سرینگر کے قصبے سے ملانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ ہماری دائیں جانب کا سلسلہ کوہ جو جھیل کے اس پار کچھ فاصلہ پر تھا رخ متعین کرنے میں ہماری مدد کرتا رہا۔ ہم نے سڑک کو ترک کیا وریب کے باغات کے بیچ سے اپنا سفر جاری رکھا۔ علاقہ چونکا۔ ماہموار تھا۔ کہیں ڈھلوانیں، کہیں گھاٹیاں، کہیں خشک ندی نالے اور کہیں کئی بھٹی سطح زمین تھی۔ چنانچہ ہماری رفتار خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نے ایک ٹیلے پر تھوڑی دیر کے لئے آرام کیا۔ ایک ایک انڈہ اور پراٹھے کا ایک ایک ٹکڑا کھلایا۔ چار بج چکے تھے اور ابھی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق زنان خانے کے گارڈز کی تبدیلی کا وقت ہو گیا تھا۔ ہر دو گھنٹے بعد گارڈ تبدیل ہوتی تھی۔ آنے والے گارڈز نے ہمارے سیل میں نظر ڈالی ہوگی اور ہماری غیر موجودگی کی وجہ سے جیل انتظامیہ میں کھرام مچ چکا ہوگا۔

ہم نے کپڑے تبدیل کیے۔ میرا فرن غلام نبین نے پہنا اور اس نے مجھے اپنا شکاری ٹائپ کورٹ دے دیا۔ جس میں بڑے بڑے بکسوں لگے ہوئے تھے اور جس کے ساتھ ٹوپی بھی منسلک تھی۔ اس کے ساتھ میں نے ایک پتلون نما گرم پاجامہ پہنا۔ کپڑے تبدیل کر کے ہم اس ٹیلے سے

روانہ ہوئے اور طے شدہ سمت میں سفر جاری رکھا۔ تقریباً ۴۵ منٹ بعد ہم تیل بل گاؤں میں پہنچے۔ ہم ایک ندی کے کنارے سفر کر رہے تھے جو ہمیں سیدھا گاؤں کے وسط میں لے گئی۔ وہاں سے ایک معلق پل کے ذریعے ندی کو عبور کیا گیا۔ گاؤں کی مسلمان آبادی سحری کھانے کے لئے بیدار ہو چکی تھی اور کچھ لوگ ہاتھ منہ دھونے کے لئے ندی کے کنارے آنا شروع ہو گئے تھے۔ کشمیر میں عام رواج ہے کہ لوگ وضو کرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھتے ہیں۔ ہم ندی عبور کر چکے تھے اور ندی کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ ہم نے ایک آدمی کو وضو کرتے اور کلمہ شہادت دہراتے ہوئے دیکھا، لہذا ہمیں رکنا پڑا۔ وہ شخص وضو سے فارغ ہو کر ہمارے قریب آیا اور اس نے ہمیں سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ اس نے سادگی سے سوال کیا کہ ہم کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا ہم پیچھے ایک گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور شمال کوٹ جانا چاہتے ہیں، مجھے معلوم تھا کہ شمال کوٹ کا گاؤں اسی راستے پر پہاڑی کے اس طرف واقع ہے۔ بغیر توقف کیے میں نے مزید کہا ہم اس گاؤں میں پہنچ کر آگے کا راستہ بھول گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں گاؤں سے باہر کچی سڑک تک لے چلو گے؟“

وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ ہم تینوں اسکے ساتھ روانہ ہو گئے۔ چند منٹ کے اندر ہی ہم گاؤں کے باہر پہنچ گئے اور شمال کوٹ جانے والے راستے پر گامزن ہو گئے۔ ہمارے رہبر نے کھانے کی پیشکش کی لیکن میں نے جواب دیا کہ ہمیں جلد سے جلد منزل تک پہنچنا ہے۔ ہم نے شمال کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور سلسلہء کوہ کے دامن میں پہنچ کر ہم مغرب کی سمت مڑ گئے۔ اس وقت تک دن چڑھ آیا تھا لیکن انتہائی سرد موسم کی وجہ سے لوگ گھروں میں ابھی تک لٹافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہم نے کچی سڑک پر آگے کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ آٹھ بجے کا وقت ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ اپنے روزمرہ کاموں میں مصروف نظر آنے لگے۔ راہ چلتے لوگوں کی نظر سے بچنے کے لئے ہم نے سڑک کو ایک بار پھر خیر باد کہہ دیا اور پہاڑوں کے دامن میں چلنے لگے۔ چلتے چلتے ہم ایک اور نہر تک پہنچ گئے۔ یہ نہر گاند ریل پن بجلی گھر سے نکالی گئی تھی۔ کچھ دیر تک ہم نے نہر کے

کنارے اپنا سفر جاری رکھا۔ اب پہاڑی سلسلہ ہمارے دائیں ہاتھ پر تھا اور بائیں ہاتھ نیچے کی طرف آبادی تھی۔ نیز سورج بھی خاصا بلند ہو چکا تھا اسلئے مزید آگے بڑھنا خطرات سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ دن کو سفر عارضی طور پر موقوف کر دیا گیا۔ لیکن چھپنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش ہمارے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ ہم نے نہر کا کنارہ چھوڑ دیا اور اپنے دائیں ہاتھ ایک پہاڑی راستے کی طرف چل دیئے جو ہمیں پہاڑ کی چوٹی تک لے گیا۔ یہاں ایک برساتی نالے کے اندر موجود بڑی بڑی چٹانوں کے پیچھے کچھ دیر سستانے کی غرض سے ہم رکے۔ اتنے میں ایک شخص جو شل و صورت سے کچھ معلوم ہوتا تھا ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر چپ چاپ گزر گیا۔ میں نے غلام بیٹین سے کہا کہ اسے واپس بلا کر لاؤ۔ بیٹین تیزی سے گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس شخص نے سلام کیا اور میں نے سلام کا جواب دیا۔ وہ مجھے خاص قسم کے شہری لباس میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے اس کا نام سکونت پوچھی۔ اس نے اپنے نام نیک محمد بتایا۔ اس کا گاہن نزدیک ہی پہاڑی کے دامن میں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ہم کوئی خطرناک لوگ نہیں ہیں۔ ہم شکار کی غرض سے اس طرف آئے ہیں۔ ہم کچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہیں اور کھانے کا کچھ بندوبست بھی۔ اس نے بلا جھٹ اپنی خدمات پیش کر دیں اور ہمیں اپنے گھر لے گیا جو دفر لاگ کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے کچھ دیر آرام کیا، چائے اور پراٹھے بنوائے کھانے کے بعد وہ تقریباً دو گھنٹے تک ہمارے ساتھ گھر میں ہی رہا۔ میں نے نیک محمد کو بتایا کہ ہم پہاڑی کو عبور کر کے دوسری طرف وادی میں جانا چاہتے ہیں۔ اس نے جنگل کی ایک (پگڈنڈی) کی طرف اشارہ کیا جو ہمیں پہاڑ کی دوسری طرف پہنچائے گی۔ اس کی بیوی تھوڑی قندامت پسند واقع ہوئی تھی اور وہ ہمیں رمضان میں کھاتے پیتے دیکھ کر برہمان گئی۔ میں نے محسوس کیا وہ ہم سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ چنانچہ دن کے بارہ بجے ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ نیک محمد جنگل تک کچھ دیر ہمارے ساتھ رہا اور پھر واپس چلا گیا۔ ہم نے ایک پہاڑی کی چڑھائی شروع کی۔ دو سالہ اسیری کے بعد اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوتے ہوئے ہمیں کچھ مشکلات بھی پیش آئیں۔ سورج غروب ہونے تک ہم نے اپنا سفر

جاری رکھا۔ ایک بہت بڑی باہر کی طرف نکلی ہوئی چٹان کے سامنے شب بھری کے لئے پڑاؤ ڈالا گیا۔ شام ہو چکی تھی، ہم نے کچھ لکڑیاں جمع کیں اور آگ جلا کر اسکے گرد بیٹھ گئے۔ آسمان پر بادل گر آئے تھے۔ کچھ دیر بعد بوند اباندی بھی ہونے لگی تھی لیکن ہم بہت تھک چکے تھے لہذا بے سدھ ہو کر سو رہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۸ء کورات کے دو بجے میں نیند سے بیدار ہوا اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ برف کی چھ انچ موٹی تہہ ساری زمین کو ڈھانپ چکی ہے۔ اور ابھی برف باری جاری ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا۔ کچھ دیر ہم نے انتظار کیا پھر چائے بنا کر پینے کے بعد دوبارہ چڑھائی شروع کر دی گئی۔ برف پر سفر کرنے کے لئے ہمارے پاس مناسب سامان موجود نہ تھا۔ برف سے ہمارے پاؤں جلنے لگے اور اوپر چڑھتے ہوئے ہم راستے سے ہٹک گئے۔ چونکہ برف کی چادر نے ہر ایک مقام کو لپیٹ رکھا تھا لہذا ہر جگہ ایک جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ بہر حال دو گھنٹے کی سخت مشقت کے بعد ہم آخری چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ابھی صبح طلوع نہ ہوئی تھی اور شمال کی برفانی ہوائ نے ہمیں منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔ راستے کا کہیں نام نشان بھی نہ تھا۔ اور نہ ہی دور دور تک کسی آبادی یا بستی کے آثار نظر آرہے تھے۔ ہم یہاں کسی صورت میں رک بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس طرح ہمارے پاؤں ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتے (برف سے متاثرہ پاؤں ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جایا کرتے ہیں)۔ بسیار تلاش کے بعد میں نے ایک غار نما جگہ تلاش کی جو دو متصل چٹانوں کے سرے سے مل جانے کی وجہ سے بن گئی تھی۔ اپنے آپ کو بخ بستہ ہواؤں سے بچانے کے لئے ہم اس غار کے اندر چلے گئے۔ غار میں رکنے کے باوجود پاؤں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے ہم ناٹم ضائع کرتے رہے اور صبح ہونے کا انتظار کیا جاتا رہا۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الحال آگے بڑھنا بیکار ہے۔ آگے پیش قدمی کی صورت میں ایک وسیع رقبہ پر پھیلے ہوئے جنگل میں جھک جانے کا ڈر تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس غذا بھی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہم نے واپس نیچے کی طرف وادی میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم تقریباً تین گھنٹے میں اسی جگہ واپس لوٹ آئے جہاں ہم

نے آگ جا کر اپنے جسموں کو حرارت بہم پہنچائی تھی۔ برف باری رک چکی تھی۔ ہم نے اترائی میں سفر جاری رکھا اور دو پہر تک برفانی علاقہ سے نکل آئے۔ نیچے شفاف فضا میں وادی صاف نظر آرہی تھی۔ کچی سڑکیں اور بہتی ہوئی ندیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ نیچے کے میدانوں میں رات کو بارش ہو چکی تھی۔ ہم نے ڈھلوان کی سمت اپنا سفر جاری رکھا اور سہ پہر تک ایک ترائی میں پہنچ گئے جہاں چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا کشمیری گاؤں نظر آ رہا تھا۔ یہ ڈگنی بل تھا۔ میں نے گاؤں کے کنارے ایک الگ تھلگ مکان کو منتخب کیا اور اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا کہ آج ہماری منزل یہی ہوگی۔ یہ ایک منزلہ گھر تھا جس کی مٹی کی چھت صاحب خانہ کی غربت کی غمازی کر رہی تھی۔ ہم جھاڑیوں میں چھپ کر افطار کے وقت کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ شام ہوئی اور گاؤں کے لوگ روزہ افطار کرنے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ہم نیچے اترے اور غریب دہقان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک شخص نے دروازہ کھولا اور ہم سے ہماری آمد کا مقصد پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم بہت دور سے پیدل چلے آ رہے ہیں اور ابھی ابھی پہاڑ عبور کر کے اس کی طرف آئے ہیں۔ ہم لوگ بارش اور برف باری میں مسلسل سفر کی وجہ سے بہت تھک گئے ہیں کچھ دیر اس کے گھر میں آرام کرنا چاہتے ہیں۔ غریب دیہاتی ہمیں اپنی حیثیت کے لوگ سمجھ کر آتش دان کے قریب لے گیا۔ جب میں نے اس سے یہ بتایا کہ ہم شکاری ہیں تو اس نے ہمیں بغیر دودھ کے نمکین کشمیری چائے پیش کی۔ ہم آرام سے بیٹھ گئے اور گپ شپ شروع کی۔ اتفاق سے ہمارا میزبان چرواہا نکلا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کل صبح سحری کے وقت اس نے اپنے پیر صاحب کو خواب میں دیکھا تھا۔ پیر صاحب نے اسے ہدایت کی کہ دیکھو آج تمہارے گھر میں کچھ مہمان آ رہے ہیں ان کا خاص خیال رکھنا۔ بوڑھے چرواہے نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ گرم پانی سے ہمارے پاؤں دھلوائے۔ (کشمیر میں گرم پانی سے مہمان کے پاؤں دھلوانا بہت بڑی عزت خیال کی جاتی ہے اس طرح سفر کی ساری تھکان دور ہو جاتی ہے)۔ اس نے گرمیوں میں خشک کی ہوئی ساگ کی ترکاری اور چاول ہمیں کھانے کے لئے دی۔ رات کو میرا احمد اور غلام نبین گہری نیند سو گئے۔ لیکن میں اپنے

میزبان بوڑھے چرواہے سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ بیچارہ مجھے اپنی پریشانیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ تقریباً رات کے دو بجے ہم جاگ گئے۔ ہاتھ منہ دھویا، بوڑھے میزبان کے ساتھ سحری کھائی اور نماز ادا کی۔ مجھے اب اپنے اس عمر رسیدہ محسن کا نام یاد نہیں رہا۔ اتنا یاد ہے کہ وہ گاؤں قصبہ آلس ٹینگ سے شمال مشرق کی جانب چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سرینگر شہر کے لئے پینے کا پانی سپلائی ہوتا ہے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ہم تاریکی کے پردے میں، غریب چرواہے کی کتیا سے روانہ ہوئے۔ وہ ہمیں اس راستے تک لے آیا جو سرینگر سے گاندربل جانے والی سڑک تک جاتا تھا۔ ہم نے جنوب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور گاندربل سے نکلنے والی اپر لیول کینال تک پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم دائیں ہاتھ مڑے اور نہر کے کنارے کنارے گاندربل پاور ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ ہمارے دائیں ہاتھ سلسلہ کوہ تھا اور نیچے دور گہرائی میں غریب کسانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ ہمارے بائیں جانب مٹی کے کھیت تھے جو ان دنوں بالکل خشک تھے۔ اس کے علاوہ سیب کے باغات تھے۔ ہم نے پوچھنے تک سفر جاری رکھا۔ اب ہم جس علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے اس علاقے میں سخت سرکاری حفاظتی اقدامات وسیع پیمانے پر ہونے کا احتمال تھا۔ گاندربل کا قصبہ پاور اسٹیشن ہونے کے علاوہ علاقے کی انتظامیہ کامرکز بھی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے فرار کے بعد اس علاقے میں سخت اقدامات کیے گئے ہوں گے۔ اس سے ہماری خوش قسمتی سمجھئے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی اور سارے علاقے کو کہر کی گہری تہ نے اس طرح چھپالیا کہ پچاس گز سے زیادہ آگے دیکھنا محال ہو گیا۔ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک فیصلہ کن امداد تھی۔ ہم نے بارش اور کہر کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد سیبوں کے ایک باغ کے اندر چلے گئے۔ باغ کے چوکیدار کی جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ ہم ایک کھڑکی سے اندر داخل ہوئے۔ اندر بڑی تعداد میں سیبوں کی خالی پیٹیاں موجود تھیں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم گاندربل کی طرف سفر دوبارہ شروع کیا۔ اسکے تھوڑی ہی دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ تقریباً دوپہر کے وقت ہم

گاندربل کے مضافات میں ملٹی باغ پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے کچھ دیر قیام کیا۔ یہاں سیدھا آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمارے سامنے دو متبادل راستے تھے۔ ایک یہ کہ ہم پہاڑ پر چڑھائی شروع کرتے لیکن موسم خراب ہونے کی وجہ سے یہ بہت خطرناک تھا۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس راشن ختم ہو گیا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہم کوئی پناہ گاہ تلاش کرتے جہاں رات کو روپوش رہا جاسکے۔ اگر ممکن ہو تو اس علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں تاکہ اس پر خطر علاقے کو رات کی تاریکی میں پار کر سکیں۔ میں نے دوسرے متبادل کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری بائیں طرف کے فاصلے پر ایک باغ تھا جس میں ایک تین منزلہ مکان تھا۔ یہ جگہ گاؤں سے ۵ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے اس مکان کو چھپنے کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں بائیں جانب خشک مالے کی گہرائی میں اترتے ہوئے پہنچا۔ اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد مالے کو چھوڑ کر ایک اونچی ڈھلوان پر چڑھ آئے اور باغ میں داخل ہو گئے۔ ساتھیوں کو رک جانے کا اشارہ کیا اور خود مکان کے آگن میں پہنچ کر ان کو آواز دی۔ چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا ایک ساٹھ سالہ بوڑھا سامنے آیا اور کچھ پوچھے بغیر ہی بول اٹھا۔ ”یہ ہمارا رہائشی مکان نہیں ہے۔ ہم وہاں نیچے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہاں چلے جاؤ تمہیں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔“ بوڑھے آدمی نے مجھے کوئی پیشہ ورگد اگر سمجھا تھا جو یہاں علاقوں میں عام ہوتے ہیں اور ”مسافر“ کہلاتے ہیں۔ یہ مسافر خاص طور پر خزاں کے موسم میں گاؤں گاؤں جاتے ہیں اور صوفی شعراء کا کام سنا کر خیرات طلب کرتے ہیں۔ یہ خیرات عام طور پر نفقہ کے بجائے جنس کی صورت میں ہوتی ہے۔ یقیناً اب ایک پیشے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جس سے ایک خاص قسم کا تقدس وابستہ ہو گیا ہے۔ جو عام بھکاریوں کے بارے میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ کشمیر میں ایسے افراد کو بھی مسافر کے نام سے پکارا جاتا ہے جو دوران سفر موسم کی خرابی، راستوں کی عدم واقفیت یا کسی اور ناگہانی صورتحال سے دوچار ہو جانے کی وجہ سے راستہ بھٹک چکے ہوں۔ ایسے گم کردارہ افراد کی خوردنوش سے مدد کرنا اور انہیں پناہ دینا کشمیر کی لوک ریت ہے اور تہذیب کا ایک خاصہ

ہے۔ میں نے باواز بلند اس بوڑھے آدمی کو جواب دیا کہ ہم مسافر نہیں ہیں۔ اور ہمیں خیرات نہیں چاہیے۔ آپ ذرا نیچے آئیں آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ مجھے ٹالنا چاہتا ہے۔ یہ محسوس کر کے میں نے دوبارہ کہا ”آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ جلدی آئیے بہت ضروری معاملہ ہے“ کچھ پس و پیش کے بعد وہ بوڑھا (بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام احمد راتھر ہے) لوٹی لیٹے دروازہ کھولنے کے لئے نیچے آیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو زور دیکر آنے کا اشارہ کیا۔ بابا دروازے میں ہی کھڑے کھڑے بات کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا کہ ہمیں کمرے میں لے چلو، اطمینان سے بات کریں گے۔ وہ ہمیں کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک عمر رسیدہ عورت چرخہ کات رہی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ ہم لوگ دھان کی گھاس سے بنی ہوئی چٹائی (جسے کشمیری زبان میں ”پت جی“ کہتے ہیں) پر بیٹھ گئے۔ میں کھسک کر بوڑھے کے قریب چلا گیا۔ اور بات شروع کی کہ ہم شکار کے سلسلے میں ادھر پہاڑ پر آئے تھے۔ ہم نے آج صبح ہی پہاڑ کو واپسی پر عبور کیا ہے اور اب سرینگر جانا چاہتے ہیں۔ ہم بارش کے تھمنے تک تمہارے گھر میں آرام کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی دیر میں ہمارے کپڑے بھی سوکھ جائیں گے۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ ہمیں صرف کانگریاں دے دو اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔

بابا نے ایک نوجوان لڑکی سے جو قریب ہی کھڑی تھی، کانگریاں لانے کو کہا۔ لڑکی تھوڑی دیر میں کانگریاں لے کر آگئی۔ بوڑھے آدمی کو ہمارے بارے میں کچھ تجسس ہو گیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم لوگ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں ریڈیو سربینگر میں کاروبار کرتا ہوں اور میری رہائش راج باغ سربینگر کی آفیسر کالونی میں ہے۔ (راج باغ سربینگر کی ایک مضافاتی اور جدید بستی ہے)۔ میں نے بوڑھے کو بتایا کہ میرے دونوں ساتھی میرے ملازم ہیں۔ بوڑھا بظاہر مطمئن نظر آنے لگا لیکن تھوڑی دیر میں کہنے لگا۔ ”گاؤں میں ہمارا زمین کی ملکیت کے بارے میں مقدمہ چل رہا ہے جو کہ سربینگر کی عدالت میں ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں۔“ ”کیوں نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”یہ کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں شہر کے تقریباً سارے ہی مجسٹریٹ میرے دوست ہیں۔ تم مجھے مقدمے کی نوعیت اور مجسٹریٹ کا نام بتاؤ میں تمہاری مدد کروں گا“

بابا بہت خوش ہوا اور کہنے لگا ”میں ابھی حبیب کو بلاتا ہوں وہ آپکو سب کچھ بتا دے گا“
 حبیب راتھر اس کے بیٹے کا نام تھا اور وہی مقدمے کی پیروی بھی کر رہا تھا۔ بوڑھے نے پوچھا کہ کیا ہم روزے سے ہیں۔ میں نے جواب دیا ”ہم سفر میں تھے اس لئے روزہ نہیں رکھا“ بوڑھے نے پوچھا ”آپ ٹیوٹھ (بغیر دودھ چائے) پینا پسند کریں گے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 بوڑھے نے لڑکی سے کہا کہ سارا میں ٹیوٹھ (نمکین تھوہ) گرم کرے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے گرم گرم ٹیوٹھ کے پیالے پئے۔ درائیں اثنا بارش تھم چکی تھی، میں نے بوڑھے سے پوچھا کہ گاند ریل سے سرینگر جانے والی بسوں کے اوقات کیا ہیں۔ بابا نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا کہ ٹرانسپورٹ کا یہاں کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمیں کسی بھی وقت گاڑی مل سکتی ہے۔ لیکن اس نے خواہش ظاہر کی کہ ہم اس کے بیٹے کی آمد تک انتظار کریں تاکہ ہمیں ان کے مقدمے کی تفصیلات معلوم ہو سکیں۔ میں نے اسکے بیٹے کی واپسی تک رک جانے کی حامی بھر لی اور وقت گزاری کے لئے اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے بسوں کی آمد و رفت کے بارے میں سوال کیا۔ اگرچہ بوڑھا ہم سے کچھ مانوس ہو چکا تھا لیکن پھر بھی کچھ محتاط لہجے میں کہنے لگا۔ سرینگر کا سفر ان دنوں مصیبت بن گیا ہے۔ فوج اور سی۔ آر۔ پی والوں نے جگہ جگہ چوکیاں قائم کر رکھیں ہیں۔ ہر آنے جانے والے کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ برقع پوش خواتین کو بھی بخشا نہیں جاتا۔ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا ”ابھی ایک ہفتہ پہلے ہم ادھر آئے تھے تو کوئی چیکنگ نہ تھی، اب یہ لوگ عوام کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟“

میرے سوال پر بابا نے حیران ہو کر پوچھا ”کیا تمہیں معلوم نہیں“ سری نگر جیل سے مجاہد بھاگ نکلے ہیں۔“ ہمیں دراصل سرینگر سے نکلے ایک ہفتہ ہو گیا ہے“ میں نے حیرانی اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ان مجاہدین کے بارے میں بوڑھے سے سوالات پوچھے۔ بوڑھا سنجیدگی سے بولا ”یہ مجاہد

بہت عرصے سے جیل میں قید تھے اور ان میں سے کچھ کو موت کی سزا ہو چکی تھی، انہوں نے جیل میں سرنگ نکالی اور بھاگ گئے۔ میرا بیٹا حبیب راتھر کل ہی سرینگر سے ہو کر آیا ہے، وہی یہ خبر لایا ہے۔ فوجیوں کے علاوہ سی۔ آئی۔ ڈی والے بھی ان کی تلاش میں ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔“

”بڑی عجیب بات ہے میں نے جواب دیا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو وہ بہادر لوگ بڑے قابل تعریف ہیں۔“ اس کے بعد ہم ۱۹۶۵ء کے مجاہدوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے یوں ظاہر کیا کہ ۱۹۶۵ء کے مجاہدوں کی میں نے بڑی مدد کی تھی۔ بوڑھا بہت متاثر ہوا۔ میں نے کہا ”سنا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں اس علاقے میں کچھ مجاہد (کمانڈو) کاروائیاں کرتے رہے ہیں (حقیقت بھی یہی تھی)۔ بابا نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا ہاں سنا ہے کچھ مجاہد اس علاقے میں بھی کاروائیاں کرتے رہے اور کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے خود ان کو دیکھا ہے۔ لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ کاش میں نے ان میں سے کسی کا دیدار کیا ہوتا۔“ میں نے موضوع تبدیل کیا اور بوڑھے سے اس کی زندگی کے متعلق سوال کرنے لگا۔ بوڑھا متوسط طبقے کا ایک کسان تھا اور اپنی جوانی کے دنوں میں پیشہ ورم رکبان تھا۔ کشمیری زبان میں مرکبان ایسے اشخاص کو کہا جاتا ہے جنہوں نے باربرداری کے لئے گھوڑے اور چنچر پالے ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے وہ دیہاتی علاقوں میں لوگوں کا سامان ادھر ادھر پہنچاتے ہیں۔ بوڑھا مجھے سرینگر سے گریز، استور، پونچی اور گلگت تک اپنی باربرداری کی مہمات کی کہانیاں سنا تا رہا۔ اس نے بڑے تاسف سے کہا کہ یہ سب گزرے دنوں کی باتیں ہیں۔ اب تو باؤنڈری لائن (سیرفائر لائن) نے ہمارے ملک کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ اب نہ ہم ادھر سے ادھر جاسکتے ہیں اور نہ وہ ادھر سے ادھر آسکتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کی گفتگو میں میں نے بوڑھے شخص کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں علیحدگی میں اس سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ بابا رضا مندد ہو گیا۔ میں اس کو مکان کی تیسری منزل میں ایک کمرے میں لے گیا۔ ہم ایک

چٹائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے دریافت کیا ”کیا آپ با وضو ہیں؟“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے جیب سے بیس سو روٹلا اور اسے کھولا۔ اس نے پہچان لیا کہ قرآن شریف ہے۔ اگرچہ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اسکے بعد میں نے کہا بابا قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ میں جو کچھ کہوں گا کسی پر ظاہر نہیں کرو گے۔ بوڑھے نے بلا حیل و حجت قسم کھائی۔ میں نے بوڑھے کو بتایا کہ جیل سے فرار ہونے والے مجاہد ہم ہی ہیں۔ یہ سنتے ہی اسکے چہرے پر اچانک چمک آئی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے رخسار سرخ ہو گئے ہیں۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کے چہرے پر کیسے تاثرات دیکھے۔ اس کے وجود میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ خوشی سے اس کے آنسو چمک پڑے۔ اس نے میرے ہاتھوں کو چوما اور مجھے گلے لگا لیا۔ اب ہم اس کے انتہائی معزز مہمان تھے۔ اس نے کھڑے ہو کر مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا اور تقریباً دوڑتا ہوا نیچے جا پہنچا۔ نیچے والی منزل میں پہنچ کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ چٹائی بچھائی، لہاری سے صاف ستھرے نئے بستر نکال کر اس پر بچھائے اور مجھے کہنے لگا اپنے ساتھیوں کو اس کمرے میں لے آؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بوڑھا بڑا پڑ جوش تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے بات کی۔ فوراً ایک مرغ ذبح کر کے ہماری دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ بغیر دودھ، نمک والی چائے کے بجائے ساوا میں تہوہ تیار ہونے لگا۔ بوڑھی خاتون بہت مسرور تھی۔ لڑکی کو گاؤں بھیج دیا گیا تاکہ وہ بابا کے بڑے بیٹے حبیب کو بلائے۔ حبیب آیا اور اسکا مجھ سے تعارف کر لیا گیا۔ حبیب کو بھیج کر نیچے سے کھانا اوپر ہی کو منگوایا گیا۔ بابا نے حبیب کو تاکید کی کہ کوئی اور اوپر نہ آنے پائے۔ اس رات کا کھانا بوڑھی خاتون نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا۔ مجاہدوں کے لئے کھانا تیار کرتے ہوئے اسے بڑا فخر محسوس ہوا۔ رات کے کھانے پر صرف حبیب اور اسکے چھوٹے بھائی کو ساتھ بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ عورتوں کو اس طرف آنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ کچھ دیر قبل کے اجنبی مسافر چشم زدن میں اہم ترین شخصیات کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ہمیں آرام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی گئی۔ شام کو انتہائی پر تکلف کھانا کھلایا گیا۔ وقفے وقفے سے چائے اور تہوہ پیش کیا جاتا رہا۔ بابا اور اسکے دونوں بیٹے دیر تک ہم سے گپ شپ

کرتے رہے۔ آخر میں، میں نے انہیں کہا کہ آج رات کسی وقت ہمیں اپنی کسی نئی منزل کی طرف روانہ ہونا چاہئے۔ حبیب نے پیشکش کی کہ وہ اس غیر محفوظ علاقے سے پار کسی بھی مقام تک ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہے۔ اس کے بعد ہم آرام کی نیند سو گئے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو رات کے تقریباً ایک بجے ہماری آنکھ کھلی۔ بوڑھا بابا پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بستر سے اٹھایا۔ ہمارے لئے تازہ کھانا تیار کیا گیا۔ بابا ہمارے لئے کچھ سیب لے کر آیا ایک ترکھ چاول (ترکھ تقریباً چھ سیر کا ہوتا ہے) اور کچھ کچی روٹیاں ساتھ لے جانے کے لئے ہمیں دی گئیں۔ ہم نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ تحائف قبول کر لئے۔ چاند کی مدہم روشنی میں ہم اس گھر سے روانہ ہوئے۔ بابا نے بو جھل دل کے ساتھ ہمیں الوداع کہا اور دعائیں دیں۔ حبیب بطور رہبر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ اس کی مدد سے ہم سیکورٹی کے گھیرے کو نہایت آسانی سے عبور کرتے رہے۔ سڑک پار کرنے کے بعد ہم پل سے شمال کی جانب کافی دور نکل گئے۔ اندازاً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد حبیب ہمیں ایک ایسے راستے پر ڈل دیا جو ہماری تجویز کردہ اگلی منزل تک جاتا تھا۔ شفیق بابا کے گھر سے روانگی سے قبل محاذ رائے شماری کے ایک لیڈر شیخ نذیر (جو کہ شیخ عبد اللہ کے بھتیجے ہیں) کے نام ایک خط لکھ چھوڑا تھا جس میں جیل سے فرار میں اپنی کامیابی اور اب تک کے سفر بخیر کی روداد بیان کی گئی تھی۔ خط کے آخر میں میں نے یہ گزارش بھی کی کہ وہ حبیب راتھر کی سرینگر والے زمین کے مقدمے میں حتی الامکان اسکی مدد کریں۔ شیخ نذیر احمد سے میری ملاقات ایک ساتھی کے ذریعے سرینگر جیل میں ہوئی تھی۔ جہاں اتفاق سے وہ بھی ان دنوں محبوس تھے۔ سندھ مانے کو عبور کرنے کے بعد ہمارا رخ شمال مشرق میں ایک گھنے جنگل کی طرف تھا۔ تاہم ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم دور نہر تک پہنچ گئے۔ یہ ہمارے لئے ایک ٹھہری امداد ثابت ہوئی۔ ہم نے اپنی سمت تبدیل کی اور نہر کے کنارے کنارے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک گاؤں میں پہنچے جس کا نام اب یاڈنہیں رہا۔ نہر گاؤں کے پتوں گزر کر اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ گاؤں کے وسط میں نہر کے قریب ہی ہمیں ایک مسجد نظر آئی۔ ہم آگے بڑھے اور مسجد کے حمام

میں داخل ہو گئے (کشمیر میں عام طور پر مسجدوں کے ساتھ گرم حمام کا انتظام ہوتا ہے) ہم نے حمام میں غسل کیا اور نفل ادا کئے۔ اس دوران گاؤں کے لوگ مسجد میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور وہاں سے چل دیئے۔ جنگلات کے سلسلے کو دائیں ہاتھ رکھتے ہوئے ہم نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ہم ایک ”رکھ“ میں (جنگلی جانوروں کے لئے محفوظ علاقہ) پہنچ گئے جو موضع بارسو کے قرب وجوار میں تھی۔ رکھ کے بیچ میں سے گزر کر ہم ایک مقام سرینگر بانڈی پورہ روڈ پر پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے سیدھے بانڈی پورہ کی طرف پیش قدمی کی۔ اور سنبل گاندربل روڈ اور بانڈی پورہ روڈ کے سنگم پر آ گئے۔ ہم سنبل روڈ پر چل پڑے۔ پوٹھنہ لگی تھی، کچھ فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد ہم بارسو گاؤں میں پہنچ گئے۔ گاؤں کے آخری سرے پر ایک بنگلی گلی سے ایک شخص نمودار ہوا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے سلام کیا، میں نے سلام کا جواب دیا۔ وہ سحری کے بعد مسجد کی طرف نماز فجر کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں قمر بنی علاقے کا فارسٹر ہوں اور ہم سنبل جا رہے ہیں۔ سنبل اس علاقے کی تحصیل کا صدر مقام ہے۔ کشمیر میں دیہاتی لوگوں کے لئے محکمہ مال اور محکمہ جنگلات سے تعلق رکھنے والے ملازم ایک کمزوری کی حیثیت رکھتے ہیں اور لوگ ان سے خواہ مخواہ تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے ملاقاتی کا نام محمد آخون تھا۔ اس نے نیا نیا مکان بنایا تھا اور اس سے تجارتی لکڑی کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے پیشکش کی کہ ہم اس کے گھر جا کر چائے پیئیں اور کچھ دیر آرام کریں۔ چونکہ دن چڑھنے ہی والا تھا اور ہمیں یوں بھی کسی پناہ گاہ کی ضرورت تھی اس لئے ہم نے بلا حیل و حجت محمد آخون کی پیشکش قبول کر لی۔

وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ گلی میں چند قدم چلنے کے بعد ہی ہم اپنے میزبان کے تعمیر مکان میں پہنچ گئے۔ چونکہ تعمیر مکمل نہ ہوئی تھی اس لئے وہ ابھی اس میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ محمد آخون کا پرانا رہائشی مکان چند سوگڑ کے فاصلے پر موجود تھا۔ آخون نے ہمیں اپنا گھر دکھایا، میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اسی میں ٹھہرنا چاہئے۔ یہاں سارا گاؤں اور سڑک صاف نظر آتی تھی۔ وہ ہمیں

دوسری منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر آخون اپنے گھر چلا گیا تقریباً نصف گھنٹہ بعد نکلیں چائے سے بھر اہوا ساوار اور چاول کے آٹے کی روٹیاں لے کر واپس آیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ اپنا سامان وغیرہ نہ کھولیں اور چلنے کے لئے تیار رہیں۔ ہم نے اپنے جوتے نہیں اتارے۔ اگرچہ یہ یہاں کے رواج کے مطابق بہت مازیا حرکت تھی، میں خود کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا تاکہ باہر نظر رکھ سکوں۔ جب آخون واپس آیا تو ہمارے اس رویے پر کچھ متعجب ہوا لیکن اس نے اظہار نہیں کیا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے اپنے جوتے نہیں کھولے۔ آخر آخون سے رہانہ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں آرام سے کیوں نہیں بیٹھ جاتا۔ جوتے کیوں نہیں اتارتا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ہم سے غیر ضروری بات نہ کرے کیونکہ ہم تھوڑی سی دیر میں یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ آخون نے اس بات کو کچھ محسوس کیا اور کہا ”میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا بلکہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ میرے گھر مہمان ہیں، آرام سے بیٹھیں، ورنہ جیسے آپ کی مرضی“۔ میں نے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ سامان کھول دیں اور جوتے اتار کر آرام سے لیٹ جائیں۔ میں نے جوتے اتارتے ہوئے آخون سے مخاطب ہوا ”اگر تمہیں ہماری خدمت کا اتنا شوق ہے تو ہمیں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہئے اور تمہاری خوشنودیش کا احترام کرنا چاہئے۔“

آخون بڑا خوش ہوا اور ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا۔ اس کے خاندان میں اس کی بیوی کے علاوہ اسکی ایک جوان بیٹی تھی، جسکی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ مکان کی تعمیر کے لئے اسے کچھ لکڑی لا دوں گا۔ اب دن نکل آیا تھا۔ میں نے آخون سے کہا تھا کہ ہم گاؤں میں کسی بس کا انتظار کریں گے اور یہاں سے سنبھل تک بس میں جائیں گے۔ میری نظر ایک سلائی مشین پر پڑی۔ پتہ چلا آخون فالتو وقت میں درزی کا کام کرتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک کاشٹکار تھا۔ میں نے اس سے سلائی مشین اور قینچی طلب کی۔ قینچی سے میں نے اپنے جیل کے ایک کمرے سے دستاوردانا اور مشین پر اس کی سلائی

کر ڈالی۔ آخون سے دوران گفتگو میں نے معلومات حاصل کیں۔ گاندریل کے بابا احمد راتھر سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، محمد آخون سے اس کے علاوہ علاقے میں موجود سیکورٹی کی چوکیوں اور گشتی دستوں کے بارے میں بھی پتہ چلا۔ وہ سب اس علاقے میں مغرور مجاہدوں کی تلاش کے لئے پھیلے ہوئے تھے، ہر طرف انہی کا چہ چا تھا۔ میں نے محمد آخون کا رویہ ہمدردانہ پایا اور مجاہدوں کے بارے میں اس کے جذبات کا اندازہ کر لیا۔ پھر میں نے اپنے مخصوص طریقہ کے مطابق قرآن شریف پر اس سے حلف لیا اور اس پر اصل حقیقت کھول دی۔ محمد آخون کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ گھر جا کر ہمارے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب چونکہ اس پر ہماری اصل حقیقت آشکار ہو چکی ہے اس لئے وہ اس گھر سے باہر نہیں جاسکتا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ ہمارا اصول ہے اور اس بات پر اسے مارنٹ نہیں ہونا چاہئے۔ تم نے جو چاہئے پلائی ہے وہی کافی ہے۔ آخون مطمئن تھا اور سارا دن ہمارے ساتھ رکا رہا۔

اس کا نوجوان داماد صبح ہم سے ملنے آیا۔ آخون نے اسے گھر جا کر ہمارے لئے کھانا وغیرہ پکوانے کے لئے کہا۔ اس نے اپنے داماد کو یہ بھی بتایا کہ وہ سارا دن مہمانوں کے ساتھ ہی رہے گا۔ اس لئے وہ گھر کا خیال رکھے۔ دن بھر ہم اس سے گپ شپ کرتے رہے اور باری باری آرام کرتے رہے۔ آخون نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں کم سے کم اس کی بیٹی کو جو اس کی اکلوتی اولاد ہے، اپنا یعنی مجاہدوں کا دیدار کرنے کی اجازت دوں۔ پہلے میں ناتواں لیکن جب اس نے زور دیا تو مجھے ماننا پڑا۔ چنانچہ طے یہ ہوا کہ اضار کے وقت وہ کھانا لیکر آئے گی اور ہمیں دیکھے گی۔ میری فرمائش پر آخون اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ سنبل تک ہماری رہنمائی کیلئے ہمارے ساتھ کوئی گائیڈ بھیجے گا۔ مجوزہ گائیڈ ایک ۲۵ سالہ نوجوان تھا جو آخون کا بااعتماد رشتہ دار تھا اور گاؤں میں دکانداری کرتا تھا۔ اضاری سے کچھ دیر قبل آخون مجھ سے اجازت لیکر چلا گیا اور چند منٹ کے بعد ہی وہ اپنے داماد اور بیٹی کے ہمراہ کھانے کے لوازمات اٹھائے واپس آ گیا۔ ہم نے کھانا کھا کر

انہیں رخصت کیا۔ دونوں میاں بیوی ہمیں دیکھ کر انتہائی مسرور ہو رہے تھے۔ وہ اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے ہمارے لئے کچھ فروٹ بھی لے کر آئے تھے۔ شام کے وقت آخون گائیڈ کو لیکر آگیا۔ گائیڈ ہم سب سے بغل گیر ہوا۔ اسے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ وہ ہمارے کسی کام آ رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ سبز چائے، کھانڈ، سگریٹ اور کچھ لایا تھا تاکہ سفر میں ہمارے کام آسکیں۔ شام کے سات بجے رات کی تاریکی میں ہم آخون کے گھر سے گائیڈ کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ آخون نے گائیڈ کو راستے کے بارے میں کچھ ہدایات بھی دیں۔ ہم سبل کی طرف جانے والی سڑک پر کچھ دیر چلتے رہے۔ پھر سڑک چھوڑ کر کئی اور وہاں کے کھیتوں میں چلنا شروع کر دیا گیا، تاریکی کے باوجود ہم بجلی کے تمقوں کی وجہ سے گاؤں کی پہچان کر سکتے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد میں نے اپنے گائیڈ کو واپس بھیج دیا۔ اس نے سبل تک ہمارا ساتھ دینے پر اصرار کیا لیکن چونکہ سبل قصبہ صاف نظر آ رہا تھا اسی لئے اس کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں رات کو دیر تک گھر سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اس کے گھر والوں کو پریشانی بھی ہوتی۔ چنانچہ بادل ما خواستہ وہ واپس لوٹا۔ چند منٹ بعد ہم نے اپنی سمت تبدیل کی۔ دراصل ہمارا سبل جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہاں سے ہم نے مغربی سمت ہرینگر بانڈی پورہ روڈ کے متوازی کھیتوں کے پتوں سے پیش قدمی شروع کی۔ ہم گھنٹوں چلتے رہے اور مختلف دیہات کی روشنیوں سے اس بات کا اندازہ کرتے رہے کہ ہم سبل سے کافی دور نکل چکے ہیں۔ بغیر رکے نصف شب تک چلنے کے بعد ہم مافس بل جھیل کے قریب پہنچے۔ دراصل یہ علاقہ دلدلوں اور چھوٹی چھوٹی جھیلوں پر مشتمل ہے۔ اور مرغایوں کے شکاریوں کے لئے جنت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم جھیل کے پشتوں میں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈتے رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی، ہماری بائیں جانب ایک خاصا بڑا گاؤں نظر آ رہا تھا جیسا کہ دور تک پھیلی ہوئی روشنیوں سے اندازہ ہوتا تھا۔

جب ہم جھیل عبور کرنے میں ناکام رہے تو ہم نے گاؤں کے اندر جا کر کوئی رہبر تلاش کرنے

کافیصلہ کیا۔ چنانچہ ہم نے آبادی سے الگ تھلگ دو گھروں کا انتخاب کر لیا، لیکن بد قسمتی سے دونوں گھر غیر آباد تھے۔ کچھ دیر رک کر ہم سوچتے رہے کہ کیا کیا جائے۔ اس دوران اچانک برقی روٹیل ہو جانے سے سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ گاؤں کے اندر جا کر کوئی گائیڈ تلاش کیا جائے۔ ہم احتیاط سے گاؤں میں داخل ہو گئے اور کتوں سے بچتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ کسی گھر میں آواز دینا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اس طرح سارے محلے میں شور مچ جانے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں تاکہ پتہ چل سکے کہ کس گھر کے لوگ جاگ رہے ہیں۔ ہم ابھی پہلی گلی میں جا رہے تھے کہ ہم نے ایک کھمار کی دھڑکی منزل میں سے کسی کی کھانسی کی آواز سنی (کھمار کچی لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا گدram ہوتا ہے جس میں کسان سال بھر کا نلہ جمع رکھتے ہیں۔ بعض خوشحال کسان کھمار کے اوپر مہمانوں کے استعمال کے لئے ایک کمرہ بھی بنا لیتے ہیں۔ کھمار رہائشی مکان کے قریب ہی بنایا جاتا ہے اور دونوں کا آنگن ایک ہی ہوتا ہے) میں نے ساتھیوں کو روکنے کا اشارہ کیا اور چھڑی سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ پہلی بار کوئی جواب نہ ملا لیکن دوبارہ کھٹکھٹانے پر اندر سے آواز آئی ”کون ہو؟ اور اس وقت رات گئے کیا چاہتے ہو؟“ شاید وہ ہمیں غیر پسندیدہ لوگ سمجھ رہا تھا۔ میں نے جیسی آواز میں جواب دیا۔ بھلے آدمی ہم کوئی غیر نہیں ذرا کھڑکی کھولو اور ہماری بات سنو۔ اس نے کھڑکی کھولی اور پوچھا کیا چاہیے۔ میں نے جواب میں نہایت نرمی سے کہا کہ ہم مسافر ہیں، سبل سے آئے ہیں اور آگے ایک گاؤں میں جانا ہے، تھکے ہوئے ہیں، کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور بولا ”وہ گاؤں کی مسجد ہے جاؤ اور جتنی دیر چاہو آرام کر لو“۔ میں نے کہا ”دوست بات یہ ہے کہ ہم مسجد میں جا کر آرام نہیں کر سکتے اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہم اتنی رات گئے تمہیں تکلیف نہیں دیتے۔ اس لئے تم نیچے آ کر ہم سے مل لویا ہمیں اوپر آ کر بات کرنے دو“۔ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے صحن کی ڈیوڑھی اور کھمار کی سیرھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ ہم صحن میں داخل

ہو گئے اور وہاں سے لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر کھمار کے اوپر پہنچ گئے۔ نوجوان نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر بلا لیا۔ اس نے لیمپ روشن کر کے ہمیں غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر اچانک مسرت کی چمک پیدا ہوئی اور بولا ”اچھا تو یہ آپ لوگ ہیں مجھے آپ کے آنے کی بہت خوشی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں اب یہ بات آئی ہے کہ آپ مسجد میں کیوں نہیں جانا چاہتے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ ہی وہ مجاہد ہیں جو نیل سے بھاگے ہیں۔“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”ہم تمہاری خوش خلقی کے بہت شکر گزار ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی جاتی لیکن ہم ایک ایسی مشکل میں پھنس گئے ہیں جو تمہاری مدد کے بغیر حل نہیں ہو سکتی۔ ہم جھیل کے اس پار جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو؟“ اس نے جواب دیا ”کیوں نہیں یہ تو بڑی معمولی بات ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لئے اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ پُر جوش تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”جناب ہم مجاہدوں کے لئے کوئی بھی قربانی دینے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن آپ ذرا آرام تو کریں۔“

نوجوان کے کہنے پر ہم بیٹھ گئے۔ اس نے روشنی گل کردی، لیکن ہم سے گفتگو جاری رکھی۔ وہ مجاہدوں اور ان کی تحریک کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ اس نے ہمیں چھوٹے بھائی کے متعلق بتایا جو کسی کالج میں زیر تعلیم تھا اور جسے ہم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تیار ہو جائے کیونکہ وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے۔ لیکن وہ نہ مانا اور کہنے لگا ”میں آپ کو ایسے کس طرح جانے دوں۔ آپ کتھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ سحری قریب ہے آپ سحری میرے ساتھ کھائیں گے۔ پھر میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اٹھا اور ہمیں رہائشی مکان میں لے گیا۔ وہاں اس نے ہمارا تعارف اپنے بھائی سے کروایا۔ اس کا بھائی ہم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہم نے گرم پانی سے ہاتھ منہ دھویا، سحری میں ہمیں ٹھنڈے چاول اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا سالن کھلایا گیا۔ (چھوٹی مچھلیوں کو کشمیری زبان میں گزن کہا جاتا ہے) سحری کے بعد ہم نے سرینگر ریڈیو سے سحری کا پروگرام بھی سنا۔ اس کے بعد وہ

دونوں بھائی ہمارے ساتھ چل پڑے اور ہمیں جھیل کے اس پار پہنچا دیا۔ وہ ہمارے ساتھ سبیل
 بانڈی پورہ روڈ تک آئے۔ میں نے ان سے کہا ”یہاں سے ہم بانڈی پورہ چلے جائیں گے۔“ وہ
 اس سے آگے تک ہمارا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن میرے اصرار پر واپس مڑ گئے۔ مجھے ان دونوں
 بھائیوں کے نام یاد نہیں رہے لیکن وہ وہ گے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۳/ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ہم تقریباً دو گھنٹے تک ناک کی سیدھ میں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ موضع سدرہ
 کوٹ تک پہنچ گئے۔ اس گاؤں کے لوگ کشمیر کی افسانوی تاریخ میں سادہ لوحی اور کم فنی کی وجہ سے
 مشہور ہیں۔ سویرا ہو چکا تھا۔ مسجدوں میں سے لوگوں کے درود و سلام اور وظیفہ خوانی کی آوازیں
 سنائی دے رہی تھیں۔

عورتوں کی قطاریں سروں پر گھڑے اٹھائے ہوئے چشموں سے پانی بھرنے کے لئے لمے جاری
 تھیں۔ ہم سدرہ کوٹ سے تیزی سے نکل گئے اور دن کے قیام کے لئے جگہ تلاش کرنے لگے۔
 ابھی ہم اسی تلاش میں تھے کہ سورج طلوع ہو گیا۔ سدرہ کوٹ سے میل بھر آگے ہمیں تین چار گھروں
 پر مشتمل ایک چھوٹی سی بہتی نظر آئی (ایسی جگہ تکیہ کہلاتی ہے)۔ یہ جگہ بانڈی پورہ روڈ کے شمال میں
 ایک بے آب و گیاہ ٹیلے کے دامن میں واقع تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں یا تو اس بہتی میں اپنی
 پناہ گاہ ٹیلے کے دامن میں واقع کرنی چاہیے یا اس ٹیلے پر کوئی جگہ ڈھونڈنی چاہئے۔ ہم ایک مالے
 کے بیچ میں سے گزر کر بہتی کے آخری مکان تک پہنچے۔ صحن میں داخل ہو کر گھر والوں کو آواز دی
 ۔ ایک نوجوان لڑکا باہر آیا۔ میں نے باقی گھر والوں کے بارے میں استفسار کیا۔ لڑکے نے جواب
 دیا۔ ”بابا جی ابھی مسجد سے نہیں آئے بس اتنے ہی ہو گئے۔“ میں نے کہا ہم تمہارے مہمان ہیں
 ۔ اور تمہارے ابا سے ملنا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر تمہارے گھر ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ لڑکا بلا تامل ہمیں گھر
 کے اندر لے گیا۔ میں نے لڑکے کا نام اور اس کے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔ اس
 کا نام غلام رسول تھا اور وہ طالب علم کی حیثیت سے ابھی پڑھ رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد لڑکے
 کا باپ جس کی عمر چالیس اور پچاس کے بیچ میں تھی، مسجد سے واپس آیا۔ آتے ہی لڑکے نے اسے

اجنبی مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ کمرے میں آیا۔ علیک سلیک کے بعد میرے قریب بیٹھ گیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے اسے بتایا ”ہم شکاری ہیں۔ پھاڑ کی دوسری طرف شکار کھیلنے کے لئے جا رہے ہیں۔ فی الوقت ہم اپنے ان ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں جو بندو قیں لے کر پیچھے آ رہے ہیں۔“ میرے جواب سے وہ مطمئن ہو گیا اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اس دوران ہم نے شیو بنائی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں سکول ماسٹر ہوں۔ یہ سن کر اس نے مجھے فرمائش کی کہ میں اس کے بیٹے کا امتحان لوں۔ بے چارہ خود تو ان پڑھ تھا لیکن اپنے بیٹے کو بڑے شوق سے تعلیم دلوا رہا تھا۔ میں نے لڑکے کو قریب بلایا اور اس سے کچھ سوالات کئے۔ لڑکا نوں جماعت کا طالب علم تھا۔ قریب گھنٹہ بھر اس کا امتحان لینے کے بعد میں نے اس کے باپ کو بتایا کہ لڑکا پڑھائی میں کمزور نہیں ہے اور انشاء اللہ امتحان میں کامیاب ہو جائے گا۔ اب اس نے مجھ سے ایک اور فرمائش کر ڈالی کہ اس کی دس سالہ بچی کا بھی امتحان لیا جائے جو ایک کتب کی طالبہ تھی۔ بچی قرآن شریف لے آئی اور مخصوص کشمیری لہجے میں تلاوت شروع کرنے لگی۔ وہ پڑھائی میں کچھ کمزور تھی اور مجھے بار بار اس کی غلطیوں کی اصلاح کرنی پڑ رہی تھی۔ میری تلاوت پر اس دہقان کو کچھ اچنبھا ہوا۔ اس نے مجھ سے اچانک سوال کیا ”آپ نے یہ قرأت کہاں سیکھی ہے؟“ میں اس کے سوال میں پہاں اشارے کو سمجھ تو گیا لیکن پھر بھی میں نے اس سے سوال کیا ”تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟“ اس نے جواب دیا ”آپ کی تلاوت مجھے پرانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے جب میں تقسیم سے پہلے نو جوان تھا اور محنت مزدوری کے لئے پنجاب جایا کرتا تھا۔ وہاں کے مولویوں کو میں نے اسی انداز سے قرآن شریف کی تلاوت کرتے سنا تھا۔“ میں نے اسے مطلع کیا کہ مذہبی تعلیم میں نے پنجاب ہی میں حاصل کی ہے۔ پھر میں نے اس کے ماضی کے بارے میں سوالات کیے تو وہ مسرت آمیز لہجے میں پنجاب میں اپنے قیام کے دوران کے تجربات سناتا رہا۔ اس طرح ہماری گفتگو بڑھتے بڑھتے سیاسی معاملات اور آخر کار کشمیر کے اندر مجاہدوں کی سرگرمیوں تک پہنچ گئی۔ اپنے میزبان کی اچھی جانچ پرکھ کے بعد میں نے اپنی حقیقت

ظاہر کردی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور ہماری خدمت میں وہ جو کچھ کر سکتا تھا، اس نے کیا۔ میرے ساتھیوں میں سے باری باری ایک آدمی باہر پہرہ دیتا رہا۔ اپنے میزبان سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ باغی پورہ کے علاقے میں سخت ناکہ بندی کر دی گئی ہے اور ہماری گرفتاری کے لئے ہر طرف چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ یہ اطلاعات اتنی پریشان کن تھیں کہ باغی پورہ کی طرف جانا ہمیں خطرناک محسوس ہوا۔ لہذا راستہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ شام کے وقت میں نے اپنے میزبان سے کسی ایسے گائیڈ کا بندوبست کرنے کے لئے کہا جو ہمیں دریا کے جہلم پر کسی ایسے مقام تک راہنمائی کر سکے جہاں سے دریا پار کر کے سوناواری تحصیل میں داخل ہو سکیں۔ اس نے اپنے بیٹے کے ذریعے پڑوس کے گھروں سے تین آدمیوں کو بلایا۔ یہ سب اس کے رشتہ دار اور قابل اعتماد لوگ تھے۔ ہماری موجودگی میں اس نے ہمیں درپیش مشکلات سے انہیں آگاہ کیا اور اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہتھید کے بعد طے پایا کہ موضع چندرگیر تک ہماری راہنمائی کی جائے اور یہاں سے سوناواری کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے کچھ بندوبست کیا جائے۔ چندرگیر سے آگے جانے کا بندوبست بھی ہمارے میزبان کے رشتہ داروں کو کرنا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک نے جس کا نام غلام محمد خان تھا، ہمارے ساتھ رضا کارانہ طور چلنے کی پیش کش کی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد تقریباً نو بجے ہم روانہ ہوئے۔ کھیتوں کے بیچ میں سے جنوب کی جانب تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم چندرگیر پہنچ گئے۔ غلام محمد خان ہمیں اپنے داماد کے گھر لے گیا اور دو اشخاص سے متعارف کرایا۔ ایک کا نام سلام تھا اور دوسرے کا ثناء اللہ شیخ۔ دونوں ہم سے بڑی گرمجوشی سے ملے اور ہماری بڑی خاطر مدارت کی۔ دریا عبور کرنے کی تجویز ملتوی کر دی گئی۔ کیونکہ ہمیں بتایا گیا کہ سادہ کپڑوں میں سی۔ آئی۔ ڈی کے کارندے دریا کے گھاٹ پر متعین کیے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ دریا پار کرنے کے لئے وقت بھی درکار ہوگا اور مناسب منصوبہ بندی بھی۔ پورے علاقے میں سیکورٹی کے انتظامات بہت سخت تھے، تاہم ہمارے میزبانوں نے ہمیں یقین دلایا کہ اگلی صبح تک کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کے مشورے سے ہم نے رات

کو اسی گھر میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہر حال میں نے باتوں باتوں میں ان پر واضح کر دیا کہ اگر ہمیں کسی قسم کی شرارت کا شبہ ہوا تو گھر کے مکینوں سمیت گھر کو آگ لگا کر جھسم کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد رات کا باقی حصہ ہم نے باری باری سو کر گزارا۔ ہم تینوں اور محمد خان ایک کمرے میں ٹھہرے اور دوسرے لوگ دوسرے کمرے میں۔ سحری کے وقت محمد خان ایک کمرے میں ٹھہرے اور دوسرے لوگ دوسرے کمرے میں۔ سحری کے وقت محمد خان نے ہم سے اجازت چاہی اور جاتے وقت وہ کہہ گیا کہ وہ کچھ معلومات حاصل کرنے کے بعد دوپہر کو واپس آجائے گا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ثناء اللہ نے ہمیں ایک ٹرانسپسٹر لا کر دیا۔ ہم اپنی پسند کے پروگرام سنتے رہے۔ اس کا عمر رسیدہ باپ ہمارے پاس ٹھہرا رہا تا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو پوری کی جائے صبح کے سات بجے ثناء اللہ نے ہم سے اجازت مانگی۔ تاکہ وہ دفتر میں حاضری دے سکے، اس نے وعدہ کیا کہ جتنا جلد ہو سکا وہ واپس آئے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اس علاقے میں دشمن کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہمیں آگاہ کرے۔ سلام ایک دانشمند اور دلیر قسم کا نوجوان تھا۔ اس نے رضا کارانہ طور پر سوپور تک ہمارے سفر کا ذمہ لیا، دن کے دو بجے ثناء اللہ دفتر سے واپس آیا تو وہ اپنے ساتھ ایک اخبار ”روزنامہ آفتاب“ سرینگور سے لے آیا۔ اخبار میں ہمارے جیل سے فرار کے متعلق ایک خبر تھی اور جیل حکام کے خلاف کی گئی کارروائی کا ذکر تھا۔ تھوڑی دیر بعد غلام محمد خان اور سلام بھی آگئے۔ غلام محمد خان نے علاقے میں ہماری گرفتاری کے لئے سیکورٹی کے انتظامات کی تفصیل بتائی۔ سلام نے ہمارے لئے دریا جہلم میں کشتی کے ذریعے کسی ایسے مقام تک سفر کے انتظامات کر لئے تھے جہاں سے ہم جنگل کے جنگلات سے گذر کر سوپور پہنچ سکیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سفر شام کو شروع کیا جائے۔ جب سفر کے انتظامات مکمل ہو گئے تو میں نے غلام محمد خان کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم ثناء اللہ اور عبدالسلام کے ہمراہ چند رگیر سے روانہ ہو گئے۔ مغرب کی جانب کوئی میل بھر چلنے کے بعد ہم ایک ایسے گھر میں پہنچے جو بالکل الگ تھلک تھا۔ آئیں ایک ماہی گیر رہتا تھا۔ عبدالسلام کے

انتظامات کے مطابق ایک بیس سالہ نوجوان ہمارا منتظر تھا۔ گھر میں ایک عمر رسیدہ عورت نے ہمیں نمکین چائے پیش کی۔ گھر میں اور کوئی تنفس موجود نہ تھا۔ چائے پینے کے بعد ہم پانچوں گھر سے باہر نکل کر مای گیری کی رہنمائی میں تقریباً دو سو گز چل کر دریا کے کنارے پہنچے۔ رات کو گھمبیر تاریکی میں دریا انتہائی پرسکون اور خاموش، اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ مای گیری کی کشتی گھاٹ پر بندھی ہوئی تھی۔ ہم اس میں سوار ہوئے اور لڑکے نے کشتی کھینچنا شروع کیا۔

کوئی میل بھر تک کشتی رانی کے بعد ہم ایک گاؤں کے گھاٹ پر رکے۔ کشتی کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ ہمارے سامنے سونا واری کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ مای گیری لڑکے کو وہاں تک ہمارا ساتھ دینا تھا۔ سونا واری پہنچ کر ہم شاء اللہ اور سلام کو واپس جانے کی اجازت دینے کی پوزیشن میں آجاتے۔ ہم ایک کچی سڑک پر ہولنے۔ تقریباً تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں کو تھوڑی دیر آرام کرنے کو کہا۔ آرام کے دوران ہی میں نے عبدالسلام کو نزدیک بلا کر اسے آگاہ کیا کہ میں نے پہلے سے تجویز کردہ راستہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اب ہم خشکی کے بجائے جھیل وولر کو کسی مناسب مقام سے عبور کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو ہمیں سوپور اور ولہلب کے درمیان کسی مقام تک پہنچا دے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ فیصلہ سوپور کے علاقے میں دشمن کے سیکورٹی انتظامات سے بچنے کے لئے کیا ہے۔ کیونکہ سوپور قومی محاذ آزادی کے پلیٹ فارم سے میری کاروائیوں کا خصوصی مرکز رہا ہے۔ میری اس تجویز نے نئی مشکلیں پیدا کر دیں۔ ہم نے مای گیری لڑکے کو بلایا اور اس سے مدد چاہی۔ سونا واری سے بانڈی پورہ اور سوپور کی جانب جھیل وولر میں کشتی رانی کو کشمیری زبان میں ”ہارہ تار“ کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں تفصیلی معلومات ہمیں مای گیری لڑکے سے معلوم ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اس علاقے میں آباد چھیروں کی بستیوں کے بارے میں پتہ چلا۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ”ہارہ تار“ کو نظر انداز کرنے اور کسی اور مقام سے جھیل عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر ہم وہاں سے چل پڑے۔ سیلاب کی روک تھام کے پشتوں کے ساتھ ساتھ ہم آگے بڑھتے گئے۔ جھیل وولر کا کنارہ ہمارے دائیں ہاتھ متوازی چل

رہا تھا۔ موسم سرما میں وولر کے پانی کی سطح گر جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اراضی کے کئی قطعات جو گرمیوں میں پانی میں ڈوبے رہتے ہیں، باہر نکل آتے ہیں۔ پانی سے قریب تر رہنے کے لئے چھیرے اس علاقے میں عارضی بستیاں قائم کر لیتے ہیں۔ جو پانی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ رات کے تقریباً دو بجے ہم جھیل وولر کے کنارے ایسی ہی ایک بستی میں پہنچے جس کا نام ”مقدم پار“ تھا۔ میں نے ایک منزلہ جھگی نما گھر پر دستک دی۔ جھگی میں رہائش پذیر مای گیر نے ہمیں غالباً کوئی چور، ڈاکو سمجھ کر دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ بڑی روقت کے بعد ہم اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہمارے ارادے بالکل خطرناک نہیں ہیں۔ چنانچہ دروازہ کھولا گیا اور ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہم نے مای گیر کو اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے کہا کہ ہم جھیل کے اس پار جانا چاہتے ہیں۔ اس نے کچھ پس و پیش کی۔ مگر سلام نے منہ مانگی اجرت دینے کی پیشکش کی تو وہ آمادہ ہو گیا۔ پھر کہنے لگا دن چڑھنے سے پہلے وہ پار جانے کے لئے تیار نہیں۔ اس نے ہمیں بتایا کہ جھیل کا پانی صرف صبح کے وقت پرسکون اور کشتی رانی کے قابل ہوتا ہے۔ شب و روز کے بقایا اوقات میں جھیل خوفناک لہروں کی زد میں ہوتی ہے۔ اس کا مجھے پہلے علم تھا، چنانچہ ہم نے صبح کا انتظار کیا۔ مای گیر کی بیوی کو جواب تک مخو خواب تھی، بیدار کیا گیا اور اس سے چائے بنانے کے لئے کہا گیا۔ اس نے تھوڑی دیر میں چائے بنا کر پیش کر دی۔ چائے کی پتی اور چینی ہم نے اسے مہیا کی۔ ہم نے چاول کے آٹے سے پکائی ہوئی روٹی کے ساتھ چائے پی لی۔ یہ روٹیاں ہم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ مای گیر کی بیوی نفسیاتی مریضہ تھی۔ اسے وہم تھا کہ اس پر جنوں اور بھوتوں کا سایہ ہے۔ چنانچہ جب اسے دورہ پڑتا تو وہ عجیب و غریب حرکات کر کے اور چٹخیں مار مار کر پریشان کن صورت حال پیدا کر دیتی۔ میں نے قرآن شریف کی چند آیتیں پڑھ کر اس پر دم کیا۔ اس کے علاوہ میں نے تھوڑا سا نمک لے کر اس پر آیت کریمہ پڑھ کر دم کیا اور ہدایت کی کہ اس نمک کو تھوڑا سا پانی یا چائے میں حل کر کے روزانہ استعمال کیا کرے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد جنوں اور بھوتوں سے نجات مل جائے گی۔ اس نے ہمارے آنے کو اپنے لئے خوش قسمتی

سبھا اور دعائیں دینے لگی۔ صبح کے چھ بجے تک ہم ٹھہرے کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ سلام نے اسے اپنی گرہ سے کچھ رقم دی اور ہم کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی میں سوار ہونے سے قبل ہم نے اپنے تینوں ہمدرد ساتھیوں ثناء اللہ، عبدالسلام اور ماسی گیر لڑکے کو الوداع کہا۔ ہمیں جھیل عبور کرنے میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ اور تقریباً دس بجے ہم نے سکر کے مقام پر جھیل کے ساحل کو چھو لیا۔ سکر اس ٹیلے کا نام ہے جس پر بابا شکر الدین ولی کا مزار ہے۔ اس مقام سے زینہ گیر اور سونا واری کا سارا علاقہ نظر آتا ہے۔ اور یہیں سے پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو سوپور اور بانڈی پورہ کی وادیوں کے درمیان دور تک چلا جاتا ہے۔ سلسلہ کوہ کے دامن میں پہنچ کر ہم نے اپنا سفر نہر زینہ گیر کے کنارے کنارے جاری رکھا۔ تقریباً چار گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سیبوں کے ایک باغ میں پہنچے اور کچھ دیر آرام کیا۔ ہم غروب آفتاب تک یہیں رہے۔ میر احمد کو ایک قریبی گاؤں میں بھیجا گیا۔ یہاں عبدالرحمان میر نامی ایک ساتھی رہتا تھا، اس سے رابطہ ہو جانے کے بعد ہم تینوں اس کے گھر چلے گئے۔ اور رات کا کھانا اس کے گھر کھایا۔ یہاں ہم نے ایک سابقہ ساتھی محمد مقبول میر سے رابطہ کیا۔ مقبول میر ایک خوشحال کسان تھا اور اس کا کپواڑہ میں کچھ کاروبار بھی تھا۔ یہ رات ہم نے اس کے گھر گزاری۔ اگلی صبح ہم نے اس پاس کے علاقے سے سیکورٹی کے انتظامات کے بارے میں معلومات کے لئے مقبول میر کو بھیجا۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ چائے، چینی اور سگریٹوں کی بھی ضرورت تھی، مقبول میر شام کو مذکورہ اشیاء کے علاوہ ضروری معلومات لے کر واپس آ گیا۔ عبدالرحمان میر کے ذمے یہاں سے آگے کے سفر کے انتظامات تھے۔ یہ ہمارے سفر میں وادی کے اندر آبادی والا آخری علاقہ تھا۔ اور یہاں سے سیدھا متارکہ جنگ کے اس پار پہنچا جاسکتا تھا۔ چنانچہ حالات کے مطابق عبدالرحمان کو پکے ہوئے اور خشک خورد و نوش جس میں چاول، آنا، بتو، کھانڈ، نمک، روٹیاں، آچار اور دیگر اشیاء شامل تھیں کا انتظام کرنا تھا۔ ہم نے اس کے علاوہ ایک کلہاڑی، کھانے پکانے کے چند برتن، ایک مارج اور سفر کے لئے گھاس کی چند پولیس حاصل کر لیں۔ عبدالرحمان نے ہمیں کچھ گرم پٹیاں اور بھیڑ کی کچھ گرم کھالیں بھی مہیا کیں۔ تاکہ بر فانی

سفر کے دوران بیروں اور ناگلوں کو سردی سے محفوظ رکھا جاسکے۔ برفانی علاقوں میں عام جوتے اور جرابیں کام نہیں دیتے۔ چنانچہ دیہاتی لوگ اپنے پاؤں کو اونی کپڑوں یا بھیر کی کھال میں لپیٹ لیتے ہیں اور پھر اس پر گھاس کی پولیس کس لی جاتی ہیں۔ ناگلوں کو گھٹنوں تک تقریباً چار انچ چوڑی اونی پٹی سے لپیٹ کر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح پاؤں برف پر پھسلنے سے محفوظ رہتے ہیں اور برف کے اثرات سے بھی بڑی حد تک بچاؤ ممکن ہو جاتا ہے۔ دن بھر مکمل آرام کرنے کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ عبدالرحمان کے علاوہ دو اور اشخاص نے کچھ فاصلے تک ہمارا ساتھ دیا اور ان کی مدد سے ہم نے دریائے پورو کو ایک کشتی کے ذریعے عبور کیا۔ یہاں سے ہم ایک کچی سڑک پر چلتے ہوئے رفیع آباد کے علاقے سے گزر کر بارہ مولہ شہر کی شمالی جانب پٹرول کی حدود میں واقع ایک جنگل کے دامن میں پہنچ گئے۔ عبدالرحمان اور اس کے دوسرے دوست تھیوں کو دریائے پورو عبور کرنے کے بعد ہم نے واپس بھیج دیا تھا۔ ہم نے طے کر لیا کہ حد متار کہ جنگ کو قاضی ناگ کے علاقے سے پار کیا جائے۔ اگرچہ راستہ بہت کٹھن تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار بھی تو نہ تھا۔ غلام نبین کو اس علاقے اور یہاں کے جنگلات سے کچھ واقفیت تھی۔ وہ ۱۹۶۵ء کی کمانڈر و کاروائیوں کے دوران اسی علاقے سے آزاد کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اس علاقے میں فلک بوس چوٹیاں جن کی اونچائی بعض مقامات پر ۱۴۰۰۰ فٹ تک پہنچتی ہے، عام لوگوں کے لئے دشوار گزار تھیں۔ چنانچہ اس علاقے میں دشمن کی موجودگی کا امکان کم تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ حد متار کہ جنگ سے ملحق آبادیوں میں ہماری گرفتاری کے لئے بھارتی فوج کے دستے بڑے پیمانے پر گھر گھر چھاپے مار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاستی سی۔ آئی۔ ڈی نے بھارت نواز عناصر خاص طور پر نمبر داروں اور چوکیداروں کو چوکنا کر دیا تھا کہ اگر انہیں خوراک یا پناہ کی تلاش میں کوئی اجنبی سرگرواں ملے فوراً پولیس کو اطلاع دی جائے۔ ریاستی پولیس نے ہماری تصویروں والے بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ چسپاں کر دیئے تھے جن میں کسی بھی جگہ ہماری موجودگی کے بارے میں اطلاع دینے والے کیلئے دس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ لوگوں کو متنبہ

کیا گیا تھا کہ ہماری کسی بھی قسم کی مدد کرنے والے کو سات سال سزائے قید دی جائے گی۔ ۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو پنزلہ کے جنگل سے ہم لوگ شمال کی جانب نوگام کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ یہاں سے دن کی روشنی میں ہمیں سفر کرنا تھا اسلئے ہم نے حتی الامکان گھنے جنگل کے بیچ میں سے پیش قدمی جاری رکھی۔ اس پورے سفر کے دوران ہم آبادیوں سے دور دور رہے۔ ہماری رفتار بہت سست تھی اور ہمیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑ رہا تھا کہ کسی کی نظر میں نہ آجائیں۔ ایک دو مقامات پر ہمارا آنا سامنا کسی راہ رو سے ہوا تو ہم نے فوراً کسی نزدیکی گاؤں کا پتہ پوچھ کر اس سے پیچھا چھڑا دیا۔ چار بجے کے قریب ہم دودھ کول پہنچے۔ یہ جگہ نوگام اور حمام مرکوٹ کی وادی کے درمیان ہے۔ ہم جنگل کی ٹیکری پر چڑھ گئے۔ ہمارے دائیں جانب نوگام کا نالہ تھا اور بائیں جانب حمام مرکوٹ۔ نالہ کی چڑھائی آسان تھی اور ہم نے اسے بغیر کسی دقت کے طے کر لیا۔ ٹیکری کے ساتھ ہم نے سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ ہم بر فانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ شام پڑتے ہی چیزہ کے گھنے جنگل میں ہم نے شب بسری کے لئے ایک مقام کا انتخاب کیا۔ آگ بجائی اور کچھ کھانے کا بندوبست کیا اور رات باری باری سو کر کاٹی۔ ۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی صبح ہم نے قاضی ناگ گلی کی طرف سفر شروع کیا۔ یہاں ہم نے اپنے بوٹ اتار لئے اور ان کے بدلے گرم پٹیاں، بھیڑ کی کھالیں اور پولیس کس لیں۔ ان کے علاوہ پاؤں کو برف کے اندر دھنسنے سے بچانے کے لئے پولوں کے ساتھ لکڑی کی پٹیاں بھی باندھ لیں۔ اب ہمارا سفر بہت دشوار مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ ہم پہلے جیسی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ برف سب سے بڑی رکاوٹ تھی، کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں پولو سے باندھی ہوئی پٹیاں اتارنی پڑیں۔ تاہم یاسین نے اپنی پٹیاں بندھی رہنے دیں کیونکہ اسے انکے ساتھ چلنے کا خاصا تجربہ تھا۔ دو بجے سہ پہر ہم قاضی ناگ گلی کے واس میں پہنچ گئے۔ اس جگہ پر پہنچ کر ہم نے اپنا رخ مغرب کی جانب کیا اور گلی کی چڑھائی سے پہلے ہم نے بہک کے ایک کوٹھے میں کچھ آرام کیا (پہاڑی علاقوں میں بکروال گرمیوں کے موسم میں اپنے مویشیوں کو اونچی جگہ پر لے جاتے ہیں۔ یہ چہ اگا ہیں بہک کہلاتی ہیں اور ان میں عارضی رہائش

کے لئے کوٹھے تعمیر کیے جاتے ہیں جو سردیوں میں خالی پڑے رہتے ہیں۔ ہم نے یہاں کھانا کھایا اور اس کے بعد گلی پر چڑھنا شروع کیا۔ چڑھائی بہت خطرناک تھی کہیں کہیں کمر تک برف میں ڈھنس جاتے تھے۔ اس وجہ سے ہماری رفتار بہت سست تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ موسم بہت صاف تھا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہم نے چڑھائی شام تک جاری رکھی۔ یہ پہاڑ جنگلات سے بھرپور تھا۔ ہماری اگلی منزل ڈبری ٹاپ تھی۔ دن ڈھلنے کے بعد میرے ساتھی سستنا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ ہم نے ابھی بہت ہی کم فاصلہ طے کیا تھا اور ہمارے پاس راشن کی مقدار بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ اوسطاً زیادہ فاصلہ طے کیے بغیر ہم منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے اور راستے ہی میں مرکپ جائیں گے۔ ہم اپنے ساتھ صرف چار دن کیلئے خورد و نوش کا سامان لیکر چلے تھے۔ چار میں سے دو دن کی خوراک ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ برف پر ستاروں کی کرنوں سے پیدا ہونے والی روشنی میں ہم نے چوٹی کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ تقریباً دو بجے ہم سب ڈبری ٹاپ سے ایک گز کے فاصلے پر رہ گئے۔ یہاں پر ایک چھوٹا سا میدان تھا جس میں کوئی درخت وغیرہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی ہمیں بہک میں نہ ہوا ایک کوٹھل مل گیا، ہم اسی میں داخل ہوئے کھانا پکایا اور کھانے کے بعد آرام کی غرض سے سو گئے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۶۸ء کی صبح پہلی کرن کے ساتھ ہی ہم نے اپنا سامان اٹھایا۔ کوٹھے کو خیر باد کہا اور بلندی کی طرف دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ ہم ڈبری ٹاپ پر پہنچے تو سورج چمک رہا تھا۔ سامنے دور دور تک پھیلی ہوئی برف پوش چوٹیاں چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔ ڈبری ٹاپ عبور کرنے کے بعد ہم ایک سطح مرتفع میں آ گئے۔ ایسی جگہ کو کشمیری زبان میں ”سگر مائی“ کہتے ہیں۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ ہم ایسے مقام پر تھے جہاں سے تھوڑی دور اور جانے کے بعد واوی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے رک گئے۔ میں نے واوی پر آخری نگاہ ڈالی۔ سورج ہمارے سر پر تھا۔ لیکن جب میں نے واوی پر نگاہ دوڑائی تو مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ کیونکہ اس مقام سے

ہزاروں فٹ نیچے گہرے بادلوں نے سارے علاقے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کی وجہ سے میں اس دُفرب اور حسین وادی کو نہ دیکھ سکا جس کی آزادی کے لئے میں نے اپنی جان کو جو سکھم میں ڈل رکھا تھا۔ ہم سطح مرتفع سے آگے روانہ ہوئے۔ اب جو سفر درپیش تھا اس میں کہیں ڈھلوانیں تھیں، کہیں چھوٹی موٹی چوٹیاں اور کہیں چٹانوں پر سے گزرتا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سارا علاقہ دھوپ کی براہ راست زد میں تھا۔ موسم صاف ہونے کی وجہ سے رات کی خشکی نے برف کی بالائی سطح کو سخت کر دیا تھا۔ اس طرح اب ہمارے لئے برف میں دھنسنے کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ دن دو بجے کے قریب ہم سطح مرتفع کے کنارے ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے آزاد کشمیر کی جانب پہاڑی چوٹیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس سطح مرتفع کی بلندی ۱۴۰۰۰ فٹ ہے۔ یہاں سے قاضی ناگ کے کوہستان کے کئی سلسلے اطراف میں پھیلے ہیں۔ اور ان میں کئی مالے پھوٹ کر دریائے جہلم، کشن گنگا (نیلم) اور دریائے پور میں جا گرتے ہیں۔ ان مالوں کی تعداد سات یا نو ہے۔ سطح مرتفع کے آس پاس کا علاقہ جنگلات سے بالکل خالی تھا۔ اور ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس گنجانے پہاڑی سلسلے کو عبور کر کے شام پرانے سے پہلے کسی جنگل میں پہنچنا تھا تاکہ رات گزارنے کا کوئی مناسب بندوبست ہو سکے۔ میں نے نیچے نگاہ دوڑائی تو بائیں ہاتھ ایک جنگل قریب تر نظر آیا ہم نے اس کی طرف بڑھنا مناسب سمجھا۔ اترا نی بہت نیکی ہوئے کی وجہ سے انتہائی دشوار تھی۔ ہم نے سیدھا نیچے جانے کے بجائے قدم جما کر ترچھی سمت میں اترنا شروع کیا۔ ہم نے ایک دوسرے کے مابین پندرہ سے بیس گز کا فاصلہ رکھا۔ ایک جگہ میرا احمد اپنا توازن کھو بیٹھا اور پھسل کر دور تک برف کی سطح پر لڑھکتا چلا گیا۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میں اپنی بھاری بھر کم لائی کو برف کے اندر دبا کر اس کے سہارے خود ایک چٹان کی طرح کھڑا ہو گیا تاکہ میرا احمد کو سہارا دے سکوں۔ جو کہ میرے پیچھے لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس خطرناک اترائی کو عبور کر کے ہم ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں سے ایک مالہ پھوٹ کر گہرائیوں میں جا گرتا تھا۔ مالے کے کنارے کنارے ہم تیز رفتاری سے جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم نے ایک کوٹھا تلاش کر لیا۔ شام

پڑ چکی تھی۔ جب ہم قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ یہ کوٹھا اصل میں ایک سرحدی چوکی ہے جو ان دنوں موسم سرما کی وجہ سے خالی چھوڑی گئی ہے۔ ہم نے چوکی کی تاشی لی۔ اس میں سے ہندی میں لکھے ہوئے چند خطوط اور ڈالدا لگی کے خالی ڈبوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ تاہم ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ بھارتی فوج کی چوکی ہے اور اب ہم حد متارکہ جنگ کے قریب آ چکے ہیں۔ جس مالے کے کنارے ہم سفر کر رہے تھے وہ نیچے جا کر مقبوضہ کشمیر کے علاقے اوڑی میں جا گرتا تھا۔ یہاں کچھ کھانا تیار کرنے کے بعد ہم نے آرام کیا تاکہ اگلے دن تازہ دم ہو کر سفر جاری رکھ سکیں۔

۲۰ دسمبر یعنی صبح ہم نے مالے کو چھوڑ کر مغرب کی جانب پہاڑ کی ٹیکھی ڈھلوان پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ چڑھائی بھی مشقت طلب تھی۔ ایک ایک قدم جما کر برف میں راستہ بنانا پڑتا تھا اور یہ کام باری باری آگے ہو کر کرتے رہے۔ سارے دن کی محنت شاقہ کے باوجود ہم اس روز پہاڑ کی چوٹی پر نہ پہنچ سکے۔ پہاڑی سفر میں بارہا ایسے ہوتا ہے کہ آپ تھکا دینے والے سفر کے بعد ایک چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں تو آگے ایک اور چوٹی سر نکالے کھڑی ہوتی ہے اور یوں یکے بعد دیگرے کئی چوٹیاں آخری سمجھ کر سر کرنی پڑتی ہیں۔ ہم نے پہاڑ کے جنگلات پر مشتمل حصہ غروب آفتاب تک طے کر لیا۔ اور ایک چوٹی پر بڑی سی چٹان کے سائے میں رک کر آرام کرنے لگے۔ ہم نے بھوج پتر کا ایک پودا کاٹا اور آگ جلائے کا بندوبست کیا۔ بھوج پتر کی چھال ہلکے بھورے رنگ کے بہت ہی عمدہ اور کاغذ کی صاف تہوں جیسی ہوتی ہے۔ ہمارے پاس راشن قریب الاختتام تھا۔ چنانچہ ہم نے بچے کچھے چاول، ستو اور چائے کی پتی کو ایک ساتھ پیس کر ملغوبہ سا تیار کر لیا جو ہمارے سفر کی تھکان کے بعد نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ ہم نے آگ جلا رکھی تھی لیکن شدید سردی کی وجہ سے سونہ سکے۔ ہم اگر اپنا رخ آگ کی طرف کرتے تو جسم کی پیٹھ کا حصہ بخ بستی ٹھنڈی ہواؤں سے اکڑنے لگتا اور اگر پیٹھ آگ کی طرف کرتے تو سامنے کا حصہ بخ ٹھنڈی ہواؤں سے سن ہو جاتا۔ بہر حال آگ نے ہمیں اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ اتنی بلندی پر کھلے آسمان کے نیچے بخ بستی ہواؤں میں اپنے ہاتھ اور پیر شل ہونے سے بچ گئے۔

دوسرے دن علی الصبح سورج نکلنے کے بعد ہم نے سفر شروع کیا۔ دوپہر تک ہم سیدھی چڑھائی چڑھتے رہے۔ اسکے بعد شمال مغرب کی طرف رخ موڑ لیا۔ یہاں سے ہمیں ایک گلی کے راستے اس پہاڑ کو عبور کرنا تھا۔ بسا اوقات ہمیں سیدھی ایستادہ چٹانوں پر چڑھنا پڑتا۔ دو بجے سہ پہر ہم گلی کے دامن میں پہنچ گئے۔ ہم اس سے کہیں پہلے یہاں پہنچ چکے ہوتے اگر راستے میں چھوٹا سا حادثہ پیش نہ آتا۔ دوران سفر ایک جگہ میرا پاؤں پھسل گیا اور میں لڑھکتا ہوا نیچے مارے میں گر پڑا۔ میرے ساتھی افقاں و خیزاں مجھ تک پہنچے اور بڑی مشکل سے مجھے واپس اوپر لے آئے۔ اس حادثے میں میرا ایک ہاتھ چٹان سے لگ کر زخمی ہو گیا۔ لیکن چونکہ یہاں کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی کم تھا اس لئے زیادہ خون نہیں بہا۔ ہم نے بلندی کا سفر جاری رکھا حتیٰ کہ ہم اس ٹیکری تک پہنچ گئے جس کو ’ست سری‘ کہا جاتا ہے۔ یہاں سے سات مارے پھوٹے ہیں جو بعد میں پھیل کر کچھ تو آزاد کشمیر میں چلے جاتے ہیں اور کچھ مقبوضہ کشمیر میں۔ ٹیکری پر پہنچ کر ہمیں ایک اور سطح مرتفع کو عبور کرنا پڑا۔ اب ہمیں ایک ڈھلوان درپیش تھی جسے آزاد کشمیر میں چھمب مالہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ مالہ تافسی ناگ کے دھانے سے پھوٹ کر جنوب مغرب کی سمت بہتا ہے۔ اگرچہ اس علاقے سے پہلے کچھ واقفیت نہ تھی مگر ہم مجھے یقین تھا کہ ہم آزاد کشمیر کے علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔ شام ہونے تک ہم نے مارے کا بے شجر گنجا علاقہ طے کر لیا اور جنگل میں داخل ہو گئے۔ پر دل کے ایک درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال کر ہم نے آگ جلائی۔ لیکن ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا، سوائے سبز چائے کی تھوڑی سی پتی کے۔ ہم نے نمکین چائے تیار کی اور بغیر دودھ کے ایک ایک پیالہ پی کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ تھکے ماندے اور خالی پیٹ ہونے کے باوجود ہم سو گئے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو چھمب مالے کے ساتھ ساتھ ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ دوپہر تک ہم نے برفانی علاقہ طے کر لیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہمارا سفر جنگل کے بیچ چھمب مالے کے کنارے جاری رہا۔ شام ہونے پر مارے کے کنارے ہی ایک سر نلک چٹان کے سائے میں ہم آرام کے لئے ٹھہر گئے۔ برفانی علاقے کو عبور کرنے کے بعد بخ بستہ پولوں کے اندر کچھ حرارت پیدا ہو جانے

کی وجہ سے ہمیں اپنے پاؤں میں شدید درد محسوس ہونے لگا۔ ہمارے پاؤں برف سے جل گئے تھے۔ اور پولوں کی رسیوں نے ہمارے پاؤں اور ٹخنوں میں زخم ڈال دیئے تھے۔ تاہم میں نے پولوں کو اس ڈر سے بندھا رہنے دیا کہ کہیں ہمارے زخم ٹنگے ہو کر خراب نہ ہو جائیں اور ہمیں چلنے پھرنے سے معذور نہ کر دیں۔ درد شدید تھا اور آگ پر پاؤں گرم کرنے کی وجہ سے اس کی شدت میں اضافہ ہونے کا احتمال تھا۔ اس لئے ہم نے اپنے پاؤں آگ کی گرمی سے دُور رکھے۔ میرا احمد کے پاؤں کی حالت بہت ہی بری تھی۔ وہ درد کی شدت سے رات بھر ایک لمحہ بھی نہیں سو سکا اور ہم بیٹھے اسے تسلیاں دیتے رہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۶۸ء کی صبح مالے کے ساتھ ساتھ اس امید پر ہم نے سفر جاری رکھا کہ ہم جلد ہی کسی بہتی میں پہنچ جائیں گے۔ ایک دو مقامات پر ہم بہکوں سے گزرے۔ بہک اس چیز کی علامت تھی کہ اب آبادی والا علاقہ زیادہ دور نہیں ہے۔ سفر کے ساتھ ساتھ ہمارے پاؤں کے درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دوپہر کے قریب جب ایک مقام پر تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہمیں دوبارہ سفر شروع کرنا پڑا تو میرا احمد نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ شدت درد سے ہلہلا رہا تھا۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم سفر جاری رکھیں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ درد کی وجہ سے ایک قدم بھی آگے بڑھانے سے معذور ہو گیا تھا۔ جب ہم کسی طرح اسے چلنے پر آمادہ نہ کر سکے تو میں نے اسے براہملا کہنا شروع کر دیا۔ اس سے اس کا سارا سامان لے لیا اور اسے اپنی بغل میں لے کر ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ کہیں تھوڑی بہت چڑھائی آئی تو ہم اسے اٹھا کر اوپر لے جاتے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو سرینگر جیل کی پھانسی کی کوٹھری سے بچ نکلنے کے بعد یہاں کے برفانی پہاڑوں پر اس کی موت یقینی تھی۔ سہ پہر کو ہم گھنے جنگل کو عبور کر کے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے موضع چھمب صاف نظر آرہا تھا۔ اتنی اترتے وقت چند سوگزیں نیچے ہمیں ایک آدمی نظر آیا۔ اسے آواز دی، اسنے ہمیں نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ غلام نبین نے اس سے بات کی اور پوچھا کہ اس کے گاؤں کا کیا نام ہے؟ کیا یہ حد متار کہ جنگ ہے؟ اور کیا یہ پاکستان کی

جانب ہے؟ اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد ہم نے اس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اپنے گھر لے چلے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم سرینگر جیل سے بھاگ کر آئے ہیں۔ یہ عید کا دوسرا دن تھا۔ ہماری عید جہاں گزری، جس طرح گزری وہ سناچکا ہوں۔ ہم عید اس روز منائیں گے جس روز کشمیر آزاد ہوگا۔ اس شخص نے اپنا نام شاہ محمد بتایا۔ اس کے گھر پہنچے تو ہم نے اس سے کہا کہ ہم گزشتہ تین روز سے بھوکے ہیں۔ ہمیں کچھ کھانے کو دو۔ اس نے جلدی جلدی چاول پکوائے۔ آلو کا سالن تیار کروایا اور ہمیں کھلایا۔ ہم نے یہاں کچھ آرام کیا اور پولیس آتا رہیں۔ ہمارے پاؤں گل چکے تھے اور ہمارے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ شاہ محمد کے گھر ہماری ملاقات اس کے دوست محمد یعقوب سے بھی ہوئی۔ جو گاؤں میں دکانداری کرتا تھا اور اس روز شاہ محمد کے گھر والوں کو عید مبارک کہنے آیا تھا۔ گھر میں جگہ کی تنگی کے باعث طے پایا کہ غلام نسیم اور میں محمد یعقوب کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ رات گزاریں اور میر احمد، شاہ محمد کے گھر آرام کرے۔ میر احمد درد کے مارے کر اور رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ شب بھر کے آرام کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جائے گی اور ہم سفر جاری رکھ سکیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں محمد یعقوب کے ساتھ اس کے گھر روانہ ہوئے اور شاہ محمد کو ہدایت کر گئے کہ وہ اگلی صبح میر احمد کو یعقوب کے گھر پہنچا دے۔ یعقوب کے گھر ہماری بہت خاطر تواضع ہوئی اور ہمارے برف سے جلے ہوئے پاؤں کے لئے کچھ مقامی علاج بھی کیا گیا۔ یعقوب کے گھر کچھ اور مقامی لوگ بھی جمع ہو گئے، انہوں نے ہمیں مبارک باد دی اور بتایا کہ آزاد کشمیر فوج کی ایک چوکی یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ طے پایا کہ ہماری آمد کی اطلاع چوکی پر دی جائے۔ اس کام کے لئے ایک مقامی مجاہد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس نے صبح سویرے یہ کام سرانجام دینے کا وعدہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک طویل، صبر آزما، حوصلہ شکن اور کٹھن سفر کے بعد ہم ایک گھر کے اندر گرم کمرے میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۶۸ء کو شاہ محمد، میر احمد کو ساتھ لیکر طے شدہ پروگرام کے مطابق علی الصبح یعقوب کے گھر پہنچا۔ ہماری آمد کی خبر اس پاس کے لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ صبح کے وقت کچھ لوگ ہمیں

مبارک باد دینے آنے لگے۔ کچھ دیر بعد مقامی مجاہد آزاد کشمیر فوج کی چھمب چوکی سے ایک سپاہی کو ساتھ لے کر واپس آیا۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ ہم اپنے پاؤں پر چلنے سے بالکل معذور تھے اس لئے مقامی لوگوں نے ہمیں پیٹھوں پر اٹھایا اور تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم چوکی پر پہنچے۔ یہاں ایک صوبیدار نے ہمارا استقبال کیا۔ اس نے گاؤں والوں کو رخصت کرنے کے بعد ہمیں چائے پلائی اور کھانا کھلایا۔ ہماری آمد کی اطلاع سینئر انسپران کو دی گئی۔ میں نے ذاتی طور پر فورس کمانڈر سے بات کی جو کسی اور چوکی پر موجود تھا۔ کمانڈر نے ہمیں بتایا کہ وہ ہماری آمد کی رپورٹ انسپران بالا کو کر دے گا۔ اور جوں ہی کوئی فیصلہ ہوا ہمیں اطلاع کر دی جائے گی۔ میں صوبیدار کے ساتھ دو گھنٹے بات چیت کرتا رہا۔ میرا احمد اور غلام نبین سپاہیوں کے ساتھ دوسرے بنکر میں گپ شپ کرتے رہے۔ ہمیں چناری کے علاقے میں بنالین ہیڈ کوارٹر پہنچانے کا بندوبست کیا گیا۔ غلام نبین کے لئے بھی قلیوں کا بندوبست کیا گیا تھا لیکن اس نے پیدل چلنے کو ترجیح دی کیونکہ اس کے پاؤں برف کی وجہ سے زیادہ نہیں چلے تھے۔

اس روز موسم ابر آلود تھا۔ صبح جب ہم چوکی پر پہنچے تو برف باری شروع ہوئی تھی اور جس وقت ہم چوکی سے ساون کچھ کے لئے روانہ ہوئے تو کوئی نو انچ برف گر چکی تھی اور برف باری ابھی جاری تھی۔ میں نے خداوند قدس کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہم پر بڑا رحم و کرم کیا ہے۔ اگر وادی سے چھمب تک کے سفر کے دوران کسی روز برف باری ہوتی تو ہم دوران سفر کہیں مر کھپ گئے ہوتے اور کسی کو ہمارا نشان تک نہ ملتا۔ ساون کچھ کے بنالین ہیڈ کوارٹر میں ہم رات کے وقت پہنچے۔ اگلے روز صبح سویرے ناشتے پر میس کے اندر آزاد کشمیر فوج کے انسپروں سے میری بات چیت ہوئی۔ یہ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۸ء کی تاریخ تھی، ایف۔ آئی۔ یو۔ کا ایک جے سی۔ او کیپ میں آیا اور ہم سے سوالات پوچھے۔ فوجی ڈاکٹر نے ہمیں ابتدائی طبی امداد بہم پہنچائی۔ بہت دن بعد میں نے شیو بنائی اور گرم پانی سے منہ دھویا، کچھ عرصہ بعد ایف آئی یو۔ کا متذکرہ جے سی۔ او ایک جیپ لیکر پھر واپس آیا اور ہمیں اپنے ساتھ مظفر آباد لے گیا۔ مظفر آباد پہنچ کر ہم سیدھے گوجرہ کے قلعے میں لے جایا گیا

جسے عرف عام میں ”بلیک فورٹ“ یا ”قلمعہ سیاہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں پاکستان آرمی کی ۶۱۱ فیلڈ انوسٹی گیشن یونٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا طویل ترین پیدل سفر اختتام کو پہنچا۔ جو ہمیں اپنے مقدم مشن کے سلسلے میں اختیار کرنا پڑا تھا۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ایک ایسی چال تھی جس میں منصوبہ کا ہر مرحلہ اور ہر مرحلے کا ایک ایک قدم انتہائی احتیاط اور ہوش مندی کے ساتھ اٹھایا جانا تھا۔ قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا جن کی پیش بندی اور پیش بینی ضروری تھی۔ آخر ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ ایک ایسی کامیابی تھی جو ہم نے اپنے اس دشمن کے خلاف حاصل کی تھی جو ہم سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اور جس کے وسائل لامحدود تھے اور جو ہر لحاظ سے چوکنا تھا۔ یہ ایک ایسی کامیابی ثابت ہوئی جس نے میرے اندر نئی امیدیں اور نئی انگلیں پیدا کر دیں۔ اس نے مادر وطن کی آزادی کے لئے میرے جذبے اور عزم کو مزید پختہ کر دیا تھا۔ اس عزم کا عہد میں نے قومی محاذ آزادی میں شمولیت کے وقت کیا تھا۔ اب میں اپنے آپ کو زیادہ پر امید اور زیادہ پر اعتماد محسوس کر رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکوں گا۔ مقصد کی صداقت اور اس کے حصول کے لئے صحیح خطوط پر جدوجہد پر میرا ایمان اور پختہ ہو گیا تھا۔ یہ ایک انتہائی مسرت اور انبساط کا موقع تھا اور میں بہت خوش تھا۔ آخر کار میں بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ موت کے پنجوں میں جکڑے ہوئے ایک شخص کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا مقام اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ جلد ہی بلیک فورٹ کے تجربے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سوچ کی نئی نئی راہیں اور درپے کھلتے گئے۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار ہو گیا کہ اپنا دشمن کون اور دوست کون ہے۔

رہائی کے بعد جدوجہد

مقبول ہٹ شہید نے اپنے فرائض کی روداد کے آخر میں جس کرب کا اظہار کیا ہے وہ واقعی

ایک المیہ ہے۔ وہ اور ان کے ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ آزاد کشمیر پہنچنے پر اس کارنامے پر یقیناً ان کی عزت افزائی ہوگی اور اس طرح ان کی جدوجہد کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ ان کو تحریک کو مزید منظم کرنے کا موقع ملے گا۔ ان کے لئے یہ آسان ہوگا کہ وہ اپنے تصورات کے مطابق محکوم وطن کی آزادی کے لئے قدم آگے بڑھاسکیں لیکن آزادی کے اس عظیم سرفروش کا المیہ دیکھنے کہ سرینگر کے مہتات باغ میں بھارت دشمنی اور جدوجہد آزادی کی پاداش میں اذیتیں برداشت کرنے والا کشمیر کا بہادر فرزند جب اپنی ہمت، دلیری اور ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیل سے فرار ہو کر بدترین حالات میں آزاد خطے میں پہنچا تو یہاں بھی اس کا مقدر اذیت خانہ ہی ٹھہرا۔ مقبول بٹ اور ان کے رفقاء کو بلیک فورٹ جیل میں قید کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جنوری 1969ء سے مارچ 1969ء یعنی دو ماہ تک مقبول بٹ مادر وطن کے آزاد خطے میں آزادی کی خاطر جدوجہد کی پاداش میں اذیتیں برداشت کرتے رہے۔ اس دوران ان کے رفقاء نے احتجاجی مظاہرے کئے جن کے نتیجے میں مقبول بٹ 8 مارچ کو رہا کر دیئے گئے۔ مقبول بٹ کی عملی جدوجہد خصوصاً موجودہ کارنامے کے بعد انہیں اپنے رفقاء کا رہیں بلند مقام حاصل ہو گیا۔ وہ آزادی کی خاطر خلوص سے جدوجہد کرنے والوں کی نظر میں معتبر ہو گئے۔ ہر شخص نے ان کے جذبے کی شدت کو محسوس کیا۔ دوسری طرف مقبول بٹ شدید ذہنی صدمات کے باوجود پُر عزم تھے بلکہ ان حادثات نے ان کے لئے تازیا نے کا کام دیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے اپنے راستے پر گامزن ہو گئے۔ قومی محاذ آزادی جو مقبول بٹ کی گرفتاری کے بعد ایک صدمے سے دوچار ہوئی تھی پھر منظم ہونا شروع ہو گئی۔ مقبول بٹ اور ان کے رفقاء نے مقبوضہ کشمیر میں منظم انداز میں کوریلا آپریشن کا پروگرام ترتیب دیا۔ اس دوران مقبول بٹ، امان اللہ خان اور میر عبدالقیوم کے ساتھ ڈاکٹر فاروق حیدر بھی شریک ہو گئے۔ میر عبدالمنان کسی حد تک غیر فعال رہے۔ میجر امان اللہ خان کو بعض معاملات کی وجہ سے الگ کر دیا گیا۔ اس طرح نیشنل لبریشن فرنٹ پھر سے سرگرم ہو گئی۔ مسلح جدوجہد کے لئے مختلف ذرائع سے روپیہ فراہم کیا گیا اور مقبوضہ کشمیر کے اندر باقاعدہ آپریشنز شروع کر دیے گئے۔ امان اللہ خان جو مقبول بٹ کے قریبی ساتھی اور

این۔ ایل۔ ایف کے اہم رکن تھے، نے اس دوران ”الفتح اور کشمیری نوجوان“ نامی ایک پمفلٹ تحریر کیا اس پمفلٹ میں کشمیری نوجوانوں کے جذبات کو الجھرائے کے مجاہدین اور الفتح کے ذکر سے ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ کتابچہ مقبوضہ کشمیر میں بھی وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ قومی محاذ آزادی نے مقبوضہ کشمیر میں اپنی کاروائیاں مسلسل جاری رکھیں۔ سو پور میں اسی جدوجہد کے سلسلے میں کشمیریوں اور پولیس کے درمیان تصادم بھی ہوا۔ اس جدوجہد کی کوچ کشمیر اسمبلی میں بھی سنائی دی۔ کانگریس کے رکن غلام رسول کار نے انکشاف کیا کہ کشمیری نوجوانوں کو کوریڈا طرز پر منظم کیا جا رہا ہے اور اس کا الزام انہوں نے قومی محاذ آزادی پر عائد کیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی اس جدوجہد سے متاثر ہو کر بھارت کو وارننگ دی کہ کشمیری نوجوان اب پڑاؤن طریقوں کے پابند نہیں۔ 1969ء کے ان حالات سے واضح ہوتا ہے کہ مقبول بٹ اور ان کے رفقاء کی جدوجہد رائیگاں نہیں جا رہی تھی بلکہ ان کے نقطہ نظر کو فروغ مل رہا تھا۔ ادھر اوٹر 1969ء میں محاذ رائے شماری کے کنونشن میں مقبول بٹ کو جماعت کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ محاذ رائے شماری میں شامل بعض لوگ مسلح جدوجہد کے حق میں نہیں تھے لیکن مقبول بٹ نے این ایل ایف کو محاذ کا عسکری ونگ قرار دیا۔ بہر حال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مقبول بٹ دونوں پلیٹ فارمز سے مسلسل مصروف عمل رہے۔ عسکری تحریک شروع کرنے کا فیصلہ شہید قائد نے اُس وقت کی دنیا میں عسکری تحریک کی مقبولیت سے متاثر ہو کر اٹھایا تھا۔ لکیر یا، فلسطین وغیرہ کی تحریک نے شہید قائد کو اس سلسلے میں ابھارا تھا۔ سیاسی میدان میں محاذ کے پلیٹ فارم سے اور مسلح جدوجہد کے لئے این ایل ایف کے پلیٹ فارم سے۔ مقبول بٹ نے محاذ رائے شماری کا صدر منتخب ہونے کے بعد مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ لاہور اور کوئٹہ انوالدہ میں پولیس کانفرنس سے خطاب کیا۔ ان کی پولیس کانفرنسوں کے نتیجے میں صحافی برادری ان سے کافی متاثر ہوئی۔ اس طرح مقبول بٹ کی قیادت میں محاذ سیاسی لحاظ سے کافی سرگرم رہا۔ اگرچہ حکومت پاکستان نے اس دوران ان لوگوں کو مختلف ذرائع سے تنگ کرنے کی کوششیں کی۔ محاذ کو وارننگ بھی دی گئی، لیکن مقبول بٹ اور ان کے رفقاء مسلسل اپنے کام میں مصروف رہے۔ 1970ء میں حکومت پاکستان نے آزاد

کشمیر ایکٹ جاری کیا۔ محاذ رائے شماری نے اس ایکٹ کی شدید مخالفت کی اور اسے دستاویز غلامی قرار دیا اور اس ایکٹ کے تحت ہونے والے انتخابات کا بھی بائیکاٹ کیا گیا۔ محاذ کی قیادت نے اس سلسلے میں سارے آزاد کشمیر کا دورہ کیا۔ 1970ء میں محاذ رائے شماری نے مقبول بٹ کی قیادت میں آزاد کشمیر ایکٹ 1970ء کے خلاف بھرپور مہم چلائی۔ یہ مہم سراسر حق اور سچائی پر مبنی تھی۔ درحقیقت پاکستان کے حکمرانوں نے آزاد علاقے کو کبھی وہ حیثیت نہیں دی جس کا وہ مستحق تھا۔ یہ صورتحال تحریک آزادی کشمیر کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ کشمیر کا آزاد علاقہ جسے مجاہدین نے خود قریبائیاں دے کر آزاد کر لیا تھا، وزارت امور کشمیر کے کارندوں کے ہاتھ دے دیا گیا۔ آزاد کشمیر میں تو پھر بھی دکھاوے کی ٹوٹی پھوٹی کرسی موجود تھی لیکن گلگت بلتستان کے لوگ بے پناہ قریبائیاں دے کر بھی اپنے علاقے میں بنیادی حقوق سے محروم تھے۔ کچھ عرصہ قبل ہی حکومت پاکستان نے منسلک کشمیر کو مندی متاثر کرنے ہوئے گلگت بلتستان کو پاکستان کے ایک صوبے کی حقیقت دی ہے۔ پاکستان کی حکومت کا یہ فیصلہ کسی بھی طور کشمیریوں کے مفاد میں نہیں ہے۔ 1970ء کے سال کے دوران محاذ کی اہم سیاسی سرگرمیاں آزاد کشمیر ایکٹ کے خلاف مہم اور گلگت بلتستان کے حقوق کے لئے جدوجہد ہے۔ اکتوبر 1970ء میں محاذ رائے شماری کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس گلگت میں بلایا گیا۔ چونکہ محاذ آزاد کشمیر اور پاکستان میں آزاد کشمیر ایکٹ کے خلاف بھرپور مہم چلائے ہوئے تھا، اس لئے محاذ کی ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو گلگت نہیں جانے دیا گیا۔ انتظامیہ کو یہ خدشہ تھا کہ گلگت میں بھی بیداری کی لہر شروع ہو جائے گی۔ اکثر ممبران گلگت نہ پہنچ سکے۔ تاہم عبدالخالق انصاری، مقبول بٹ، میر عبدالمنان اور امان اللہ خان گلگت چلے گئے۔ گلگت کے عوام نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ محاذ کے ممبران نے اپنا لٹریچر بھی تقسیم کیا لیکن رات کو پولیس نے ان لوگوں کو دھوکے سے بلایا اور گلگت کی حدود سے باہر قبائلی علاقہ میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے 36 گھنٹے مسلسل سفر کے بعد سوات پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور وہاں سے راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ اس تمام ”حسن سلوک“ کے باوجود یہ لوگ بدستور اپنی مہم جاری رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس دوران حکومت پاکستان نے گلگت بلتستان کے

لئے کچھ مراعات کا بھی اعلان کیا لیکن یہ اصلاحات محاذ کے مطالبات کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھیں۔ مقبول بٹ نے 4 نومبر 1970ء کو راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ محاذ کی جدوجہد جاری رہے گی اور محاذ کے ارکان 5 نومبر کو دوبارہ گلگت جائیں گے۔ لیکن اگلے دن محاذ کے ایک اہم رکن عبدالخالق انصاری کو ایبٹ آباد میں حکومت پر تنقید کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا جس کی وجہ سے گلگت جانے کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا اور ایبٹ آباد میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا گیا۔ مجلس عاملہ کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ 15 تا 23 نومبر 1970ء کا ہفتہ ”ہفتہ گلگت جلتستان“ کے طور پر منایا جائے گا چنانچہ یہ ہفتہ پورے پاکستان اور آزاد کشمیر میں منایا گیا اور مختلف اہم مقامات پر محاذ کے لوگوں نے جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کیا۔ اسی ہفتہ کے دوران فیصلہ کیا گیا کہ محاذ کے نمبران پھر گلگت جائیں۔ چنانچہ 26 نومبر 1970ء کو گلگت میں جلسہ کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ یہ جلسہ منعقد کرنے کے لئے مقبول بٹ، میر عبدالمنان، امان اللہ خان، جی ایم میر اور بیروزادہ غلام مصطفیٰ علوی گلگت پہنچ گئے۔ گلگت پہنچ کر جو ی ای ان لوگوں نے جلسے کا شہر میں اعلان کرنا شروع کیا، گلگت انتظامیہ نے دفعہ 144 نافذ کر دی۔ ان لوگوں کو زیر دستی راولپنڈی واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ انہیں اتر پورٹ لے جایا گیا لیکن دیر ہو جانے کی وجہ سے جہاز ان کے اتر پورٹ پہنچنے سے پہلے ہی روانہ ہو گیا اور یہ لوگ گلگت میں رہ گئے۔ لوگوں کے ساتھ میل جول سے باز رکھنے کے لئے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے دن امان اللہ خان کے سوا سب لوگوں کو زیر دستی راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ (اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا تذکرہ امان اللہ صاحب نے اپنی کتاب ”جہد مسلسل“ میں تفصیل سے کیا ہے۔) محاذ رائے شماری نے اس طرح مقبول بٹ کی ولولہ انگیز قیادت میں بھرپور انداز میں ان تمام مسائل پر ایک جاندار آواز اٹھائی۔ مقبول بٹ کبھی کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان کے دو وصدارت میں محاذ رائے شماری بھرپور انداز میں سرگرم رہی۔

گنگا کا اغواء اور گنگا عدالتی کیس

محاذ رائے شماری کا صدر منتخب ہونے کے بعد مقبول بٹ کی ذمہ داریوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ محض سیاست میں حصہ لینے کے بجائے کشمیر کی آزادی کی باقاعدہ جنگ لڑنا چاہتے تھے، لہذا وہ اس سلسلے میں مسلسل مصروف عمل تھے۔ ایک طرف وہ محاذ رائے شماری کے پلیٹ فارم سے بھرپور انداز میں کشمیری عوام کے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے۔ گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کی حیثیت کے تعین کے لئے وہ سیاسی سطح پر غیر معمولی حد تک سرگرم تھے تو دوسری طرف وہ مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدوجہد کے سلسلے میں بدسر پیکار تھے۔ سرینگر جیل سے فرار اور آزاد کشمیر میں ان کی آمد کے بعد ان کی کوریڈر تنظیم این ایل ایف مقبوضہ کشمیر میں بدستور مسلح جدوجہد میں مصروف تھی اور مقبول بٹ این ایل ایف کے آپریشنل ونگ کے انچارج تھے۔

یہ وہ دور تھا جب فلسطین کی تحریک آزادی عروج پر تھی۔ فلسطینی مجاہد کوریڈر! جنگ کے ساتھ ساتھ دنیا کی نظروں میں مسئلہ فلسطین کو نمایاں رکھنے کے لئے مختلف قسم کی کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔ ان کارروائیوں میں سے ایک طیاروں کا اغواء بھی تھا۔ فلسطینی مجاہد اسرائیلی طیاروں کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے اور اس طرح اپنے بعض مطالبات منوالیتے تھے۔ مقبول بٹ فلسطین کی اس تحریک سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اس تحریک کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام اہم تحریک آزادی کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کی تحریک کو بھی جمود سے نکال کر دوسری تحریکوں کی طرح دنیا کی نظروں میں نمایاں مقام دلایا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ان تحریک کو مد نظر رکھتے ہوئے کوریڈر! جنگ اور دیگر کارروائیوں کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ این ایل ایف میں ان کے رفیق امان اللہ خان نے فلسطینی تحریک آزادی کی روشنی میں کشمیری نوجوانوں کو بیدار کرنے کے لئے دم الفتح اور کشمیری نوجوان نامی پمفلٹ تحریر کیا تھا جو مقبوضہ کشمیر میں تقسیم کیا گیا تھا۔ قومی محاذ آزادی میں

شامل چند افراد جو مقبول بٹ کے نظریات کے مطابق دشمن کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کو ضروری سمجھتے تھے اور اسے تحریک آزادی کا حصہ تصور کرتے تھے، نے 1970ء میں ایک طیارہ اغوا کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ اس مقصد کے لئے سرینگر سے پاکستان آئے ہوئے ایک نوجوان ہاشم قریشی کو مناسب اور ضروری تربیت دی گئی۔

ڈاکٹر فاروق حیدر جو این ایل ایف میں شامل تھے، کے برادر نسبتی جمشید منٹو نے انہیں تربیت دی۔ جمشید منٹو ہول بازی کا تجربہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان سے تربیت حاصل کرنے کے بعد ہاشم قریشی واپس مقبوضہ کشمیر چلے گئے۔ ہاشم قریشی نے کنٹرول لائن عبور کی تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس وجہ سے فوری طور پر یہ مشن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ پروگرام اگست 1970ء میں دوبارہ ترتیب دیا گیا جس میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئیں تھیں۔ اگست 1970ء میں تو یہ مشن کامیاب نہ ہو سکا البتہ چند ماہ بعد 31 جنوری 1971ء کو ہاشم قریشی نے ایک اور نوجوان اشرف قریشی کے ساتھ مل کر بھارت کا مسافر طیارہ ”گنگا“ اغوا کر لیا اور اسے لاہور لے آئے۔ لاہور میں طیارہ اتارنے کے بعد ان نوجوانوں نے اعلان کیا کہ طیارہ این ایل ایف نے اغوا کیا ہے۔ مقبول بٹ اس وقت راولپنڈی میں تھے۔ وہ ڈاکٹر فاروق حیدر کے ہمراہ فوراً لاہور پہنچے اور حکومتی اہلکاروں سے اس سلسلے میں بات چیت کی۔ چونکہ این ایل ایف پاکستان کے لئے زیادہ مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے ہاشم قریشی نے طیارے کے مسافروں کو رہا کر دیا، لیکن طیارہ بدستور اپنے قبضے میں رکھا۔ این ایل ایف کے ذمہ داران یہی چاہتے تھے کہ حکومت پاکستان ان کی تھوڑی بہت مدد کرے تاکہ وہ اس طیارے کے عوض مقبوضہ کشمیر میں قید اپنے کچھ ساتھیوں کو چھڑا سکیں۔ اس وقت پاکستان کی سیاسی صورتحال بہت پیچیدہ تھی۔ 1970ء کے انتخابات کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان واضح طور پر الگ الگ سیاسی دھڑوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل ہوئی تھی لیکن مجموعی طور پر شیخ مجیب کی عوامی لیگ کامیاب رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو اقتدار کے حصول کیلئے عجیب و غریب حرکات کر رہے تھے۔ جب انہوں نے طیارے کے اغوا کے متعلق سنا تو انہوں نے اس بارے میں سخت

روڈیہ اختیار کر لیا۔ اغوا کے ایک دن بعد لاہور پہنچے اور انہوں نے ہاشم قریشی اور اشرف قریشی سے ملاقات کی۔ انہیں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ دوسری طرف عوام کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے۔ عوام اڑپورٹ پر جمع ہو جاتے اور طیارے کی طرف جانے کی کوشش کرتے لیکن پولیس انہیں روک لیتی۔ اس عجیب اور الجھی ہوئی صورتحال میں ہوائی جہاز نذر آتش کر دیا گیا۔ ہاشم قریشی اور اشرف قریشی زخمی ہو گئے۔ این ایل ایف اپنے بڑے مقصد یعنی دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں تو کامیاب رہی لیکن بھارتی حکومت سے جہاز کے اغوا کے عوض کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ اور اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ پاکستانی حکومت اور سیاستدانوں کا رویہ تھا۔ ”گنگا“ کو اغوا کرنے والے حریت پسند طیارے کو آگ لگانے کی وجہ سے زخمی ہو گئے تھے۔ صحت یابی کے بعد پورے ملک میں ان لوگوں کا بھرپور خیر مقدم کیا گیا۔ لاہور میں 13 فروری کو تمام سیاسی جماعتوں کی طرف سے ان کا فقید المشال استقبال کیا گیا۔ مقبول بٹ نے اس موقع پر ایک انتہائی جذباتی تقریر کی۔ ان کے علاوہ پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر مبشر حسن، شیخ رشید وغیرہ نے بھی تقریریں کیں۔ دوسرے دن جب مقبول بٹ دیگر حریت پسندوں کے ساتھ کوثر انولہ پہنچے تو وہاں بھی ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اسی طرح راولپنڈی اور دیگر مقامات پر بھی ان لوگوں کا شاندار استقبال ہوا۔ این ایل ایف کے اس اقدام نے کشمیری قوم کے جذبات کو مہمیز کر دیا۔ کشمیریوں کے سونے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ”گنگا“ کے اغوا نے کشمیریوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ آزادی کی خاطر انہیں ہر راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ اسی جذبے کے تحت جب حریت پسندوں نے مقبول بٹ کی رفاقت میں مختلف علاقوں کا دورہ کیا تو ان کا بھرپور استقبال ہوا۔ اسے خوبی قسمت کہتے یا کچھ اور؟ ”گنگا“ کے اغوا کے وقت اور اس کے بعد تو ملک بھر میں این ایل ایف کے اس اقدام کو سراہا جاتا رہا۔ کچھ مفاد پرستوں نے تو یہ کارنامہ اپنے کھاتے میں ڈالنے کی سرتوڑ کوشش بھی کی۔ لیکن پاکستان کو سیاسی کشمکش اور انتشار میں مبتلا کرنے والے اُس وقت کے سیاست دانوں اور فوجی حکام نیز آزاد کشمیر میں اقتدار پر برہنہ لوگوں نے حریت پسندوں کے کارنامے کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا

شروع کر دیا۔ مارچ کے دوسرے ہفتے میں اغوا کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وزارت خارجہ نے اچانک تحقیقات کا اعلان کر دیا۔ ظاہر تاثر یہ دیا گیا کہ تحقیقات محض حکومت پاکستان کی پوزیشن واضح کرنے اور شیخ مجیب الرحمن کو مطمئن کرنے کے لئے ہے۔ تحقیقات کے لئے کراچی ہائی کورٹ کے ایک جج نور العارفین کا تقرر کیا گیا۔ اس تاثر کے برعکس تحقیقاتی کارروائی محاذ رائے شماری، این ایل ایف اور حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے شروع کی گئی۔ ابھی تحقیقاتی رپورٹ منظر عام پر ہی نہیں آئی تھی کہ 14 اپریل کو مری، راولپنڈی اور پشاور سے حریت پسندوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابتدائی گرفتار شدگان میں ہاشم قریشی، اشرف قریشی، ڈاکٹر فاروق حیدر، جاوید ساغر، مقبول بٹ اور کچھ دیگر لوگ شامل تھے۔ 20 اپریل کو تحقیقاتی رپورٹ سامنے آئی جس میں اغوا کے اس واقعے کو ”ہندوستانی سازش“ قرار دیا گیا۔

اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد 27 اپریل کو پورے ملک میں پکڑ دھکڑ اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حریت پسندوں کو بھارتی ایجنٹ قرار دینے کا پروپیگنڈہ عروج پر پہنچ گیا۔ تین ماہ پہلے کے قومی ہیرو مجرم اور غدار بن گئے۔ آزادی کے ان مجرموں کو ملک کے مختلف علاقوں سے گرفتار کر کے عقوبت خانوں میں پہنچا دیا گیا۔ زیادہ نمایاں کردار ادا کرنے والوں کو شاہی قلعہ لاہور کے بدنام زمانہ اذیت خانے میں لے جایا گیا اور اپریل 1971ء سے لے کر دسمبر 1971ء تک آزادی کے ان مسافروں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جاتے رہے۔ یہ لوگ کوئی جرائم پیشہ، غدار یا لٹیروں نہیں تھے۔ معاشرے کے معزز افراد تھے۔ باوقار شہری تھے۔ اپنی محنت و مشقت سے ان لوگوں نے معاشرے میں اپنا مقام بنایا تھا۔ اکثر لوگ کاروبار سے منسلک تھے۔ معاشرے کے ان معزز اور باوقار افراد کے ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اقتدار کی کرسی پر فروس حکمرانوں اور نوکر شاہی نے جو سلوک کیا وہ کشمیری قوم کی تاریخ کا المناک باب ہے۔ شاہی قلعہ لاہور کے دروید اور محشر تک ان بے گناہوں پر ہونے والے انسانیت سوز ظلم کو محسوس کرتے رہیں گے۔ آٹھ ماہ تک جبر و تشدد اور اذیت کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ چنانچہ 1971ء میں حکومت پاکستان بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے ان

گرفتار شدگان پر عدالت میں مقدمہ چلانے پر مجبور ہو گئی۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس یعقوب علی اور سندھ ہائی کورٹ کے جج عبدالقادر پر مشتمل خصوصی عدالت قائم ہوئی۔ اس عدالت کے اختیارات بھی محدود تھے۔ ابتداء میں تقریباً ڈیڑھ سو افراد پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد اس تعداد میں کمی کر دی گئی اور چھ افراد ہاشم قریشی، اشرف قریشی، مقبول بٹ، غلام محمد لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا، جبکہ باقی لوگوں کو بغیر مقدمے کے جیلوں میں محبوس رکھا گیا۔ رہا ہونے والے کچھ دوستوں نے ان حریت پسندوں کی قانونی مدد کے لئے کوششیں کیں۔ عبدالخالق انصاری، امان اللہ خان، میر ہدایت اللہ، پیرزادہ علوی، جی ایم میر، نسیم لون، غلام احمد بٹ، سعید شاہ مازکی اور بہت سے دوسرے لوگ اس سلسلے میں مصروف رہے۔ اعجاز بنالوی، عابد حسن منٹو، دوست محمد اعوان اور ڈاکٹر عبدالباسط نے ان لوگوں کی طرف سے وکالت کی۔ اس موقع پر آزادی کے ان مسافروں نے ایثار اور قربانی کے جذبات سے معمور ہو کر ایک دوسرے کی امداد کی اور ظلم کا شکار اپنے رفقاء کی بھرپور مدد کی۔ مقبول بٹ کے وکیل کی فیس غلام محمد لون کے بھائی غلام نبی لون ادا کرتے رہے اور یہ فیس تقریباً چار سو روپے روزانہ تھی۔ اس مقدمے میں مقبول بٹ سب سے نمایاں ملزم کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ جہاز انہوں نے خریدنے کی ذمہ داری این ایل ایف نے قبول کی تھی (این ایل ایف کی خفیہ تنظیم میں مقبول بٹ آپریشنل ونگ کے انچارج اور رابطے کے متعلق امور کے سربراہ تھے) محاذ رائے شماری کے صدر کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے بھی انہیں زیادہ نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت تک میجر امان اللہ خان این ایل ایف سے الگ ہو گئے تھے جبکہ این ایل ایف کے ایک اور اہم ممبر امان اللہ خان تقریباً دو ماہ پہلے گلگت میں گرفتار ہوئے تھے اور تاحال وہیں پر تھے۔ این ایل ایف کے دیگر ممبران ڈاکٹر فاروق حیدر، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مقبول بٹ نے چونکہ جہاز کے انہوں کے نور البعد کی صورتحال میں خاصا کام کیا تھا۔ پولیس اور حکومت سے گفتگو اور مذاکرات کا کام مقبول بٹ ہی کی سرکردگی میں ہوتا رہا۔ پھر عوامی رابطے کے دوران مقبول بٹ ہی زیادہ فعال رہے۔ ہائی جیکرز ہاشم اور اشرف کا پہلے سے مقبول بٹ سے تعلق قائم تھا

جبکہ دیگر انہیں زیا دہ نہیں جانتے تھے۔ اس لحاظ سے ”گنگا“ کے اغوا میں مقبول ہٹ کا کردار کلیدی تھا اور مقدمے میں بھی انہیں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ مقبول ہٹ پر اس مقدمے میں تعزیرات ہند کی دفعہ 120 اور آئینی ایکٹ مجریہ 1943ء کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ اس سے قبل 1966ء میں انہی دفعات کے تحت سرینگر میں بھارتی حکومت نے بھی مقبول ہٹ پر مقدمہ چلایا تھا۔ اس طرح پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں نے مقبول ہٹ پر انگریز کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت ایک جیسی دفعات میں مقدمے قائم کئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ بھارتی حکومت نے مقبول ہٹ کو سزائے موت دی لیکن پاکستان میں قائم عدالت نے مقبول ہٹ کو اس الزام سے بری کر دیا۔ اس تاریخی مقدمے میں مقبول ہٹ نے عدالت کے سامنے ایک تاریخی بیان دیا تھا۔ یہ بیان مقبول ہٹ کے طرز فکر، ان کی جدوجہد اور مقدمے کو سمجھنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

پاکستانی عدالت میں شہید بابائے قوم محمد مقبول ہٹ کا خطاب۔

”اے سوئے اتفاق کہنے یا حالات کی ستم ظریفی مجھے اس خاص عدالت کے سامنے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے اور ایک خاص حکم کے تحت مجھ پر چند ایسے الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا ہے جو نہ صرف بے بنیاد اور حقیقت سے بعید ہیں بلکہ اگر انہیں میرے وطن کی آزادی کے دشمنوں کے ذہن کی اختراع اور جموں کشمیر کے مصروف جدوجہد عوام کے ساتھ ایک ظالمانہ مذاق قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ملزموں کی صف میں کھڑا کرنے والے پاکستان کے حکمرانوں اور ان حالات کو کوائف کے متعلق جن کے تحت یہ مقدمہ معرض وجود میں لایا گیا ہے تاریخ اپنا فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ (اس وقت یگنی خان اور ایوب خان کی حکومتیں گر چکی تھیں) تاریخ کا یہ فیصلہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر مزید روشنی ڈالنے یا اس کی توضیح

کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس بین فیملے کی روشنی میں جب میں اس مقدمے اور اس کے تحت کی جانے والی کارروائی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے یک کونہ خوشی محسوس ہوتی ہے اور اس تمام کارروائی کو میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔ تاریخ کے اس فیملے نے ہمارے ہمارے مقابل گروہ منافقین کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ آئندہ نسلوں کو ہمارے تشخص کے بارے میں اب کوئی غلط فہمی نہ ہوگی اور یوں اس گروہ منافقین کے بارے میں قرآن کا ارشاد پورا ہو گیا۔ ”واذالقدر المذنبین امنوا قالوا امنوا واذا خلوا الى شیطانهم قالوا انا معكم انما نحن مستهزون“ (جب یہ منافق ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور جب اپنے دوستوں کے پاس جاتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ہم تو ان مومنوں سے مذاق کرتے ہیں)۔ اس گروہ نے مظلوم عوام کے ساتھ جو ظالمانہ مذاق روا رکھا تھا اس کی پاداش میں یہ کچھ ہونا چاہئے کہ وہ ایسی طغیانی میں گر جائیں جہاں ان کا فرار ناممکن ہو۔ میں نے یقیناً نہ تو خود کو کوئی سازش تیار کی اور نہ ہی سازشیوں کے کسی گروہ میں شامل رہا ہوں۔ میرا کردار ہمیشہ واضح اور غیر مبہم رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں فرسودگی، دولت پسندی، استحصال، ظلم، غلامی اور منافقت کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوا ہوں۔ استعماری نظام کا پروردہ پاکستانی حکمران طبقہ جس کی نمائندگی اس ملک کی نوکر شاہی اور فوجی آمریت کرتی رہی ہے اگر اسے سازش قرار دے تو مجھے یہ لازم درست تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں۔ میرے نزدیک یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں استحصال اور غلامی کے خلاف جب کوئی تحریک شروع کی گئی تو اسے دبانے کے لئے اقتدار و اختیار پر قابض روایتی حکمرانوں نے ہمیشہ قانون کی لغت کے اس لفظ جسے سازش کے نام سے پکارا جاتا ہے، کا سہارا لیا ہے۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم و دائم ہے کہ ظالم و مظلوم کی اس جنگ میں مال کا فتح مظلوم کی ہی ہوتی ہے اور ظلم کی عمارت مظلوم عوام کی انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں ہڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کی ستائش سے نفرت کی ہے تاہم اب جبکہ میرے پاک کردار کو غلط رنگ دینے کی دانستہ کوشش کی جا رہی ہے، مجھے یہ دعویٰ کرنے

پر مجبور ہونا پڑا ہے کہ میں نے زندگی کے ہر موڑ پر حق و انصاف کا ساتھ دیا ہے اور ظلم و استیصال کے خلاف مصروف جنگ عوام کی نہ صرف حمایت کی ہے بلکہ اس جنگ میں مظلوم عوام کا نقیب و مدعی رہا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے لئے یہ رول متعین کیا ہے۔ اس لئے کہ میں اسے انبیاء علیہم السلام کی سنت اور انقلازیوں کا شیوہ تصور کرتا ہوں۔ مجھے اس رول میں کامیابی اور اس پر فتح ہونے والی انسان فتح پر ہمیشہ کامل یقین رہا ہے۔

میں معزز عدالت کے نوٹس میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کو اس مقدمے میں بظاہر چھ اشخاص کو ملوث کیا گیا ہے مگر اس تمام کارروائی کا مقصد ہماری تحریک حریت کو کچلنا ہے اور اس کے مدعیوں کے راستے میں شدید قسم کی رکاوٹیں کھڑا کر کے انہیں راہ عمل ترک کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ پاکستان کی نوکر شاہی کے مقدمہ ساز دماغوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس امر سے قطع نظر کہ اس مقدمے کے انجام کے طور پر میرا اور میرے ساتھیوں کا مقدر خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جس اصل مقصد کو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس میں سوائے رسوائی و ناکامی کے انہیں کچھ نہیں ملے گا۔ آزادی کی قومی تحریکوں کو اگر عدالتی فیصلوں کی مدد سے روکا جاسکتا تو دنیا میں شاید ہی کوئی قوم آزاد ہوتی۔ اگر انسانی تہذیب و تمدن اور جمہوریت و آزادی کے ارتقاء کو مروجہ عدالتی یا انتظامی کارروائیوں سے ختم کرنا ممکن ہوتا تو آفریقہ آرم سے اب تک دنیا میں جتنے انقلابات رونما ہوئے ہیں، تاریخ میں ان کا ذکر تک نہ ملتا۔ انسانی فلاح اور آزادی کی تحریکوں سے متعلق فیصلے مروجہ عدالتوں میں نہیں بلکہ خود تاریخ کے ارتقائی عمل کی عدالت میں کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مروجہ عدالتیں بجائے خود اس نظام کی مرہون منت ہوتی ہیں جسے بدلنے کے لئے یہ تحریکیں جنم لیتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے عدالتی فیصلے تاریخی عمل کی روشنی میں بسا اوقات ناکارہ اور متروک قرار دیئے جاتے ہیں۔

میرے وطن اور اس میں بسنے والے نصف کروڑ کے لگ بھگ عوام کی آزادی کے خلاف آج تک جو سازشیں ہوئی ہیں ان کا تفصیلی جائزہ اس مختصر سے بیان میں نہیں ساسکتا۔ بہر حال سازشوں کے اس پہلو کو نمایاں کرنا ضروری ہے جس کے نتیجے میں یہ مقدمہ عدم سے وجود میں لایا گیا۔ کشمیری عوام کے

خلاف سازش کا یہ پہلو ہمارے اعلامیہ دشمنوں نے نہیں بلکہ ان کو تاہ اندیش اور بدخواہ دوستوں نے ترتیب دیا ہے جنہوں نے اس بدقسمت ملک کی قیادت پر اوجھے طریقوں سے قبضہ کر کے نہ صرف اس میں بسنے والے تیرہ کروڑ انسانوں کو طویل عرصے تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا بلکہ اپنی بساط اقتدار کو سہارا دینے کے سازشی عمل میں اس کے وجود کو بھی داؤ پر لگایا۔ ظاہر ہے ایسی قیادت جو خود اپنے عوام سے دشمنی اور غداری کی مرتکب ہوئی ہے ایک ایسی قوم کی دوست اور خیر خواہ کیونکر ثابت ہو سکتی ہے جو نوز غلامی سے چھٹکار پانے کے لئے مصروف جنگ ہو۔ مجھے یہ بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا کہ پاکستان کی برسر اقتدار قیادت نے گزشتہ پچیس برس کے دوران ہر مرحلے پر آزادی کشمیر کے مسئلے کو اپنی ہوس اقتدار کے لئے ایکسپلاٹ کیا ہے اور ملک کے کروڑوں عوام جنہیں کشمیر کی آزادی سے سچی لگن تھی اور اب بھی ہے، کے معصوم جذبات کا سہارا لے کر اپنی غیر مفصل قیادت کا سنگھاسن قائم رکھنے کے لئے اس مسئلے کو ناجائز طور پر استعمال کیا ہے۔ جب زمام اقتدار فوجی آمریت کے ہاتھوں میں آگئی تو اس سازش نے مزید بھیانک روپ دھار لیا اور اس کے منطقی انجام کے طور پر نہ صرف پاکستان اپنا اصل وجود کھو بیٹھا بلکہ عملاً ہماری تحریک آزادی اگر صدیوں نہیں تو برسوں پیچھے چلی گئی ہے۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ روزِ اوّل سے ہی ہماری تحریک اور اس ملک کی حکمران نوکر شاہی اور فوجی آمریت کے درمیان ایک قسم کا نگر او جاری رہا ہے۔ اس نگر او کا بنیادی سبب مقاصد اور طریق کار کا اختلاف ہے۔ ہم نے اپنے وطن کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا جو نظریہ پیش کیا، اس ملک کے فوجی حکمرانوں نے محض بدتمتی کے باعث اسے کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نظریے کی بنیاد پر کسی عملی تحریک کے ابھرنے میں ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ یہ موضوع اس قدر طویل ہے کہ ان تمام واقعات کی روشنی میں ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ تاہم یہ نوہت ابھی نہیں آئی تھی کہ مقاصد اور طریق کار کے اس اختلاف کو بنیاد بنا کر ہمیں وطن دشمن قرار دینے جانے کا فیصلہ کیا جاتا۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وطن دشمن قرار دینے جانے کا فیصلہ فوجی حکمرانوں نے عین اُس وقت کیا جب وہ

اپنے ناجائز اقتدار کو سہارا دینے اور اس ملک پر فوجی آمریت کی سیاہ رات کو طول دینے کی جہرمانہ کوشش کے سلسلے میں ایک سازشی ڈرامہ کا آخری سین تیار کر رہے تھے۔ یہ فروری 1971ء کا آخری ہفتہ تھا اور راولپنڈی کے ایوان صدر میں قابض فوجی آمروں کا ٹولہ پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی روکنے کیلئے اپنے منصوبے تیار کرنے میں مصروف تھے۔

اپنی تائیس سے لے کر 24 فروری 1971ء تک این ایل ایف کے بارے میں حکمرانوں کے کسی بھی حلقے کی جانب سے نہ تو کسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کی کارروائیوں جن میں لنگا ہائی جیکنگ کا واقعہ بھی شامل تھا کے متعلق یہ باور کرنے کی کوئی وجہ موجود تھی کہ ان کے پیچھے کوئی خفیہ مقصد کارفرما ہے۔ محولہ بالا سازش کی تکمیل کے لئے حکمران ٹولے نے این ایل ایف اور ہائی جیکنگ کو واقعہ کے اپنے عوام دشمن اور جمہوریت کش منصوبوں کا جواز پیدا کرنے کی خاطر چند غیر حقیقی اور بے بنیاد اسباب کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ 24 فروری 1971ء کو ہی ایوان صدر راولپنڈی سے اس سلسلے کی اولین ہدایات جاری کر دی گئیں۔ انٹرسرومرز انجینس بیورو کو حکم دیا گیا کہ وہ ہائی جیکنگ کے واقعہ کی تحقیق کرے، ساتھ ہی یہ ہدایات بھی دی گئیں کہ حریت پسندوں کو عوام اور پولیس سے دور رکھا جائے اور انہیں کسی خاموش مقام پر منتقل کیا جائے۔ جب ہم نے اس ہدایت کے پس منظر کے بارے میں دریافت کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ ملک ایک نازک بحران سے گزر رہا ہے اور شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ آئینی امور کے بارے میں جو آمیزش چلی آ رہی ہے، اسے حل کرنے کے لئے مغربی پاکستان میں سازگار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے فی الحال کشمیر کے بارے میں عوام کے جذبات کو ٹھنڈا رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ شیخ مجیب الرحمن چونکہ ہندوستان سے دو قی کے خواہشمند ہیں اس لئے وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ کسی بھی معاملے میں فی الوقت ہندوستان کے ساتھ کشیدگی کو ہوا دی جائے۔ محض اس جذبے کے تحت مبادا ہماری تحریک کے باعث پاکستان کا آئینی بحران سنگین صورت اختیار نہ کر جائے اور یوں ہماری نیت کے بارے میں شکوک پیدا نہ ہو جائیں ہم نے اس سلسلے میں تعاون کیا اور حریت پسندوں

کوراوپنڈی سے ماٹرو ڈیم منتقل کئے جانے پر رضامند ہو گئے۔

چند ہی روز بعد ایوان صدر سے قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس کے اٹواء کا اعلان کیا گیا اور یوں ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ملک کو درپیش آئینی بحران کی شدت میں اضافہ کیا گیا۔ سابق فوجی آمر کے اس اعلان کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں جو المناک واقعات پیش آئے انہیں برپا کرنے کا منصوبہ پہلے سے تیار کیا جا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیخ مجیب الرحمن کوراوپنڈی آکر سابق صدر کے ساتھ مذاکرات کی دعوت دی گئی اور جب اس نے دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو مارچ 1971ء کے دوسرے ہفتے میں ایوان صدر سے ایک اور اعلان جاری ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ سابق صدر شیخ مجیب سے مذاکرات کے لئے ڈھاکہ جانے والے ہیں۔ یحییٰ خان کے ڈھاکہ روانگی سے ایک روز قبل وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے اعلان کیا کہ ہائی کمیشن کے واقعہ کی عدالتی تحقیقات کرنی جائے گی۔ عدالتی تحقیقات کے اس فیصلے کے بارے میں جب ہم نے حکومت پاکستان کے متعلقہ حکام سے وضاحت چاہی تو ہمیں بتایا گیا کہ یحییٰ، مجیب مذاکرات میں ہائی کمیشن کے واقعہ کے بارے میں یقینی طور پر تبادلہ خیال ہوگا اور شیخ صاحب جہاز کے جائے جانے کے بارے میں تحقیقات کا مطالبہ کر چکے ہیں۔ اس لئے اس اعلان سے ڈھاکہ مذاکرات میں تلخی کا ایک پہلو ختم ہو جائے گا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے خلاف دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے اور بین الاقوامی شہری ہول بازی کی تنظیم کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے سرسری تحقیقات ضروری ہو گئی ہے۔ تاکہ عالمی سطح پر اس واقعہ میں پاکستان کے ملوث نہ ہونے کا ثبوت ہم پہنچایا جاسکے۔ ہمیں یہاں تک بتایا گیا کہ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو کمیشن قائم کیا جائے گا ورنہ شاید اس کی نوبت بھی نہ آئے۔

20 مارچ 1971ء کو عین اس وقت جبکہ ڈھاکہ میں یحییٰ، مجیب مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکے تھے اور فوجی حکمرانوں نے اپنی سازش کی بساط بچھا دی تھی اور صرف موزوں وقت کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مرکزی حکومت نے کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا، کمیشن کی شرائط کو جان بوجھ کر

خفیہ رکھا گیا اور متعلقہ حکام برابر یہی تاثر دیتے رہے کہ کمیشن ایک EyeWash ہے۔ 25 مارچ 1971ء کو یحییٰ خان کے اصل عزائم بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے اور مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع کر دی گئی۔ اس کے ٹھیک دو روز بعد 27 مارچ 1971ء کو تحقیقاتی کمیشن نے بھی کام شروع کر دیا۔ کمیشن میں شامل دو ارکان حکومت کے شعبہ ہائے سراغ رسانی سے تعلق رکھتے تھے جبکہ تیسرے رکن مسٹر راحت سعید چھتاری وزارت خارجہ کے نمائندے تھے۔ یہ وہی مسٹر چھتاری ہیں جن کو اس ملک کی پہلی عوامی حکومت نے شدید بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کے الزام کی بناء پر ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ واقعات کا تسلسل ظاہر کرتا ہے کہ مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے خلاف اس مقدمے کے سلسلے میں جو کارروائی کی گئی اس کے پیچھے ایک خاص مقصد کا فرما تھا، یہ مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں تھا کہ حکمران ٹولے نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کر کے ملک کو جس شدید خانہ جنگی سے دوچار کر دیا تھا اس کے لئے اپنی مرضی کے مطابق علاوہ دیگر اسباب کے ایک اور جواز پیدا کیا جائے۔ تحقیقاتی کمیشن نے حکمرانوں کی خواندہی کے مطابق ایک رپورٹ مرتب کر کے یہ مقصد پورا کر دیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کمیشن کی رپورٹ صدر کو پیش کئے جانے سے چھ روز قبل یعنی 14 اپریل کو ہی مجھے اور میرے دیگر ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور کمیشن کی رپورٹ کے منظر عام پر لائے جانے کے بعد ہماری تحریک کو ختم کرنے کے لئے دارو گیر کا جو سلسلہ شروع کیا گیا اس کے تصور سے ہی وحشت ہوتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اقتدار کے نشے میں دھت اور خود کو اس ملک کے سیاہ سفید کا مالک تصور کرنے والے حکمرانوں نے تاریخ کی اہل حقیقتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ قدرت کی تعزیریں بڑی سخت ہوا کرتی ہیں۔ حق کے مقابلے میں باطل کی قوتیں بظاہر کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں مال کار انہیں شکست ہوتی ہے اور سچائی اپنا وجود منو کر ہی رہتی ہے۔ قدرت نے جلد ہی اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ حکمران ٹولا جو اپنی سازشوں کی قربان گاہ پر ہمیں بھیجتا چڑھانے میں مصروف تھا، ہمارے مستقبل کو تار یک بنانے کی کوشش میں خود ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

حریت پسندی کا دعویٰ کرنا تو بڑا آسان ہے مگر اس راستے پر چلنے پر لڑنے کے لئے بڑی سی دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس راستے کے مسافروں کو زندگی کے ہر موڑ پر آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بعض آزمائشیں ایسی سخت ہوتی ہیں کہ بیگانے تو کیا اپنے بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن سے دستگیری کی توقع ہوتی ہے وہ نہ صرف دست کش ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے مفادات خصوصی کے پیش نظر رہزنوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جدوجہد کا میدان یقیناً ایک کسوٹی ہے جو حق کے علمبرداروں اور باطل پرستوں کو ہی نہیں بلکہ منافقین کو بھی اپنے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کے اس دور میں جو میں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر ایک جنگ کی سی کیفیت میں گزارا ہے، نہایت ہی کٹھن اور صبر آزمایا امتحانوں سے گزر رہا ہے۔ ایسے مراحل بھی آئے ہیں جب نہ صرف ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا بلکہ خود اپنی صلاحیتیں بھی جواب دہتی نظر آتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر صرف ایمان کی قوت اور ارادے کی پختگی ہی مقاصد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔

یقیناً یہ بات حریت پسندوں کے شایان شان نہیں کہ وہ راولپنڈی میں پیش آنے والی مشکلات اور آزمائشوں کے بارے میں گلہ گدار ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ آزمائشوں کے یہ ادوار حریت پسندانہ زندگی کا لازمی حصہ ہوتے ہیں اور انہیں خندہ پیشانی سے گلے لگانا ہی انقلابیوں کا شیوہ ہونا چاہئے۔ آزمائشیں، اور صعوبتیں ان کٹھن لمحوں کا ایک حصہ ہوتی ہیں جن کا حریت پسندوں کو ہر وقت سامنا رہتا ہے۔ حریت پسندانہ سرگرمیوں کی پاداش میں ان ابتلاؤں کے علاوہ ایک اور کٹھن مرحلہ سے بھی واسطہ پڑتا ہے جسے عرف عام میں تشدد کہا جاتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر تشدد کے تین ادوار سے گزرنا پڑا۔ یہ ادوار میری اسیری کے ان ایام پر مشتمل ہیں جن میں مجھے مقبوضہ کشمیر کے قابض حکام، آزاد کشمیر میں متعین ایف آئی یو کے گنپاؤ قسم کے فوجی انیسروں اور آخر میں لاہور کے رسوائے زمانہ اور دورغامی کی یادگار شاہی قلعہ کے پولیس انیسروں کی پوچھ گچھ اور تحقیقات کے دوران واسطہ پڑا۔ تشدد کے ہر دور کی داستان اس قدر طویل ہے کہ ہر ایک کی تفصیل اس مختصر بیان میں ہرگز نہیں سہج سکتی۔

البتہ ایک بنیادی حقیقت جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا یہ ہے کہ تینوں مقامات پر مجھ پر کئے جانے والے تشدد کے مقاصد بالکل مختلف قسم کے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں مجھ پر اس لئے تشدد کیا گیا کہ قابض حکام میری ذات اور تحریک کے بارے میں حقائق کی تلاش میں تھے۔ مظفر آباد کے ایف آئی یو والوں کو حقائق کی تلاش تو نہ تھی البتہ وہ پہلے سے قائم کئے گئے مغروضات کے بارے میں مجھ سے تائید/شہادت حاصل کرنا چاہتے تھے اور شاہی قلعہ لاہور کے گسٹاؤ مجھ سے صریحاً جھوٹ کہلوانا چاہتے تھے اور ایک طے شدہ سازشی منصوبے کی تکمیل کے لئے مجھ سے اپنی مرضی کے مطابق بیان دلوانا چاہتے تھے۔ یہ بات بھی اس ملک کے غاصب حکمران ٹولے کو یہ زیب دیتی تھی کہ اس کی انتظامی مشینری حقائق کو توڑ مروڑ کر خود ساختہ افسانوں کے لئے کردار گھڑنے کی جرمانہ سعی میں بھی انسانیت سوز وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتی تھی۔ وہ ظلم و سفاکی کے اس عمل میں اس حد تک جا پہنچی جہاں انسان کو اس کے ضمیر سے ہی محروم کر دیا جاتا ہے۔ لاہور کے شاہی قلعہ میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو جس بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اس کی چند تفصیل میرے دیگر ساتھیوں نے اپنے تحریری بیانات میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شاہی قلعے میں بہت کچھ ہوا اور درحقیقت بعض تفصیل اس قدر شرمناک ہیں کہ انہیں ضبط تحریر میں لانا ہی ممکن نہیں ہے۔ شاہی قلعہ کے دو ماہ پر مشتمل دور تشدد و ظلم کا فیصلہ میں نے یوم حساب پر اٹھا رکھا ہے۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ یہ معزز عدالت اس مقدمہ کے سلسلے میں میرے متعلق خواہ کیسا ہی فیصلہ کیوں نہ دے، بہر حال میری ذات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ میرے ان احساسات کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اس معزز عدالت کے ارکان کی دیانت کے بارے میں کوئی شبہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ استغاثہ نے میرے خلاف اپنے من گھڑت الزامات ثابت کرنے کے لئے فرضی واقعات کا جوتا ماما بنایا ہے ان کی حقیقت منظر عام پر لانے کے لئے میں موجودہ حالات میں کوئی کارروائی کرنے سے قاصر ہوں۔ فرضی واقعات کی یہ کہانی اگرچہ بجائے خود الف لیلاوی داستانوں سے زیادہ افسانوی معلوم ہوتی ہے تاہم استغاثہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے خلاف جو الزامات عائد کئے گئے ہیں ان کی حقیقت اس وقت تک منکشف

نہیں ہو سکتی جب تک میرا وطن جنگ بندی کی منحوس لکیر کے باعث دو ناقابل عبور حصوں میں منقسم رہے گا۔ تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ میرے وطن کے ان حق پر آزادی کا حقیقی سورج طلوع ہو کر رہے گا اور ہمارے دلوں پر کھنسی یہ منحوس لکیر مٹ کر رہے گی۔ جس وقت یہ صورت حال پیدا ہوگی تو میرے کردار کے بارے میں اصل حقائق خود بخود منظر عام پر آ جائیں گے۔ میرے ساتھ انصاف کشمیر کی تاریخ کی عدالت میں ہوگا۔ مجھ پر عائد کیا جانے والا ہندوستانی قابض حکام کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہوگا کہ میں نے پاکستانی ایجنٹ بن کر مقبوضہ کشمیر میں حکومت کا تختہ الٹنے کی مجرمانہ سازش کی تکمیل کے لئے وہاں قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہے اور پاکستانی نوکر شاہی کا یہ الزام بھی بے بنیاد ہوگا کہ میں نے ہندوستانی ایجنٹ بن کر ہائی جیکنگ جیسا حریت پسندانہ آپریشن کر لیا ہے۔ جو لوگ حریت پسندی کا شیوہ اختیار کرتے ہیں وہ انتہائی صبر آزما حالات میں بھی بے چین یا مضطرب نہیں ہوا کرتے۔ میں کامل سکون اور صبر و استقامت کے ساتھ اس معزز عدالت کے فیصلے کو سنوں گا۔ البتہ مجھے اس وقت کا انتظار رہے گا جب میں اپنا مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش کروں گا۔ یہ عدالت انشاء اللہ آزادی کی قضاء میں میرے اپنے وطن میں لگائی جائے گی۔ اس عدالت میں وہ تمام ریکارڈ اور گواہ پیش کئے جائیں گے جو میرے کردار سے وابستہ رہے ہیں۔ عدالت میرے ساتھ ضرور انصاف کرے گی کیونکہ اس عدالت کے سامنے جو گواہ پیش کئے جائیں گے اور جو ریکارڈ پیش ہوگا اس کی تیاری میں نہ تو سرینگر کے ”مہتاب باغ“ کے تفتیشی مرکز کا ہاتھ ہوگا اور نہ ہی مظفر آباد کے دلائی کیپ اور لاہور کے ”شہابی قلعہ“ کے حکام استغاثہ کی فرضی کہانیاں گھڑنے پر مامور ہوں گے۔ وہاں صرف اور صرف انصاف ہوگا اور بس۔ اس خصوصی عدالت نے استفسارات کے دوران مجھ سے ان احباب کے بارے میں وضاحت طلب کی تھی جن کی بناء پر ایف آئی یو سے میجر نصیر گل خٹک نے اپنی رپورٹ میں سرینگر جیل سے میرے فرار کو مشکوک قرار دیا تھا۔ عدالت میں دستاویزات کے معائنہ کے دوران ڈیراھ صوفیات پر مشتمل اس رپورٹ کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ رپورٹ نہ صرف حقائق کے بالکل منافی ہے بلکہ اگر اسے ایک کم فہم اور متعصب

فوجی انس کے متعصب ذہن کی پیداوار قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس رپورٹ کی بنیاد جن اسباب پر رکھی گئی ہے وہ تمام تر مغروصے ہیں اور ان کا اصل صورتحال سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ میں اس بیان میں اس اسباب پر مفصل بحث نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کام میرے معزز وکیل صفائی کا ہے۔ تاہم ایک بات جس نے کم از کم مجھے حیران کیا ہے کہ فوج کے اس بڑے نمائندہ ماہر سرانگرساں انس کو میرے فرار کی کہانی میں کچھ تضادات نظر آئے ہیں۔ فرار کی یہ کہانی اگرچہ ایک طویل داستان ہے تاہم میں نے اس کی تمام تر ضروری تفصیلات نہ صرف ایف آئی یو میں تحقیقات پر مامور حوالدار اور ایک صوبیدار کو بتائی تھیں بلکہ ایف آئی سی میں منتقل ہونے پر اس مرکز میں پوچھ گچھ کرنے والے انسروں کو لکھ دی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایف آئی یو کے حوالداروں کے پلے کچھ بھی نہ پر اور اپنی جان چھڑانے کے لئے پوچھ گچھ کے آخری روز انہوں نے ایک نائب صوبیدار کو میرے بیان کی تکمیل پر مامور کیا جس کو میں گھنٹوں اپنی کہانی Dictate کرانا رہا۔ ایف آئی سی میں بدست میری کہانی سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کی گئی۔ چھ ماہوں کے طویل عرصے میں فرار کی منصوبہ بندی اور اس کی تکمیل کے بارے میں مجھ پر شدید اور مفصل جرح ہوئی اور اس کے نتیجے میں جو کچھ منظر عام پر آیا وہ ایف آئی سی اور ریویو بورڈ کی رپورٹوں کی صورتحال میں اس عدالت کے سامنے ہے۔ مجھے فرار کے متعلق ان واقعات کو ایک مرتبہ چھ مضبوط تحریر میں لانا پڑا تا کہ میرے معزز وکیل صفائی استغاثہ کے ان گواہوں پر جرح کر سکیں جو میرے فرار کے متعلق اور پولیس کی فرضی کہانی کے مطابق بیان دینے اس عدالت میں حاضر ہوئے ہیں۔ یہ تحریر میں نے اپنے معزز وکیل صفائی جناب اعجاز حسین بٹالوی کے لئے بطور انسٹرکشن لکھی تھی۔ میں اسے من و عن عدالت کے سامنے توجہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس میں وہ تضادات کہیں بھی نظر نہیں آئے ہیں جو میجر خٹک کی سرانگرساں آنکھ کو دکھائی دیئے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کے فوجی سرانگرساں اداروں کے ریکارڈ میں ہر اس شخص کو سیاہ (Black) قرار دیا جاتا ہے جو ملک پر مسلط فوجی آمروں کی پالیسیوں اور طرز عمل سے اختلاف جیسے جرم کا مرتکب ہوا ہو۔ بعینہ ہر وہ شخص غدار اور دشمن کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا جو قومی معاملات میں

حکمران ٹولے کی منشاء اور مرضی سے ہٹ کر کسی دوسرے لائحہ عمل پر چل پڑا۔ مجھے میجر خٹک اور اس قبیل کے دیگر فوجی افسران پر رحم آتا ہے۔ غلط نتائج اخذ کرنے میں ان کا اپنا قصور کم اور ان پر مسلط پالیسی ساز جرنیلوں اور اس روایتی تربیت کا اثر زیادہ ہے جو نوآبادیاتی حکمرانوں سے ہماری فوج کو ورثے میں ملی ہے۔ روایتی فوجوں کے جرنیل یوں بھی مسلح عوامی جدوجہد کے نظریے سے پیر رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظریہ فوجی مقاصد کے حصول کے لئے اسلحہ کے استعمال پر فوجوں کی اجارہ داری ختم کرتا ہے۔ اور جرنل کیگی خان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ روایتی جرنیلوں کی حکومت نے حریت پسندوں کے مخالف عناصر سے ایسے گٹھ جوڑ کئے جو حریت پسندوں کے لئے مشکلات کا باعث بنے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ الجزائر، ویت نام، فلسطین اور افریقہ کی دوسری حریت پسند تنظیموں کو فوجی آمریت کے دور میں نہ صرف یہ کہ مناسب سرکاری پذیرائی حاصل نہ ہوئی بلکہ سرکاری پروپیگنڈہ مشینری تو انہیں ”چھاپہ مار“ تنظیموں کے نام سے عوام میں متعارف کرتی رہیں اور چھاپہ ماری کے تصور کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا کہ یہ اچھے اور سلیقہ مند سپاہیوں کا شعار نہیں بلکہ Gangster اور Desparado قسم کے پیشہ وارد اکوؤں اور رہزنوں کا شیوہ ہے۔ اپنی مخصوص ذہنی پرداخت کے باعث روایتی فوجیوں کا مسلح عوامی کے نظریے سے مطابق ممکن نہیں اور جب روایتی جرنیلوں کو سیاسی قیادت کے باعث مفادات خصوصی بھی حاصل ہوں تو ایسی صورتحال میں وہ انسانوں کی آزادی کے لئے چلائی جانے والی تحریکوں کو اپنا حریف اور دشمن تصور کرتی ہیں۔ پاکستان کا فوجی حکمران ٹولہ اپنے دور اقتدار میں کبھی بھی کشمیر میں عوامی طرز کی مسلح جدوجہد آزادی کا حامی نہیں رہا۔ اس ٹولے کو اس نظریے سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو سور کے گوشت سے۔ یہی وجہ ہے کہ 1965ء کی جنگ اپنے مقاصد کے اعتبار سے محض ایک ناکام کوشش ثابت ہوئی اور کشمیری عوام کے لئے انجام کار اس دستاویز غلامی پر منتج ہوئی جسے عرف عام میں معاہدہ تاشقند کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو زیر عتاب لائے جانے کی اصل وجہ فوجی حکمرانوں کی یہی بنیادی مناصبت ہے۔ استفسارات کے دوران میں مجھے ہدایت کی گئی کہ میں سروے

آف پاکستان کے جاری کردہ کسی بھی مفصل اور کلاسیفائیڈ نقشے سے اس راستے کی وضاحت کروں جو میں نے سرینگر جیل سے فرار کے بعد آزاد کشمیر کی سرحد تک اختیار کیا۔ یہ نقشہ فراہم نہیں کیا جاسکا لہذا مجھے ایک Unrestrained نقشے پر ہی اس راستے کا تعین کرنا پڑا۔ چونکہ اس نقشے پر ان تمام مقامات کو نہیں دکھایا جاسکا ہے جن سے دوران سفر میرا گزرا ہوا لہذا میں عدالت کی توجہ کے لئے از خود ایک نقشہ بنا کر پیش کرتا ہوں۔ اس میں درج تفصیلات اگر مقصود ہوں تو میری تجویز ہے کہ فوج کے محکمہ سرانفرسانی سے مفصل قسم کا ممنوعہ نقشہ کشمیر منگوا کر اس کی تصدیق کرائی جائے۔ میں نے اس نقشے میں سفر کی تفصیلات تاریخ واریان کی ہیں۔ سولہ روز کا یہ سفر میری زندگی کا تاریخی سفر تھا۔ اس دوران مجھے جن تجربات و مشاہدات سے گزرنا پڑا، میں انہیں اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہوں۔ جیل سے فرار کی تکمیل میں میرے ذہن کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ تائید ایز دی کا دخل بھی تھا۔ مگر سولہ روزہ سفر نے میرے ایمان اور اعتقاد کو جو جلا بخشی، جس والہانہ عقیدت اور محبت سے میرے وطن کے محکوم عوام نے میرے مشن کی تکمیل میں مجھ سے تعاون کیا اور قدم قدم پر میری دستگیری کی، اس کے گہرے نقوش میں اپنے دل و دماغ سے کبھی بھی نہیں مٹا سکتا۔ خلوص اور نیک نیتی کے جو مظاہرے اس دوران میں نے دیکھے ان کی روشنی میں میرا یہ یقین تازہ ہو گیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آزادی کا سورج طلوع ہو کر رہے گا اور غلامی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ مجھے محبت اور شکر کے وہ آنسو ہمیشہ یاد رہیں گے جو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف روانہ ہوتے وقت مجھے اور میرے ساتھیوں کو رخصت کرنے والوں کے معصوم چہروں پر قطار اندر قطار گرتے نظر آئے۔ قدرت یقیناً اس قدر بے رحم نہیں ہے کہ دلوں کی گہرائیوں سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں کو شرف قبولیت نہ بخشے۔ میں وہ رقت آمیز مناظر کبھی نہیں بھول سکتا جب وادی کشمیر میں آبا و اہل آخری بہتی سے میرے چند ہم وطنوں نے مجھے رخصت کیا۔ شام کے دھند لگے میں میرے مستقر پر موجود ان مقامی ساتھیوں اور دوستوں نے جس والہانہ عقیدت، ابدیدہ چہروں اور گلوگیر آوازوں کے ساتھ مجھے الوداع کہا میں اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ انہیں دعاؤں کا اثر تھا کہ میں دسمبر کی خون منجمد کردینے

والی سردی میں 13 ہزار فٹ بلند ناقابل عبور برف پوش پہاڑوں کو بے سروسامانی کی حالت میں پورے چھ روز مسلسل سفر کے دوران عبور کرتا ہوا اس عافیت گاہ میں پہنچ سکا جس کا نام ”آزاد کشمیر“ ہے۔ میرے ہم وطنوں نے لالچ اور سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر جس طرح مجھ سے تعاون کیا، ہماری قومی تحریک آزادی میں وہ روشنی کا بینار ثابت ہوگا اور آنے والی نسلیں اسے ایک قابل قدر نمونہ تصور کریں گی۔ یہ اس تعاون کا کرشمہ تھا کہ ہماری آزادی کی دشمن طاقتیں مجھے دوبارہ گرفتار نہ کر سکیں اور یوں عوامی تعاون کی مدد سے ہمارے خلاف دشمن کی جوابی کارروائی ناکام ہوگئی۔ استفسارات کے دوران مجھ سے نور العارفین کمیشن میں دیئے گئے میرے بیان کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا یہ بنیادی طور پر درست ہے۔ میں نے یہ بیان پہلی مرتبہ اس عدالت میں پڑھا اور جن نکات پر وضاحت اور تشریح کی ضرورت ہے میں نے ان کو خط کشیدہ کیا ہے۔ جب یہ بیان زیر بحث آئے گا، وضاحت پیش کر دی جائے گی۔ میں اب اس عدالت کا مزید وقت نہیں لینا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خصوصی عدالت جلد از جلد وہ فرض پورا کرے جو اسے خصوصی حکم کے تحت تفویض کیا گیا ہے۔ میرے لئے سوائے اس کے فی الوقت کوئی راستہ نہیں ہے کہ خود کو وقت کے بے رحم ہاتھوں کے سپرد کر دوں اور اس موقع کا انتظار کروں کہ جب تعصب، بدعتی، ظلم، استحصال اور مکر فریب کے بادل چھٹ جائیں گے اور حق و انصاف کی روشنی عام ہو جائے گی۔ اس موقع پر میرا اصل مقدمہ اس وقت کی عدالت میں پیش ہوگا اور میں انصاف کے لئے اپنے دست دراز کروں گا۔

اس مقدمہ کی سماعت دسمبر 1971ء میں شروع ہوئی۔ مقدمہ میں استغاثہ کی طرف سے 1984 کو اپنا پیش ہوئے جبکہ صفائی کے کو اہوں کی تعداد 1942 تھی۔ مقدمہ تقریباً ڈیڑھ سال تک چلتا رہا۔ مئی 1973ء کو اس کو فیصلہ سنایا گیا۔ فیصلے میں چار آدمیوں مقبول ہٹ، غلام محمد لون، میر عبد القیوم اور میر عبدالمنان کو باقی تمام الزامات سے بری کر دیا گیا البتہ بغیر لائسنس اسلحہ خریدنے اور مقبوضہ کشمیر بھیجنے کے جرم میں تاہم خاست عدالت سزا سنائی گئی اور اسی دن رہا کر دیا گیا۔ اشرف قریشی کو بری کر دیا گیا، صرف ایک ملزم ہاشم قریشی کو 14 سال کی سزا سنائی گئی۔ ہاشم قریشی کی سزا کے

خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی، اپیل کی سماعت کی باری آنے میں سات سال گزر گئے، باری آنے پر سپریم کورٹ نے ہاشم قریشی کو رہا کر دیا۔ یوں کشمیری حریت پسندوں پر چلائے جانے والے اس مقدمے کا انجام ہوا۔ ”گنگا“ کا مقدمہ تو ختم ہو گیا اور این ایل ایف اور محاذ رائے شماری کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کی حقیقت بھی ظاہر ہو گئی۔ عدالت نے آزادی کے ان متوالوں کو تمام الزامات سے بری کر دیا لیکن ان لوگوں کے خلاف چلائی جانے والی مہم اور اس مقدمے نے گہرے گھاؤ لگائے۔ قومی محاذ آزادی، جس نے ”گنگا“ کو اغوا کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی کو اس کے بعد بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ مقبول بٹ نے اسے محاذ رائے شماری کا عسکری ونگ قرار دیا تھا لیکن محاذ میں شامل لوگ مکمل طور پر اس کے حامی نہیں تھے۔ دوسری طرف مقبول بٹ کو 1970ء میں محاذ کا صدر بھی بنایا گیا تھا اس لئے یہ تنظیم الگ ہونے کے باوجود ایک ہی تنظیم کی صورت میں تھیں۔ مقدمے کے بعد مقبول بٹ نے محاذ میں کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے زیادہ توجہ این ایل ایف کی طرف مبذول رکھی اور اسے دوبارہ منظم کیا۔ البتہ محاذ کے ساتھ بھی ان کا تعلق حسب سابق رہا۔ ان کی جگہ عبدالخالق انصاری کو دوبارہ صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس دور میں مقبول بٹ این ایل ایف کو بھی منظم کرتے رہے اور محاذ کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھا، چنانچہ 1975ء کے انتخابات میں محاذ رائے شماری نے حصہ لینے کا فیصلہ کیا، اس وقت مقبول بٹ محاذ کے عہدیدار تو نہ تھے البتہ انہوں نے بھی محاذ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ یہ انتخابات چونکہ آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے تھے اور پیپلز پارٹی نے اس میں بھرپور دھاندلی کی تھی اس لئے مجموعی طور پر یہی پارٹی کامیاب ہوئی۔ محاذ رائے شماری کے تمام امیدوار بشمول مقبول بٹ ہار گئے۔ مقبول بٹ نے اگرچہ انتخابات میں حصہ لیا لیکن ان کی حقیقی توجہ این ایل ایف کو منظم کرنے پر تھی۔ اواخر 1975ء میں انہوں نے دوبارہ مقبوضہ کشمیر جا کر تنظیم کو وہاں منظم کرنے کا پروگرام ترتیب دیا۔ بعض ساتھیوں نے اس منصوبے کی مخالفت کی لیکن مقبول بٹ اپنے فیصلے پر اڑے رہے اور 1976ء میں وہ خفیہ طور پر مقبوضہ کشمیر چلے گئے اس دفعہ اس سفر میں ان کے ساتھ دونو جوان عبدالحمید بٹ اور ریاض ڈار تھے۔ بد قسمتی سے چند ضحیر

فروش ہمیشہ اس عظیم حریت پسند کے خلاف مصروف رہے۔ 1966ء میں بھی وہ ایک خبر کی وجہ سے گرفتار ہوئے تھے اور اب بھی جب انہوں نے کشمیر کے سینے پر کھینچی ہوئی لکیر عبور کی تو بھارتی ایجنسیوں کو اس کی اطلاع پہنچادی گئی۔ چنانچہ وہ مقبوضہ کشمیر میں پہنچنے کے تھوڑے عرصے بعد گرفتار ہو گئے۔ 18 جون 1976ء کو پاکستان میں مقبول بٹ کی گرفتاری کی خبر پہنچی، ان کے ساتھ حمید بٹ اور ریاض ڈار بھی گرفتار ہو گئے۔ بھارتی حکومت کو اپنا مغربی دباؤ مل گیا۔ اب کی بار بھارتی حکومت نے انتہائی سخت انتظامات کر رکھے تھے۔ انہیں جلد تہاڑ جیل دہلی منتقل کر دیا گیا۔ 1978ء میں بھارتی سپریم کورٹ نے مقبول بٹ کی سابقہ سزائے موت بحال کر دیا۔ سپریم کورٹ نے تو سزائے موت بحال کر دی تھی لیکن عوامی رد عمل کے ڈر سے بھارتی حکومت اس پر عمل درآمد نہیں کر رہی تھی۔ اس معاملے میں بھارتی حکومت نے کشمیریوں سے رائے بھی لی۔ بعض کشمیری لیڈروں نے سخت رد عمل کا عندیہ دیا جس کی وجہ سے حکومت مقبول بٹ کی سزا پر عمل سے گریز اس رہی اور اس سلسلے میں مناسب وقت کی منتظر رہی۔ 1981ء میں مقبول بٹ کو پھانسی کی کال کوٹری میں منتقل کر دیا گیا۔ مقبول بٹ نے سزائے موت کے خلاف اپیل کی تھی لیکن بھارتی حکومت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ حکومت حالات کا بغور جائزہ لیتی رہی۔ چنانچہ جنوری 1984ء تک اس ضمن میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا لیکن اس وقت بھارتی حکومت ہر قسم کے حالات کا بغور مشاہدہ کر چکی تھی اور مقبول بٹ کی پھانسی سے پیدا ہونے والے حالات سے بچنے کے لئے منصوبہ بندی بھی کر چکی تھی، چنانچہ جنوری 1984ء میں کابینہ کے ایک اجلاس میں مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا۔ حکومت نے تو مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا البتہ اس فیصلے پر عمل کے لئے آسانی ایک واقعے سے ہو گئی۔ 6 فروری 1984ء کو لندن میں ایک بھارتی سفارتکار مہاترے اغوا ہو گیا۔ اغوا کنندگان نے اپنا تعلق ”کشمیر لبریشن آرمی“ سے ظاہر کیا۔ اس تنظیم کا نام پہلی بار سنا گیا تھا دراصل یہ تنظیم لبریشن فرنٹ کے کچھ ممبران نے اپنے طور پر قائم کی تھی۔ بہر حال اغوا کنندگان نے 24 گھنٹوں کے اندر مقبول بٹ، حمید، ریاض اور بھارتی جیلوں میں قید دوسرے قیدیوں کی رہائی کا

مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ ایسا نہ کیا گیا تو مہاترے کو قتل کر دیا جائے گا۔ بھارتی حکومت اس سلسلے میں کسی مثبت رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی مہاترے کو رہا کرانے کے لئے کسی قسم کی بات چیت کی۔ کوئی مثبت جواب نہ ملنے اور 24 گھنٹے گزرنے کے بجائے 48 گھنٹے گزر گئے تو انخوا اکنندہ نے مہاترے کو قتل کر دیا۔ مہاترے قتل کے بعد بھارتی حکومت نے اعلان کیا مقبول بٹ کو 11 فروری کو پھانسی دے دی جائے گی۔ اس اعلان کے بعد اگرچہ کچھ کوششیں اور اپیلیں کی گئیں کہ انہیں سزائے موت نہ دی جائے لیکن حکومت نے ایسی اپیلوں کو مسترد کر دیا۔ بھارتی سپریم کورٹ نے ایک منٹ کے اندر اندر مقبول بٹ کی پھانسی کے خلاف دائر اپیل کو خارج کر دیا اور یوں مقبول بٹ کے عدالتی قتل کا راستہ کھول دیا گیا۔ مہاترے کے انخوا کے فوراً بعد مقبول بٹ سے ان کا سارا سامان چھین لیا گیا، حتیٰ کہ قرآن پاک اور جائے نماز بھی چھین لی گئی تھی۔ اگرچہ مقبول بٹ نے یہ دونوں چیزیں آخر وقت تک پاس رکھنے کی درخواست کی تھی لیکن اسے منظور نہیں کیا گیا۔ 11 فروری 1984ء کو کشمیر کے اس عظیم فرزند نے کال کوٹھری میں اپنی آخری نماز صبح کی اذان کے ساتھ ہی ادا کی اور بڑے عزم اور حوصلے سے خود چل کر تختہ دار تک پہنچے اور ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والی زندگی پائی۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات۔ بل احياء ولا کن لا تشعرون
(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ بلکہ وہ جڑو زندہ ہیں اور تم ہی شعور نہیں رکھتے)۔

آتا رہتا تھا اور گھنٹوں میرے پاس رہتا۔۔۔۔۔ ہماری دوستی ہائے نیلو والی نہ تھی، بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ ہمارے درمیان ضرور کوئی قدر مشترک تھی، جس کے باعث نہ چاہتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے کے پاس رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ قدر مشترک کیا تھی جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں اپنا کردار نبھاتی تھی۔۔۔۔۔ ہمیں معلوم نہ تھا۔ انسان کو اصل میں اپنے آئندہ آنے والے حالات کا کوئی علم نہیں ہوتا ہے۔ مستقبل میں اُسے کن مرحلوں سے گزرنا ہے، کن رجحانات کو قبول کرنا ہے، کس قسم کے کام انجام دینے ہیں؟!۔ حالات کے دھارے آہستہ آہستہ اُسے ان عوامل کی طرف لے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ قدرت نے اُس کے مزاج کو دراصل اُسی طرز کا بنایا ہوتا ہے، جس پر وہ آگے چل کر کام کرتا ہے۔ اس قسم کے مزاج، رجحانات اور رویے کو قدرت کے اُس نوشتہ تقدیر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جو انسان کے پیدا ہونے سے پہلے ہر کی طرح اس کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ ایک جیسی تقدیر پانے والے یہ لوگ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر مل جاتے ہیں۔ خواہ شعوری طور پر، خواہ اتفاقات و حادثات کے نتیجے میں۔۔۔۔۔ تجرباتی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ گنڈ ہم جنس با ہم جنس پرواز، کبوتر با کبوتر باز یا باز۔۔۔۔۔ ہم دونوں کو شاید قدرت نے سیاسی مزاج لے کر ہی دنیا میں بھیجا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس وقت ہمیں اپنے اس مزاج کا علم نہ تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں کبھی اپنے وطن سے دُور ہو جاؤں گا۔ نہ مقبول بٹ کو علم تھا کہ وہ اپنی چاچی اور بھتیجے کو لے کر پاکستان آئے گا۔ قدرت کا کھیل بھی نرالا ہے۔ کوئی انسان اپنے مزاج کے مطابق دنیا میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ کوئی گمنامی کی زندگی میں رہ کر اپنے مزاج کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی حالات کی بھیجٹ چڑھ کر موت کے مُہمہ میں چلا جاتا ہے۔ بارہمولہ میں میرے اور مقبول بٹ کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ پاکستان آ کر مجھے تلاش کرنا اس کیلئے ضروری تھا، جس کے نتیجے میں وہ مئی کے آخری یام میں مجھے ایبٹ آباد لے جانے کیلئے آیا تھا۔ میں اس نئی صورت حال سے برا خوش تھا۔ مجھے ایک تو گرمی کی پش

ستارے تھیں۔ دوسرے مقبول ہٹ سے ملنے کا اشتیاق زور پکڑنے لگا۔ اس دوران جیانی اور وانی بھی کمرے میں داخل ہو گئے، میں نے خان کا ان سے تعارف کرایا۔ تینوں آپس میں خندہ پیشانی سے ملے۔ خان نے ان کو میرے ایبٹ آباد جانے کا معاملہ بتا دیا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے مبارکباد دی۔ وانی نے کہا ”تجھے تیرے چاہنے والے یہاں بھی ڈھونڈ نکالنے آئے ہیں“

ایبٹ آباد میں رہتے ہوئے اگرچہ مجھے کافی عرصہ ہو گیا تھا تاہم اس عرصے میں مقبول ہٹ وہاں نہ آسکا۔ اسے غم روزگار نے پشاور میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے خطوط میں ایبٹ آباد آنے کی زبردست خواہش کا اظہار کرتا تھا لیکن وہ اپنی اس خواہش کو عمل کا لباس نہ پہنا سکا۔ میں خود بھی اس سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں اگست کے آخری ہفتے میں راولپنڈی کے تاج ہوٹل میں واپس آیا۔ اب گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے پھر ریڈیو سٹیشن جانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ میرے روز کے معمولات پھر ایک بار ماضی کی ڈگر پر واپس آ گئے۔ مجھے پھر ان دوستوں سے وابطلہ استوار ہو گیا جن کو میں ایبٹ آباد جاتے وقت راولپنڈی میں چھوڑ گیا تھا۔ سلسلہ روز و شب اپنے مدار پر رواں دواں تھا۔ اس دوران ہم تین ساتھیوں نے تاج ہوٹل کی ایک کھڑکی کے اوپر ’جموں و کشمیر پولیٹیکل کانفرنس‘ شاخ پاکستان“ کے نام سے ایک خوبصورت بورڈ بھی آویزاں کر دیا۔ اس طرح ہم نے پاکستان میں اپنے سیاسی کیریئر کو زندہ رکھنے کا سامان بھی پیدا کر لیا۔ کبھی کبھی راولپنڈی کے اخبارات میں مسئلہ کشمیر سے متعلق اپنے پریس نوٹ بھی شائع کراتے رہتے تاہم اپنی تنظیم کو وہاں کے کشمیریوں میں فروغ دینے میں ہم نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ ہم پاکستان میں موجود کشمیریوں میں انضمام پاکستان کے موقف کے لئے کام کرتے یا ان کو اپنی تنظیم میں شامل کرانے کے لئے کوئی جدوجہد کرتے۔ ہم محض پریس نوٹوں میں ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر میں ہونے والے مظالم کو اجاگر کرتے اور ان کے ذریعے اپنے سیاست کار ہونے کا احساس دیتے۔ آزاد کشمیر اور پاکستان میں مسلم کانفرنس ہی وہ واحد سیاسی پارٹی تھی جو آزاد کشمیر میں حکومت سازی کی سیاست سے دلچسپی رکھتی تھی، اس پارٹی کے قائدین بھی ہماری طرح کشمیر کی آزادی کے حق میں

بیانات دے کر اپنی سیاست کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ مسلم کانفرنس کے ان قائدین میں اقتدار کی رسہ کشی پہلے سے ہی شروع ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں اسپارٹی کے دو دھڑے بن گئے تھے۔ ایک گروپ کی قیادت سردار عبدالقیوم خان کر رہے تھے اور دوسرے حصے کی باگ ڈور سردار محمد ابراہیم خان کے ہاتھ میں تھی۔ اس صورتحال نے کشمیری مہاجرین کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ کچھ سردار عبدالقیوم خان کو اپنا پیشوا مان کر ان کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے، کچھ سردار محمد ابراہیم خان کے گرد ویدہ ہو کر ان کے ذریعے سیاسی فائدے حاصل میں کرنے میں مصروف تھے۔ ہمیں آزاد کشمیر اور پاکستان میں اس قسم کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم نے جموں و کشمیر کے دونوں طرف ایک جیسی سیاست کا فرما دیکھی۔ ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر میں نیشنل کانفرنس ہندوستان کی بھی خواہ بن کر حکومت کرتی ہے، پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں مسلم کانفرنس پاکستان کی بھی خواہ بن کر اقتدار کا مزہ لوٹ رہی ہے۔ ہماری تنظیم کا ایسا کوئی وجود موجود نہ تھا، جو اپنے وجود کا احساس دلا کر حکومت سازی کی سیاست میں حصہ لیتی، پاکستان میں سیاسی طور پر ہماری حیثیت نہ ہونے کے برابر بھی..... البتہ حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ اور امور داخلہ نے کشمیر پولیٹیکل کانفرنس کے نام سے مسئلہ کشمیر دنیا کے سامنے اُجاگر کرنے کے لئے دو ایک بار ہم تین ساتھیوں کا سہارا لیا۔

نومبر کے آخری ایام تھے، راولپنڈی کے موسم میں عام لوگ اب سوٹر اور کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ میں ہوٹل کے کمرے میں ریڈیو کے لئے سکرپٹ لکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے آواز دی ”ہاں اندر آئیے“۔ جب دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے، اُس وقت میری خوشی کی انتہاء نہ رہی، جب میں نے مقبول بٹ کو دروازے کی دہلیز پر مسکراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔ وہ آتے ہی مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب بھینچا۔ میں نے اُس کہا ”دیکھئے تقدیر ہمیں کہاں سے کہاں لے آئی ہے“۔ اُس نے جواب دیا ”تجھے تو تقدیر نے یہاں بھیج دیا ہے، میں اپنا فرض نبھانے یہاں آیا ہوں“۔ میں نے پوچھا ”کون سا فرض؟“ جواب دیا ”میرا چاہتا بہت پہلے پاکستان چلا آیا ہے اور چچی کئی برسوں سے ایک بچے

کے ساتھ ترہگام میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے بارہمولہ سے گریجویشن مکمل کر کے چچی کو پاکستان لانے کا پروگرام بنالیا۔ اللہ کا شکر ہے ہم سرحد پار کر کے سلامتی سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اب میں اپنے چچا اور چچی کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ میں نے تجھ سے ملنے کا بہت پروگرام بنائے۔ محمد مقبول خان کو تمہیں آبیٹ آباد لانے کا مشورہ بھی دیا تا کہ پشاور سے آبیٹ آباد آ کر تم سے ملتا لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کہ ہماری ملاقات نومبر سے پہلے ہوتی..... اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم کو جاؤ! وطن کر دیا گیا تھا اُس وقت راستے میں تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آیا تھا؟“۔ میں نے جواب دیا..... جو گزری سو گزری..... البتہ اللہ کا کرم ہے اس نے ہمیں بچالیا۔ ہمیں قدم قدم پر موت کے مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ برف کے بڑے بڑے پہاڑ ہمیں عبور کرنے پڑتے تھے۔ اچھا! تم بتاؤ سرحد پر تمہارا سفر کیسا رہا۔ تمہیں بھی زیر دست خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔“۔ اُس نے جواب دیا ”نہیں ہم نے صرف ایک دن میں سرحد پار کر لی۔ جب ہم ترہگام سے نکلے، موسم نہ صرف موافق تھا بلکہ بڑا ہی خوشگوار بھی تھا۔ مجھے سرحد پار کرنے کے لئے اچھے موسم کا انتظار کرنا پڑا تھا کہ میرے ساتھ چچی اور اس کا پانچ سالہ بیٹا تھا۔“۔ اب بتاؤ کہ پشاور میں کیا کرتے ہو؟ روزگار کا کوئی بندوبست ہو گیا ہے یا میری طرح آوارہ گردی میں مصروف ہو؟“۔ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”اللہ نے میرے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے، مجھے ملے گا۔ میں اگرچہ اپنے چاچا کے ساتھ رہتا ہوں لیکن گزر اوقات کے لئے میں پشاور کے روزنامہ ”انجام“ میں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے پشاور یونیورسٹی میں داخلہ بھی لیا ہے۔ دواڑھائی بجے کے بعد وہاں سے لوٹتا ہوں اور دن کے چار بجے کے بعد اخبار میں کام کرتا ہوں۔ ان باتوں کے درمیان میں نے کپڑے تبدیل کر لئے اور پھر دونوں کچھ کھانے کے لئے دلبر ہوٹل چلے گئے۔ مقبول کی وہاں بہت سے کشمیریوں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔

راولپنڈی میں قیام کے تیسرے روز ہم دونوں پشاور روانہ ہوئے۔ راستے میں نوشہرہ اور انک جیسے اہم پڑاؤ آئے۔ مقبول مجھے سفر کے دوران کو منٹری بھی سناتا تھا۔ جس سے مجھے صوبہ سرحد کے محل وقوع سے واقفیت بھی ہو رہی تھی، ہم تیسرے پہر پشاور کے تاریخی شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ پشاور شہر

صوبہ سرحد کا دار الخلافہ ہے اور تاریخ کے ہر دور میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس روز میں مقبول کے چچا سے ملا۔ وہ دبے پتلے جسم کا ایک پچپن سالہ شخص تھا۔ اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسا نرم خور اور سادگی کا پیکر جس سے نہ کسی کو نقصان پہنچ سکتا تھا اور نہ کسی کو مدد ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔ وہ محض اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا۔ مجھے دیکھ کر بس اتنا کہا ”واپس پنڈی نہیں جانا۔ اپنے بھائی کے ساتھ پشاور میں ہی رہنا۔ دونوں یہاں رہ کر خوش رہو گے“۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ میں نے اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ پشاور میں دوسرے روز مقبول نے مجھے چند کشمیریوں اور پشاور کے کچھ دوستوں سے ملایا۔ انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ سرینگر کے ایک تاجر نے ہم دونوں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ اس نے وضع وضع کے کھانے تیار کرائے تھے۔ وہ رات ہم تینوں نے گپ شپ میں گزاری۔ اس رات سرحد کے لوگوں کا رہن سہن، ان کی روایات، ان کے کھانے پینے کے طور طریقے اور عادات و اطوار زیر بحث رہے۔ برصغیر کے شب شہروں میں اگر چہ لپٹن چائے پینے کا رواج ہے لیکن صوبہ سرحد میں تو تہوہ پینے کا چلن ہے۔ یہاں کے بازاروں میں جگہ جگہ تہوہ خانے ہیں۔ یہاں کے چھوٹے اپنے بڑوں کو احترام سے لالہ کہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ لفظ کشمیر میں بھی بزرگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تیسرے روز مقبول مجھے پشاور یونیورسٹی لے گیا۔ وہاں بھی اُس نے مجھے اپنے دوستوں سے ملایا۔ اس دن کی شام کو وہ مجھے روزنامہ ”انجام“ کے دفتر پر لے گیا۔ وہاں کے سٹاف اور ایڈیٹر نے خوش مزاجی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ مجھے اس وقت تک اخباروں میں کام کرنے کا طور طریقہ معلوم نہ تھا۔ میں نے قدرے دلچسپی سے اخبار کے سٹاف کے کام کو دیکھنا شروع کیا۔ کام کے دوران مقبول نے اچانک میری جانب قومی سطح کا ایک انگریزی اخبار بڑھا دیا۔ اس میں ایک خبر کو خط کشیدہ کر دیا گیا تھا۔ مقبول نے مجھے اس خبر کو اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ میں نے کہا ”بھائی مجھے اخبار کا کوئی تجربہ نہیں ہے“۔ اس نے جواب دیا ”ریڈیو اور اخبار کے اسلوب میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے تم کوشش تو کرو“۔ میں نے ساری خبر کو پڑھ لیا اس کا سارا مفہوم اپنے ذہن میں سما دیا۔ لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کے بجائے اسے ایسے لکھا، جیسے وہ ترجمہ نہ لگے۔ میں

نے خبر کو مقبول کی جانب بڑھا دیا اور کہا کہ اب اس کی نوک پلک سیدھی کر لو۔ مقبول نے پوری خبر کو پڑھ لیا۔ قدرے توقف کے بعد کہا ”تم نے تو کمال کر دیا، خبر کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ جیسے ترجمہ نہ ہو بلکہ اردو میں ہی لکھا گیا کوئی واقعہ ہو۔“

دوسری صبح کو مقبول مجھے راولپنڈی جانے والی گاڑی میں الوداع کہہ رہا تھا۔ پاکستان میں مقبول اور میری ملاقات قدرت کی جانب سے ایسی سوغات تھی، جس پر ہم دونوں مازاں تھے۔ اب ہم مستقل طور پر ایک دوسرے سے اُسی طرح ملتے رہتے تھے جیسے کشمیر میں دو ایک ماہ کے بعد وہ ضرور بارہمولہ آتا اور مجھ سے ملے بغیر کبھی واپس نہیں جاتا تھا۔ ہم دونوں کی یہ ملاقاتیں محض دو دوستوں کی سی ہوتی تھیں۔ اُس وقت تک ابھی مقبول کے سیاسی خیالات سامنے نہیں آئے تھے اور نہ ہی نظریات میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ ہم دونوں پاکستان میں عام کشمیری مہاجرین کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔

پاکستان میں ہمارے یوں ہی ماہ و سال گزر رہے تھے۔ مقبول اور میرا رابطہ تقریباً ایک سال سے ٹوٹا ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سیاسی طور پر اس کے نظریات میں تبدیلی آئی ہے۔ وہ الحاق پاکستان کے برعکس ایک آزاد اور خود مختار ریاست کو مسئلہ کشمیر کا صحیح حل تصور کرتا ہے، اُس نے اپنے اس موقف سے پاکستان میں رہنے والے آسودہ حال کشمیریوں کو اپنا ہم نوا بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں اُس نے پشاور سے مظفر آباد اور میرپور کے بھی کئی دورے کئے تھے۔ اپنے اس موقف کو ابھی اس نے کوئی سیاسی نام نہیں دیا تھا۔ مجھے اس نے اپنے ان نئے نظریات سے بے خبر رکھا تھا۔ وہ مجھے الحاق پاکستان کا زبردست حامی سمجھتا تھا اس لئے اس نے دوستی اور سیاست کو علیحدہ رکھا تھا۔ مارچ کی ایک شام کو مقبول اچانک میرے فلیٹ کی بینک میں وارد ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ ہم دونوں گلے ملے، میں نے بڑی مدت کے بعد ملنے کا گلہ کیا۔ جواب دیا کہ مصروفیت کی وجہ سے راولپنڈی آنا قدرے محال ہو گیا تھا۔ آج تو آیا ہوں، سال بھر کی باتیں آج کی رات کریں گے۔ مقبول نے باتوں باتوں میں اپنے موقف کو میرے سامنے اشارتاً ظاہر کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا، جسے میں اُس وقت مجنوں کی بڑے سمجھ بیٹھا۔ دوسری صبح کو معمول کے خلاف بینک کے

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا کوئی جان پہچان کا آدمی ہوگا۔ میں اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے پاس میں نے ایک انجینی کو دیکھا۔ میں نے حیرت سے اسے پوچھا ”آپ کس سے“..... میرا جملہ پورا کرنے سے پہلے اُس نے پوچھا ”بٹ صاحب اندر ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں“۔ نوار چونکا۔ کسی طور کشمیری نہیں لگتا تھا، اس لئے میں نے پوچھا ”آپ کئی تعریف؟“ اُس نے جواب دیا ”مجھے رانا کہتے ہیں۔ میں آنی بی کا آدمی ہوں۔ بٹ صاحب کو پیغام دینا ہے“۔ میں نے ان کو اندر لایا اور مقبول سے ملایا..... اُس نے پھر اپنا پورا تعارف کر لیا اور آنے کا مقصد بھی بیان کیا۔ انلیجنس کے اس ہلکار کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ وزارت امور کشمیر کے ڈپٹی سیکریٹری میجر یوسف نے مقبول بٹ کو اپنے دفتر میں طلب کیا ہے۔ میجر یوسف قوم کے اعتبار سے پنجان تھا۔ بڑا عی خوش مزاج اور وسیع ذہن کا مالک تھا۔ میں ان سے کئی بار مل چکا تھا۔ مقبول بٹ نے رانا کو بتایا کہ وہ میجر سے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ملنے آئے گا۔ اپنے اس دوست کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔ جی، ایم مفتی اور اشرف اس وقت فلیٹ پر موجود نہ تھے۔ وہ دونوں مظفر آباد گئے تھے۔ ہم نے آنی بی کے اس ہلکار کو چائے پلا کر رخصت کر دیا۔ گیارہ بجے ہم دونوں نے باہر جانے کے لئے کپڑے تبدیل کئے۔ میں راستے میں مقبول سے کہا ”وزارت امور کشمیر کا یہ فسرتم سے کیا پوچھنے والا ہے..... وہ تو تم کو جانتا تک نہیں ہے۔ تمہارا پشاور سے میرے پاس آ کر ٹھہرنا صبح کوئی آنی بی ہلکار کا تمہاری تلاش میں ٹھیک میرے فلیٹ میں آنا..... یہ تو بڑا پراسرار لگتا ہے.....“۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ مقبول نے جواب دیا ”کیا چاہتا ہے وہ تجھ سے؟“ میں نے پھر پوچھا۔ ”یہ ایک ٹیڑھا معاملہ ہے، راستے میں اس پر بات کرنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ واپس آ کر اطمینان سے بات کریں گے۔ تمہیں خود سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اس جملے کے بعد دھیرے سے اس کے لب یہ شعر گنگنائے۔

بیڑیاں کس نے خیالات کو پہنائی ہیں کبھی نفعے بھی گرفتار ہوئے ہیں اے دوست
اس اثناء میں بس سٹاپ پر رکی۔ ہم بس میں سوار ہو گئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مقبول وزارت

امور کشمیر کے Receptionist کو اپنی آمد سے آگاہ کر رہا تھا۔ ریسپشنسٹ نے فون پر کسی سے رابطہ کیا۔ اسے مقبول اور میرے بارے میں اطلاع دی۔ کچھ وقفے کے بعد ہمیں اندر آنے کی اجازت دی گئی۔ ڈپٹی سیکریٹری مجھے مقبول کے ہمراہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ اس نے اپنی حیرانگی ظاہر کرنے سے پہلے مقبول بٹ کا والہانہ انداز میں خیر مقدم کیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا مقبول سے مصافحہ کیا اور اسے کرسی پر بٹھایا۔ مقبول نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور آفس میں طلب کرنے کی جہ پوچھی۔ میجر یوسف نے میز کے اوپر رکھی ہوئی ایک فائل کو اٹھایا۔ اس کی ورق گردانی شروع کی۔ فائل کو بند کر کے مقبول سے کہا: ”آپ کو معلوم ہے اس فائل میں کیا ہے؟“ میں نہیں سمجھا، مقبول نے جواب دیا۔ ”اس فائل میں آپ کی ساری زندگی کا ریکارڈ درج ہے۔ مقبوضہ کشمیر سے پاکستان آنے تک کی آپ کی تمام مصروفیات، خیالات، عادات و اطوار، کردار، رشتہ دار اور یار دوستوں کا سارا شمار ہے۔“ مقبول نے میجر سے پوچھا: ”جناب! میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ آپ مجھے کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟“ بٹ صاحب جہاں تک آپ کی فائل کا تعلق ہے اس میں اگرچہ آپ کی زندگی کا ہر گوشہ تحسین و آفرین کے قابل ہے تاہم آپ کا خود مختار کشمیر کا نظریہ حکومت پاکستان کے موقف کے خلاف ہے، جس نے آپ کی اس خوبصورت فائل کو ہماری نظروں میں گرد آلود کر دیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ پاکستان اور آزاد کشمیر کے کشمیری مہاجرین کے با اثر شخصیات کو اپنے نئے سیاسی فخرے کے حق میں تیار کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ آپ کے اس نظریے سے جہاں سیکورٹی کونسل کی پاس شدہ قراردادوں پر اثر پڑ سکتا ہے، وہاں کشمیری عوام بھی انتشار کا شکار ہو کر ایک نئے بحران سے دوچار ہو جائیں گے۔ کشمیریوں کے مفاد میں ہے کہ آپ وہ نظریہ ترک کر دیں۔ میں آپ کو دراصل یہی پیغام دینا چاہتا ہوں..... ماشاء اللہ! ہمیں علم ہے کہ آپ ایک اچھے اور سچے مسلمان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئے ہوں۔ باقی رہا آپ کے روزگار کا مسئلہ، میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ حکومت پاکستان وہ مسئلہ آپ کی خواہش کے مطابق حل کرے گی..... میں حیران ہوا کہ آپ کا دوست انضمام پاکستان تحریک چلانے کی پاداش میں جاؤ وطن کر دیا

گیا ہے اور آپ ایک ایسے نظریے کو جنم دے رہے ہیں جس سے آپ کے دوست کے جذبات کو بھی
بھیج سکتی ہے۔

مقبول ہٹ بڑی خاموشی سے میجر یوسف کی باتیں سن رہا تھا۔ اس دوران اس کے چہرے پر ایک ملکی
سی مسکراہٹ تاباں تھی اور ظاہر کر رہی تھی کہ اس کے اندر کا مقبول ہٹ کسی قسم کا اثر لینے کے لئے ہرگز
تیار نہیں۔ اس مینٹگ میں پہلی بار میجر یوسف نے مجھے مقبول ہٹ کے دوست کے طور پر پہچان لیا
تھا۔ اس طرح اُس نے خود ہی اپنی اُس حیرت کو دور کر دیا جو اس نے ہماری آمد کے موقع پر ظاہر کی
تھی۔ اچانک اس عالیشان کمرے کے دائیں بغل سے ایک دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ مقبول او
رمیری آنکھیں آواز کی جانب مرکوز ہو گئیں۔ دروازے کے اندر سے ایک ملازم نمودار ہو گیا، جس
کے ہاتھ میں بڑے تھے۔ بڑے کے اوپر کیتلی اور چند فغان قسم کے پیالے تھے۔ اس نے ہمارے
سامنے فغان رکھ دیئے اور ان میں تہوہ انڈیل دیا..... میجر یوسف نے اصل میں اپنے آفس میں تہوہ
کا انتظام کر رکھا تھا۔ اُس نے اپنے ملازم کو تہوہ لانے کا کب حکم دیا تھا، ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ مقبول
نے میجر یوسف کی تمام باتیں سن کر تہوے کی چسکی لیتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہنا شروع کیا
۔ ”ہمیں اپنی آزادی کی جنگ خود لڑنی ہوگی۔ یہی ایک صورت ہے جس کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جائے گا
۔ آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ہندوستان آپ کو وہ کشمیر سونے کی تشری میں پیش نہیں کرے گا
اور آپ یہ کشمیر ہندوستان کو تحفے میں نہیں دے سکتے۔ الحاق کی اصطلاح نے کشمیر کے مسئلے کو دونوں
ملکوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ ایک اسے اپنے ملک کا تاج کہتا ہے، دوسرا اسے اپنی شہہ
رگ قرار دیتا ہے، پھر آپ بتا دیجئے کہ مسئلہ کشمیر کیسے حل ہوگا..... برصغیر کی تقسیم دقومی نظریہ کے تحت
ہوئی تھی۔ سیاسیات کے جو کھیل کھیلے گئے، انہوں نے جو گڑھ کو دقومی نظریے کے تحت پاکستان
سے ملنے نہیں دیا اور نہ ریاست جموں و کشمیر کو ایک رہنے دیا۔ الحاق پاکستان یا الحاق ہندوستان کی
رٹ لگا، ایسے حالات میں ایک سعی لا حاصل ہے، جس نے نہ صرف کشمیری عوام کے مسائل
ومشکلات میں اضافہ کر دیا ہے بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان زبردست محاذ آرائی کا خطرہ

نظریات ایک جیسے تھے، آج جس طرح اُس نے مسئلہ کشمیر کو میجر یوسف کے سامنے پیش کیا تھا اُس نے مجھے حیران کر دیا۔ مقبول کے خیالات میں یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں نے اپنے فلیٹ میں جب مقبول سے رانا کی آمد کی وجہ پوچھی تو، اس وقت نے کہا ”چلو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا“۔ آج مجھے پہلی بار ایک ایسا نظریہ متعارف ہو رہا تھا، جس کا اظہار آج تک ریاست کے کسی سیاستدان نے نہیں کیا تھا بلکہ میرے ایک دوست نے کیا تھا، جس کے کردار پر کسی طرح بھی شک وشبہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جس کے خیالات کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی کسی لالچ کے عوض خرید نہیں سکتی تھی۔ جو کسی رد عمل کے نتیجے میں بھی اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ پھر یہ سیاسی کروٹ کیسے ظہور میں آئی تھی، جس کو مقبول نے اتر بارہا لسان اور تصدیق القلب کے ساتھ میجر یوسف کے سامنے بیان کیا تھا۔ میجر یوسف کے دفتر سے نکلنے وقت ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل میں کھایا۔ مقبول کو کسی کام کے سلسلے میں میرا پورا جانا تھا۔ میں نے اگرچہ اس کے سیاسی نظریات کی وجہ پوچھی تھی، تاہم اُس نے کہا کہ مجھے پہلے کام کرنے دو۔ ابھی میں پاکستان اور آزاد کشمیر میں رہنے والے دانشوروں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ابھی میں نے کوئی تنظیم نہیں بنائی ہے۔۔۔۔۔ اور وہ دو بجے کی گاڑی سے میرا پور کی جانب روانہ ہو رہا تھا۔

(جاء وطن از خالق پرویز)

شہید بابائے قوم سے متعلق ان کے ایک جیل ساتھی بابا رنجیت سنگھ کا بیان۔

عظمت وہ کہ جس کا اعتراف اپنے ہی نہیں غیر بھی کریں۔۔۔۔۔

بابا رنجیت سنگھ امرتسر کا لخت کے جتھے دار ہیں۔ وہ امرتسر کے ہی ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ 24 نومبر 1982ء کو گرفتار ہو کر وہ پہلی دسمبر کو دہلی کے تہاڑ جیل لائے گئے اور وہاں وارڈ نمبر ایک میں انہیں نظر بند کر دیا گیا جہاں پہلے سے ہی شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ موجود تھے۔ بابا رنجیت

سنگھ جوتا دم تحریر یام اسیری کاٹ رہے ہیں، نے ایک ملاقات میں فرمایا۔ ”میرے یہاں (تھاڑ جیل میں) آنے کے پہلے ہی روز دوپہر کے وقت ایک ملازم (وارڈن) جس کا نام بلیشور تھا آیا اور کہا کہ آپ کو خان صاحب یا فرما رہے ہیں۔ میں کافی تذبذب کا شکار ہوا اور ان کے پاس جانے کا قصد کیا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ چونکہ جیل میں پہلی دفعہ کسی اجنبی شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے فاصلہ کچھ نہیں تھا۔ مقبول بٹ صاحب نمبر ایک سیل میں مقیم تھے جبکہ میرے سیل کا نمبر چار تھا۔ جب میں ان کے روبرو حاضر ہوا تو یہ احساس ہوا کہ جیسے میں ان سے صدیوں سے واقف ہوں۔ عجیب پرکشش شخصیت تھی۔ باتوں میں خاص قسم کی کشش اور ملازمت تھی۔ کیا ہی حلیم اور سادہ لوح طبیعت پائی تھی۔ غرض کہ جو بھی ان سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ مقبول بٹ کا نام ہر خاص و عام نہایت عزت و احترام سے لینا تھا۔ بابا رنجیت سنگھ اس بات کی کوئی دیتے ہیں کہ مقبول بٹ شہید روحانی طاقت کے حامل تھے۔ بابا ان کی ذہانت اور دوراندیشی سے حد درجہ متاثر ہو کر ایک مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

”ایک روز پنجاب تحریک پر بات ہو رہی تھی کہ مقبول بٹ صاحب نے یکا یک کہا کہ اگر آپ لوگ متفق نہ رہو گے اور باہم اتفاق نہ رکھو گے تو نفاق کا فائدہ اٹھا کر یہ ظالم حکومت اپنی فوج لے کر آپ کے کولڈن ٹیپل پر یلغار کر دے گی۔ اس بات سے میں نے اتفاق نہیں کیا کیونکہ یہ بات میرے تو کیا کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی اور تصور سے بھی بالاتر تھی لیکن آئندہ پیش آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ شہید مقبول بٹ نے ایک حقیقی پیشین گوئی کی تھی۔ آج جب میں اپنی زندگی کے ان گزارے ہوئے لحاظ پر نظر ثانی کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ وہ شخص تو ہرن مولا تھا، جس کی باطنی شخصیت اتنی ہی سادہ تھی جتنا اس کا لباس، مگر وہ غیر معمولی شخصیت تھی اور ظاہری طور پر اس کا اندازہ بہت مشکل سے لگایا جاسکتا تھا، کیونکہ یہ شخصیت مستقبل میں جھانک کر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔“ بابا کہتے ہیں: ”کبھی کبھی مقبول بٹ صاحب کو دہلی ہائی کورٹ میں پیش کیا کرتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہیں کس مقدمہ میں پیش کرتے تھے۔ عدالت جاتے وقت بھی وہ ان ہی کپڑوں میں

ہوتے تھے۔ مجھے ان کی سادگی بہت پسند تھی پھر بھی ان کے لئے میں نے چند کپڑے منگوائے تاکہ عدالت جاتے وقت وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ مجھے پتہ تھا کہ ان کی ملاقات شاہ و مادر ہی آتی تھی۔ خبریں سننے کا ان کو خط کی حد تک شوق تھا۔ خصوصاً بی بی سی لندن، وکس آف امریکا۔ اور جرمن ریڈیو کی خبریں وہ بہت ہی انہماک سے سنا کرتے تھے۔ روزانہ انڈین ایکسپریس اخبار پڑھتے تھے اور کافی وقت اس پر صرف کرتے تھے پھر آخر کار وہ دن بھی قریب آ گیا جب وہ اس جہان فانی کو خیر باد کہہ کر ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ یہ کہتے ہوئے بابا کی آنکھیں پر نم ہو گئیں اور ان کا گلا رندھ گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ ماضی کے اندھے کنوئیں میں کھو گئے ہوں۔ بولے: ”آج جب وہ گزرتے ہوئے دن یاد آتے ہیں تو دل خون کے آنسو بہتا ہے۔ 8 فروری 1984ء کی صبح ریڈیو پر خبر آئی کہ لندن میں ہندوستانی سفیر کو اغوا کر لیا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی مقبول بٹ صاحب بے چین ہو گئے اور خاموشی سے ادھر ادھر ٹپکنے لگے۔ کافی دیر کے بعد میرے پاس آئے اور بولے دیکھو نجیت یا تو اس کو خالصتان والوں نے یا پھر کشمیریوں نے اٹھایا ہوگا۔ سارے دن اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی۔ اگلے روز 9 فروری 1984ء کو پورے جیل کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ صبح ہی صبح جیل ہلکا رہیں ”گڈ مارنگ“ کہنے آتے تھے۔ اس دن صبح اخبار بھی ملنا بند ہو گیا۔ ڈی اے پی (دہلی آرٹڈ پولیس) کے افراد ہمارے ساتھ کھیلا کرتے تھے مگر اس دن وہ پولیس والے بھی ہمارے پاس نہ آئے۔ ڈی جے (دہلی جیل) والے بھی ہم سے دور الگ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ غرض یہ کہ سارا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ میں نے مقبول بٹ صاحب سے دریافت کیا! بٹ، یہ کیا بات ہے، سب کچھ بدل سا گیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ کیا ہوا، جیل میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ چہار طرف خاموشی کی حکومت تھی۔ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد ایک سپاہی جس کا نام بلوان تھا اور جو کورٹ موقع پر ڈیوٹی دیتا تھا اندر آیا اور ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے اس سے رسماً دریافت کیا کہ بلوان! آج یہ جیل کی حالت کیسے تبدیل ہو گئی ہے۔ اس پر اس نے جواباً کہا کہ یہ کہتے ہوئے مجھے انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ مقبول بٹ صاحب کے لئے پھانسی کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میرے پاؤں تلے زمین

کھسک گئی لیکن انتہائی تعجب کی بات یہ تھی کہ بٹ صاحب کے چہرے پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ تھوڑی دیر بعد مقبول بٹ صاحب اپنی سیل میں گئے اور نماز پڑھنے لگے جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے سے نور برس رہا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ چھائی تھی۔ میں نے ان سے کہا ”بٹ صاحب! مجھے بتائیے کہ میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔ اس وقت اگر تمہیں کوئی خبر پہنچانی ہو یا کوئی خبر کہیں سے منگوانی ہو تو بتائیے۔“ ان کا جواب تھا ”کہاں خبر سمجھوں گا اور کس سے خبر منگواؤں گا مگر رنجیت مجھے اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ میں اپنے وطن عزیز کی خاطر کچھ نہ کر سکا۔ جانے میری مظلوم قوم کا کیا ہوگا۔“ پھر اسی شام کو ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مقبول بٹ صاحب کو وارڈنبر سولہ میں لے جایا گیا جہاں پھانسی کی کوٹھری واقع ہے۔ جیل حکام نے پہلے مقبول بٹ صاحب کا سارا سامان ضبط کر لیا۔ اسی دن ان سے ان کی آخری خواہش دریافت کی گئی۔ اس پر مقبول بٹ صاحب کے لبوں پر ہنسی آ گئی۔ وہ بولے ”آپ لوگ میری خواہش پوری تو نہیں کرو گے پھر بھی میں آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے وطن عزیز میں دفنایا جائے۔“ یہ غاصب حکومت ان کی آخری خواہش کو کہاں پورا کرتی۔ بہر حال 9 اور 10 فروری کے درمیان انہوں نے وارڈنبر سولہ میں گز ارے۔ بالآخر کشمیر کا یہ سورج تہاڑ جیل کے تختہ دار پہ ہنستے ہنستے غروب ہو گیا مگر اپنے وطن عزیز کی خاطر شہید ہونے والا یہ آفتاب کشمیر کے آسمان پر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ شہید مقبول بٹ ہمیشہ کے لئے اپنی یادیں ہمارے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں۔

شہید کی شخصیت اور طرز فکر پر ان کے رفیق کار جناب امان اللہ خان لکھتے ہیں۔

”میں جب مقبول بٹ شہید کے ساتھ بیس سال سے زائد مدت پر پہلی اپنی ذہنی اور سیاسی رفاقت کے دوران کے حالات و واقعات کی روشنی میں اسے انسانی عظمت کی ان انتہائی سخت کوششوں پر پرکھتا ہوں، تو وہ میرے سامنے عظمت کا ایک اونچا مینار نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً عظیم تھا۔ ۱۹۶۲ء میں ہونے والے آزاد کشمیر کے صدارتی انتخابات کے دوران صدارتی امیدوار کے۔ ایچ۔ خورشید کے حمایتی کی حیثیت سے مقبول بٹ کا نام اخبارات میں آتا رہا۔ اس کے بعد آزاد کشمیر اسٹیٹ کونسل کے لئے کراچی سے منتخب ہونے والے ممبر خولہ غلام محمد لون پشاور سے ہو کر کراچی پہنچے تو انہوں نے مجھ سے اور دوسرے احباب سے مقبول بٹ، ان کی تعلیم اور ان کی صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ کچھ مدت بعد میں پشاور گیا تو بٹ صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کی شخصیت میں ایک خاص کشش پائی۔ ایک ہی ملاقات کے بعد ہم ذہنی اور سیاسی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ انہوں نے کراچی سے شائع ہونے والے میرے ماہنامہ ”وائس آف کشمیر“ کے لئے مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا اور بھیجتے رہے۔ اپریل ۱۹۶۵ء میں سیالکوٹ میں ہونے والے محاذ رائے شماری کے پہلے کنونشن میں وہ اس کے مرکزی پبلسٹی سیکرٹری منتخب ہو گئے اور جب محاذ کے مرکزی عہدیداروں نے سوچیت گڑھ جاکر مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں لیکر حصول آزادی کے لئے جان تک کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرنے کا حلف اٹھایا تو بجز مقبول بٹ سب جذبات سے مغلوب زار و قطار رو رہے تھے لیکن مقبول بٹ کے چہرے پر جذباتیت کے بجائے سنجیدگی تھی۔ چیخ چیخ کر روتے ہوئے حلف اٹھانے والوں میں سے اکثر تو بعد میں اس عہد کو بھول گئے لیکن جذبات کی رو میں پہنچنے کے بجائے دل کی گہرائیوں سے اور انتہائی سنجیدگی سے حلف اٹھانے والے نے حلف کی لاج رکھی اور آخر میں حلف پر عمل کرتے ہوئے اپنی جان مادر وطن کی آزادی کی راہ پر قربانی کر دی۔ یہ قول فعل میں مکمل ہم آہنگی رکھنے والے عظیم انسانوں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ حلف اٹھانا

کوئی مشکل کام نہیں اس پر طرح عمل کرنا عظیم انسانوں کا ہی حصہ ہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو اعلان تاشقند کے مندرجات ریڈیو پاکستان اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے۔ اس روز بٹ صاحب کراچی میں میرے ہاں تھے۔ اعلان کے دوسرے ہی دن اس کے حق میں آزاد کشمیر کے لیڈروں کے بیانات اخبارات میں شائع ہوئے تو یہ بیانات پڑھ کر بٹ صاحب غصے سے لال پیلے ہو گئے اور کہنے لگے۔ ”جس قوم کو اس قسم کے لیڈر ملے ہوں اُس کی قسمت میں غلامی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ ذلتی مفادات اور حاکم وقت کو خوش کرنے کے لئے غلامی کے طوق کو آزادی کا بار گردانتے ہیں“۔ کچھ عملی مشکلات کی وجہ سے بٹ صاحب اور میجر امان اللہ کے مقبوضہ کشمیر جانے کے فیصلے پر چھ ماہ تک عمل نہ ہو سکا۔ مئی ۱۹۶۶ء میں بٹ صاحب کراچی آئے اور ان کے مقبوضہ کشمیر جانے کے پروگرام کو آخری شکل دی گئی اور فیصلہ ہوا کہ دونوں اوائل جون میں اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر مقبوضہ کشمیر جائیں۔ اس دوران گلگت کا ایک نڈر نو جوان اورنگزیب اور مظفر آباد کے ریٹائرڈ صوبیدار کالا خان ۱۹۶۷ء کی جنگ آزادی کے دوران بھارتی فوجوں کے لئے موت کا پیغام تصور کیے جاتے تھے بھی این۔ ایل۔ ایف میں شامل کئے گئے۔ بٹ صاحب کی کراچی سے روانگی کے دن میں انہیں الوداع کہنے کینٹ ریلوے اسٹیشن تک گیا۔ گاڑی کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ہم دونوں پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتے ہوئے پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ جوں جوں گاڑی کی روانگی کا وقت نزدیک ہو رہا تھا میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مقبول بٹ کے ہاتھوں تحریک آزادی میں دوبارہ جان پڑنے والی ہے۔ ساتھ ہی مجھے ان کی دو بیویوں اور تین بچوں (بٹی لٹنی ان دنوں صرف نو ماہ کی تھی جبکہ جاوید اور شوکت غالباً چھ اور چار سال کے) کا خیال آیا۔ اچانک غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ مقبول! تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہارے بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ ایسے موقعوں پر ایسے سوالات بڑے بڑوں کو تنزل کر دیتے ہیں۔ لیکن بٹ صاحب کے چہرے پر ان کی مخصوص مسکراہٹ اُٹھ آئی۔ آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے پلیٹ فارم کے

کنارے لے گئے اور دُور سے آتی ہوئی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”وہ گاڑی آ رہی ہے، عین ممکن ہے کہ اس کے ہمارے نزدیک پہنچتے ہی میں پلیٹ فارم سے پھسل کر پٹری پر گر جاؤں اور گاڑی میرے جسم کے ٹکڑے کرتے ہوئے آگے نکل جائے۔ یا ممکن ہے کہ کل کسی اور حادثے کا شکار ہو جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیمار ہو کر ہسپتالوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں۔ تینوں صورتوں میں بے مقصد موت مروں گا اور تینوں میں میرے بیوی بچوں کو کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کرنی ہی ہوگی۔ اس لئے کیوں نہ کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جاں دے دوں اور ہمارے لئے قومی آزادی سے بڑا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے سوال کا ایسا جواب مقبول جیسے عظیم انسانوں کی طرف سے ہی ہو سکتا ہے۔ کاش ایک کروڑ انسانوں پر مشتمل قوم صرف چند ہزار مقبول ”بٹ پیدا کرتی۔ صدیوں سے اس کے پاؤں میں پڑی غلامی کی زنجیروں اور گلے میں پڑے غلامی کے طوقوں سے نجات صدیوں یا عشروں کی نہیں سالوں کی بات ہوتی۔ غالباً وسط ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے بٹ صاحب کراچی میں تھے۔ ایک شام میرے دفتر میں بیٹھے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے شعبہ کالج کے تاریخ و سیاسیات کے لیکچررز غیر حاضر ہیں۔ میں نے مذاقاً بٹ صاحب سے کہا کہ وہ غیر حاضر لیکچررز کی کلاس لیں۔ بٹ صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اٹھے۔ کلرک سے غیر حاضر لیکچررز کا نام ٹیبل لیا اور کلاس میں چلے گئے۔ چھٹی کے بعد ہر اس کلاس کے طلباء کے فنڈ جسے بٹ صاحب نے پڑھایا تھا میرے دفتر آیا اور مجھ سے مطالبہ کرنے لگے کہ بٹ صاحب کو کالج میں مستقلاً لیکچرر مقرر کیا جائے۔ یہ بٹ صاحب کے اعلیٰ انداز تدبیر اور ان کی شخصیت کی جاذبیت کا نتیجہ تھا۔ ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ پاکستان کے مشہور تاریخ دان ڈاکٹر صدیق شاہین اور ان کی اہلیہ مرحومہ جو خود بھی پاکستان کی مشہور ادیب تھیں، بٹ صاحب کی دوسری اہلیہ کے بزرگوں میں سے ہیں اور بٹ صاحب کی بیٹی کو انہوں نے ہی پالا ہے۔ غالباً یہ ۱۹۷۰ء کے وسط کا واقعہ ہے کہ بٹ صاحب نے راولپنڈی میں مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صدیق شاہین سے ملنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں پاکستان کی مرکزی وزارت اطلاعات میں غالباً جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ ڈاکٹر

صاحب کے ہاں برصغیر کی تاریخ کے حوالے سے بحث چلی۔ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ ان کے تاریخی حوالے مجھے پہیلیاں دکھائی دینے لگیں۔ لیکن بٹ صاحب انتہائی گہرے تاریخی حوالوں سے ڈاکٹر صاحب کے استدلال کی تائید یا تردید کرتے رہے۔ تاریخ پر بٹ صاحب کی اتنی گہری نظر میرے لئے ایک بڑی خبر سے کم نہ تھی۔ ۱۹۷۰ء میں ہم تحریک کے سلسلے میں گلگت گئے۔ ان دنوں گلگت میں غیر معمولی سردی تھی۔ صبح نیند سے جاگے تو دیکھا کہ بٹ صاحب غائب تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا ایک عزیز آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ آپ کا دوست انسان ہے، یا جن، وہ اس وقت دریا میں نہ بستا پانی سے نہار ہا ہے۔ بٹ صاحب کی صفائی پسندی انہیں خطرناک مہم پسندی تک لے جاتی تھی۔ بھارتی جہاز لنگا کی ہائی جیکنگ کے سلسلے میں سوا دو سال کی اسیری کے دوران جب بھی وہ اپنے دوسرے اسیر ساتھیوں غلام محمد لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے ساتھ عدالت میں پیش ہوتے وہاں ان کا طرز عمل نہایت باوقار ہوتا۔ اپنی نشت پر انتہائی وقار کے ساتھ بیٹھتے اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے جس سے ان کے مجاہدانہ وقار پر حرف آنے کا احتمال ہو۔ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کے دوران (استغاثہ کے بہت سے گواہ بٹ صاحب کے قریبی چاہنے والے تھے) جب یہ کرائے کے گواہ بٹ صاحب اور ان کے ساتھیوں پر انتہائی سنگین قسم کے بے بنیاد الزامات لگاتے تو بٹ صاحب کے چہرے پر غصے کی بجائے ایک معنی خیز مسکراہٹ ہوتی۔ انہوں نے نہ تو کبھی جیل میں سہولتوں کی بھیک مانگی نہ جیل حکام کے غلط رویوں کا رونا رویا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کی سپریم کورٹ کے جج بھی بٹ صاحب کی باوقار شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ مئی ۱۹۷۳ء میں بٹ صاحب اور ان کے ساتھی لنگا کیس سے بری ہو گئے۔ البتہ ہاشم قریشی کو طویل سزا دی گئی تو میں اور بٹ صاحب ہاشم قریشی کی سزا کے خلاف اپیل دائر کرنے کے لئے لاہور میں ہی ٹھہرے۔ غالباً اسی دوران لاہور میں مقیم ہمارے ایک دوست خلیفہ عبدالمنان نے ہمیں اپنی ہٹ (hut) پر کھانے کیلئے مدعو کیا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی کچھ اور مقامی زعماء کے علاوہ پاکستان کے مشہور کالم نویس

م ش بھی آگئے۔ ڈیرہ گھنٹے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال ہوا۔ اس دوران م ش کی تجربہ کار نظروں نے مقبول بٹ کی عتابی نظروں کے پیچھے آزادی کشمیر کے لئے پائے جانے والے عزم مصمم کو بھانپ لیا تھا۔ تیسرے دن نوائے وقت کا کالم ”م ش کی ڈائری“ ہماری اس گفتگو کی تفصیلات اور اس کے تجزیے پر مشتمل تھا اور م ش نے آخری پشین کوئی کی تھی کہ مقبول بٹ کشمیر میں کوئی بڑا انقلاب لائے گا۔ گہری نظروں کے لئے مقبول بٹ کی انقلابی شخصیت کو پہچاننا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بٹ صاحب بڑوں کے ساتھ بڑے اور بچوں کے ساتھ بچے بنتے تھے۔ ڈاکٹر فاروق حیدر کے بچوں عز اومیزہ اور سلطان حیدر کے ساتھ کھیل کود ان کا مشغلہ تھا۔ البتہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کچھ مختلف تھا۔ اپنے بچوں جاوید، شوکت، اور لہنی کے ساتھ ان کے برتاؤ میں شفقت پداری کے ساتھ شیر کی نظر بھی شامل ہوتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو مساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کرتے رہے۔ غالباً انہیں آنے والے حالات کا پورا اندازہ تھا۔ ستمبر ۱۹۶۶ء اور مئی ۱۹۷۶ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں، جنوری ۱۹۶۹ء میں سرینگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر آنے پر کوجرہ قلعہ مظفر آباد میں اور اپریل ۱۹۷۱ء کے بعد کئی ماہ تک شاعی قلعہ لاہور میں بٹ صاحب جس بربریت کا نشانہ بنے اس کی تفصیلات دوسرے ذرائع سے جس شخص تک پہنچیں اس کے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ لیکن خود بٹ صاحب کے منہ سے یا قلم سے اس بارے میں ایک بات بھی نہیں نکلی۔ جب بھی کوئی پوچھتا کہ ان پر سری نگر مظفر آباد اور لاہور میں کیا گزری، وہ اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ موضوع ہی بدل دیتے۔ ”بیچ ہے عظیم انسان مقاصد کے لئے عظیم قربانیاں دے کر اور مصائب برداشت کر کے ان کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ مقبول بٹ اس سلسلے میں بھی عظیم تھا۔ ۱۱/ فروری ۱۹۸۳ء کو صبح سویرے جب بٹ صاحب کو تہاڑ جیل دہلی میں تختہ دار کی طرف لے جایا گیا تو وہ انتہائی سکون اور وقار کے ساتھ چل کر پھانسی کے پھندے تک پہنچے۔ پھانسی کی رسی کو چوما اور مادر وطن کی آزادی پر اپنے آپ کو قربان کر کے شہید ہو گئے۔

شہید بابا نے قوم محمد مقبول بٹ کے

خطبات پر لیس کانفرنسیں، انٹرویو اور افکار

مظفر آباد کنونشن محاذ رائے شماری ۱۹۶۹ء کے دوران شہید

بابا نے قوم محمد مقبول بٹ کا مقبول عام خطاب ۔

”ہمارا بنیادی فلسفہ جو ہے ۔۔۔ ہمارا بنیادی موقف جو ہے ۔۔۔ وہ یہ ہے کہ کوئی ہمیں اجازت دے یا نہ دے ہمیں اپنی آزادی کی جنگ خود ہی لڑنی ہوگی۔ کوئی ہمیں اجازت دے یا نہ دے۔ آپ اس کو ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ ہم نے اپنے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری لی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ خود لڑیں۔ اس کے لئے ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے حکومت پاکستان ہمیں اجازت نہ دے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں جس وقت ہم میدان میں اپنے عمل سے یہ ثابت کریں گے کہ ہم لوگوں میں وہ CAPACITY ہے۔ ہم لوگوں میں وہ استعداد ہے، ہم لوگوں میں وہ صلاحیت ہے کہ ہم اپنے وطن کی آزادی کی جنگ خود لڑ سکتے ہیں اور یہ جنگ لڑنے کا ہم نے مکمل اور مصمم ارادہ کیا ہے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ حکومت پاکستان اتنی بے وقوف ہوگی کہ ہمارے راستے میں رکاوٹ بنے گی۔ حکومت پاکستان آپ کو۔۔۔ آج تک یہ عام شکایت کی جاتی ہے کہ حکومت پاکستان کشمیریوں پر اعتماد نہیں کرتی۔ میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت کشمیر کے معاملے میں SINCERE نہیں ہے۔ وہاں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیریوں نے من حیث القوم۔۔۔ من حیث الجماعت۔۔۔ بحیثیت ایک پارٹی کے اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کا اپنے آپ کو آج تک اہل اہل ثابت نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے خود میدان میں مرنے مٹنے کے لئے تیار ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو تین مثالیں دیں گا۔ الجزائر میں جنگ آزادی شروع ہو گئی تو اس وقت تمام عرب ممالک میں ان کی مخالفت

تھی۔ اس لئے کہ یہ جنگ جو ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا PROCESS ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس کا گھڑلٹ چکا ہو وہی جنگ پر آمادہ ہوتا ہے۔ جس کا اپنا گھڑا من سے قائم ہو وہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کے گھر میں گڑ بڑ پیدا کی جائے۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے۔ اس لئے الجزائر کی جنگ جب شروع ہوئی تو خود عرب ملکوں نے ان کی حمایت نہیں کی۔ ان کی مخالفت کی بلکہ یوں بعض عرب ایسے بھی تھے جنہوں نے فرانس کی حمایت کی، الجزائر کے خلاف..... لیکن جب الجزائر میڈان عمل میں کود گئے۔ انہوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ عراق ان کی مدد کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے.... انہوں نے اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ مراکش کی حکومت انہیں پناہ دیتی ہے یا نہیں دیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم مرنے مارنے کے لئے آئے ہیں۔ چاہنے ہمیں کوئی مارو، ہمارے ساتھ دشمنی کرو، یا ہماری مدد کرو۔ جب وہ میڈان میں آ گئے تو وہی عرب جو ان کی مخالفت کرتے تھے، مجبور ہو گئے، اس بات پر کہ ان کی اطاعت کریں۔ ان کی مدد کریں اور ان کے لئے اپنے بجٹ میں فنڈز مقرر کریں۔ اس کے بعد تازہ مثال آپ کے سامنے الفتح کی ہے..... فلسطینیوں کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ الفتح والوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو تمام عرب ممالک نے ان کی مخالفت کی۔ مصر کے صدر ناصر نے ان کی مخالفت کی۔ اردن کے شاہ حسین نے ان کی مخالفت کی۔ لبنان نے ان کی مخالفت کی۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ الفتح کا صرف ایک سپاہی اسرائیل کی قید میں تھا اور اس کے مقابلے میں ان کے چار سو جانباز، ان کے چار سو مجاہد اردن کی..... عمان کی جیل میں پڑے ہوئے تھے..... لیکن جب کوئی قوم اٹھتی ہے تو یہ حکومتیں جو ہوتی ہیں یہ راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ کوئی قوم اپنی اُمنگ..... اپنی آزادی کی جنگ خود لڑنے کے لئے آمادہ ہو جائے اور اس کے لئے وہ میڈان میں کود جائے۔ اگر آپ میڈان میں کودتے ہیں، تو یہ ممکن ہے کہ آج آپ کو جیل میں رکھا جائے گا۔ آج دو آدمی جیل میں رکھے جائیں گے، کل دس آدمی اور پچاس آدمی رکھے جائیں گے۔ پھر سو ہوں گے پھر دو سو ہوں گے۔ دو سو آدمی جیل میں رکھنے کے باوجود اگر دس آدمی کود پڑنے کے لئے تیار ہو گئے تو حکومت

پاکستان مجبور ہوگی، اسوقت ہماری مدد کرنے پر۔ اس لئے ہم اپنی WORTH..... ہم اپنی قابلیت..... ہم اپنی صلاحیت..... ہم اپنی استطاعت ثابت کر چکے ہوں گے۔ میں آپ سے یہ عرض کروں گا۔ میں یقین کے ساتھ آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہم جب میدان میں اپنی صلاحیت ثابت کر دیں گے..... سٹیجوں پر نہیں..... تقریروں سے نہیں..... ریزولوشن پاس کرنے سے نہیں..... آپ کو غلط فہمی ہے کہ ریزولوشن پاس کرنے سے کوئی آپ پر اعتماد کرے گا۔ جب ہم میدان میں یہ ثابت کر دیں گے کہ ہاں ہم اس قابل ہیں کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ کو طویل سے طویل تر بنا سکتے ہیں، تو کوئی شک نہیں ہے مجھے اس بات میں کہ حکومت پاکستان اگر نہ بھی چاہے تو مجبور ہو کر.... دنیا کے دباؤ میں، اخلاقی دباؤ سے مجبور ہو کر.... اور خود پاکستانی عوام کے دباؤ سے مجبور ہو کر.... ہماری مدد کرنے کے لئے اور ساتھ دینے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔ میں آپ سے یہ عرض کروں گا اور صاف طور پر عرض کروں گا کہ کسی ملک کو جنگ میں اپنی مدد پر آمادہ کرنے کے لئے خالی خولی باتوں سے، REQUEST کرنے سے..... اجازت مانگنے سے..... بھیک مانگنے سے، آپ آمادہ نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ میدان جنگ میں کوئی نہیں پڑیں گے..... اچھی طرح سے سمجھ لیجئے تو مومن کا اصول یہی ہوتا ہے..... یہ سیدھی سی بات ہے۔ اگر یہ میرا مکان ہے، اگر میں اس مکان پر خود قبضہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ میرا ہمسایہ کبھی اس پر قبضہ کرنے میں میری مدد نہیں کرے گا۔ جب میں خود اس مکان میں گھس جاؤں گا۔ اس وقت میرا ہمسایہ مجبور ہو کر میری مدد کر سکتا ہے، لیکن جب تک میں خود ہی تیار نہیں ہوں۔ اپنی مانگوں پر خود ہی کھڑا نہیں ہوں۔ آپ کہتے ہیں جناب وہ کیسے ہوگا۔ آپ میدان میں کود جائیں۔ آپ عمل کے میدان میں آجائیں۔ پھر دیکھئے، آپ کی کوئی مدد کرتا ہے یا نہیں۔ اور یہ IDENTITY جو ہوتی ہے اس کے لئے سودا بازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری قوم جب متحد ہو کر میدان میں کود پڑے گی۔ میں کہتا ہوں پاکستان تو کیا دنیا کا ہر وہ ملک جس کو قوموں کی آزادی کا احترام ہے وہ آپ کی مدد کو تیار ہو جائے گا۔

سوال: آپ سے یہ سوال ہے کہ کشمیر کی جنگ آزادی لڑنے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ آپ یہ سرمایہ کہاں سے اور کس سے حاصل کریں گے۔ ذرا اس پر روشنی ڈالئے؟

جواب: سرمایہ کے بارے میں ایک سولی کیا گیا ہے۔ میں نے آپ کو پہلے عرض کیا ہے کہ آزادی کی جنگ جو ہے وہ ایسے لوگ نہیں لڑ سکتے ہیں جو بھیک مانگنے والے ہوں۔ جو مدد کے لئے درخواست کرنے والے ہوں۔ آزادی کی جنگ لڑنے والے جو لوگ ہوتے ہیں ان میں مومنانہ شان ہونی چاہیے۔ وہ صحیح معنوں میں مومن ہونے چاہیے۔ مومن کا جو معیار ہوتا ہے، ان کا معیار بالکل وہی ہونا چاہیے۔ اور مومن جو ہے، کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ ہمیں اپنا سرمایہ خود فراہم کرنا ہوگا۔ میں آپ کو یہ وضاحت سے بتاؤں گا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کی تحریک آزادی، پاکستان کے سرمایہ سے لڑی جاسکتی ہے تو آپ لوگ بھول میں مبتلا ہیں۔ یہ آپ کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ کشمیر کی آزادی کی جنگ، کشمیریوں کے ناموس کی جنگ ہے اور اس میں جو سرمایہ ہونا چاہیے، وہ کشمیریوں کا اپنا سرمایہ ہونا چاہیے۔ جب تک آپ اپنا سرمایہ فراہم نہیں کریں گے۔ دوسروں کے سرمایہ سے آزادی کی جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔ اس لئے کہ سرمایہ جو ہوتا ہے یہ لائف لائن LIFE LINE ہوتی ہے کسی تحریک کی۔ اگر آپ کی LIFE LINE اسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو جس وقت بھی وہ چاہے گا اس لائف لائن کو وہ کاٹ دے گا اور آپ جو ہیں میدان میں مفلوج ہو جائیں گے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی جنگ ہوئی۔ اس وقت بھی اگر پاکستان دوسرے ملکوں پر DEPENDENT نہ ہوتا تو شاید یہ جنگ طویل سے طویل تر ہو سکتی تھی۔ لیکن جس جنگی مشین کی لائف لائن ہی کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو وہ جنگ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہمارا فلسفہ یہ ہے، ہماری بنیاد یہ ہے کہ کشمیر کی آزادی کی جنگ میں جو سرمایہ صرف ہوگا، جس سامان کی ضرورت ہوگی، جس متاع کی ضرورت ہوگی، جس مال کی ضرورت ہوگی وہ ہم نے خود فراہم کرنا ہے۔ اپنے قوت بازو سے فراہم کرنا ہے۔ اور جب تک ہم تیار نہیں ہوں گے اس کے لئے، اس

وقت تک آزادی کی جنگ ہم نہیں لڑ سکتے۔ آزادی کا تصور جو ہے وہ ہمارے لئے عبث ہے، فضول ہے، ہم سمجھتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا کر دیں گے۔ ان میں وہی مسلمانوں والی شان پیدا کر دیں گے۔ مومنوں والی شان پیدا کر دیں گے۔ مجاہد جب میدان میں نکلتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ مجھے سرمایہ فراہم کرنے والا کوئی ہے کہ نہیں۔ میرے بال بچوں کو کوئی دیکھنے والا ہے یا نہیں ہے میرے کاروبار کو دیکھنے والا ہے یا نہیں ہے۔ وہ میدان میں جس مقصد کے لئے آتا ہے وہ اس وقت تک مصروف جدوجہد رہتا ہے جب تک اس کا مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ سب باتوں کی میں نے وضاحت کر دی ہے۔ اور سب سوال آگئے ہیں۔

سوال: کشمیر کے جو نو جوان کشمیر کی جنگ آزادی میں شامل ہونا چاہتے ہیں وہ کہاں رجوع کریں؟ کس کے پاس جائیں؟ کس سے بات کریں۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟

جواب: آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا پلیٹ فارم اس وقت محاذ رائے شماری ہے۔ محاذ رائے شماری دراصل ہماری پولیٹیکل موومنٹ (POLITICAL MOVEMENT) ہے۔ ہماری بیک (BACK) ہے۔ محاذ رائے شماری میں شامل ہو کر آپ اس تحریک کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جس طرح میں نے آپ سے پہلے عرض کیا کہ اس قسم کی تحریکیں پلانے کے لئے دو تین مرحلوں سے آگے گزرنے پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس تحریک کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس کے خفیہ فرائز کو سمجھے۔ اس کے FACTS کو سمجھے، اس کے جولو ازمات ہیں ان کو سمجھے۔ اس کے لئے آپ کے سامنے محاذ رائے شماری ہے۔ محاذ رائے شماری میں شامل ہو جائیے۔ جب آپ محاذ رائے شماری میں شامل ہوں گے۔ وہاں سے پھر آپ آگے بڑھتے جائیں گے۔ تو آگے آپ کو خود راستے ملیں گے۔ میں نے آپ سے پہلے عرض کیا ہے کہ محاذ میں آپ کا جذبہ و شوق پیدا کرنے کے لئے میں پشاور سے روز روز نہیں آؤں گا۔ اس لئے کہ میں کوئی پیشہ ور سیاستدان نہیں ہوں اور نہ مجھے اس قسم کے کسی آدمیوں سے کوئی ووٹوں کی توقع ہے۔ کہ میں نے کل وزیر بننا ہے۔ اس لئے میں روز روز آپ کے پیچھے پھروں گا۔ یہ بات آپ ذہن سے نکال دیجئے۔ محاذ جو ہے ایک

رضا کارانہ تنظیم ہے۔ اس میں وہی شخص آئے گا جس کے ذہن میں، جس کے دل میں وطن کی آزادی کی حرپ ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سیالکوٹ کے مقام پر

پریس کانفرنس

جموں کشمیر محاذ رائے شماری کا چوتھا سالانہ کنونشن نومبر ۱۹۶۹ء میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں جناب محمد مقبول بٹ کو اتفاق رائے سے محاذ رائے شماری کا مرکزی صدر منتخب کر لیا گیا۔ انہوں نے صدر منتخب ہونے کے بعد آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور محاذ کے نظریات کی وضاحت کی۔ اس دورہ میں محاذ کے مرکزی سیکرٹری جنرل جناب میر عبدالمنان بھی ان کے ہمراہ رہے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے سیالکوٹ کے مقام پر ایک پرچوم پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔ جس میں انہوں نے محاذ رائے شماری کے سیاسی فلسفہ حکمت عملی اور بنیادی نظریات، خاص طور پر آزادی کشمیر کے لئے عملی جدوجہد کے تقاضوں پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کانفرنس کی مکمل روئیداد پیش حسب ذیل ہے۔

حضرات!

آج کی اس ملاقات میں آپ سے دو باتوں پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ جو ہماری جماعت ہے محاذ رائے شماری.... جموں کشمیر محاذ رائے شماری اس کے مقاصد کیا ہیں۔ اس جماعت کا قیام اس لئے ہم نے عمل میں لایا ہے کہ ہماری قوم جو حق خود ارادیت سے محروم ہے، ہم سے جو وعدہ کیا گیا تھا حق خود ارادیت کا... اقوام متحدہ نے وعدہ کیا ہے.... ہندوستان اور پاکستان نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں حق خود ارادیت استعمال کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ تو ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی تحریک کے ذریعے، اپنی پورے کل جدوجہد کے ذریعے قوم میں اتنی بیداری پیدا کریں۔۔۔۔۔ ایسے حالات پیدا کریں کہ اقوام متحدہ اور ہندوستان کی تابض حکومتیں کشمیری

عوام کو ان کا غضب کیا ہوا حق خود ارادیت دینے پر مجبور ہو جائیں۔ بحیثیت ایک قوم کے ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اپنے ملک کا مستقبل جس طرح چاہیں بنائیں۔ بحیثیت ایک قوم کے کشمیریوں پر کوئی قید نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ ان پر کوئی پابندی نہیں ہوگی کہ تم نے یہ فیصلہ کرنا ہے یا وہ فیصلہ کرنا ہے بلکہ جب وہ وقت آئے گا۔۔۔ اس وقت ہماری یہ مرضی ہوگی۔ ہماری قوم کی مرضی ہوگی۔ من حیث القوم ہمارے عوام کی اکثریت کی مرضی ہوگی کہ جس قسم کا مستقبل۔۔۔ جو بھی مستقبل اپنی ریاست کے لئے، اپنے وطن کے لئے وہ مناسب سمجھتے ہیں، اسی طریقے پر اپنے ملک کا فیصلہ کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک ایسا وسیع مقصد ہے۔ یہ ایک ایسا وسیع پلیٹ فارم ہے جس پر برادریوں۔ مختلف برادریوں کے لوگ۔ مختلف عقائد والے لوگ۔ مختلف رنگ رکھنے والے لوگ اور مختلف چھوٹے نظریات میں بٹے ہوئے لوگ جمع ہو سکتے ہیں اور اس طرح ایک نیشنل پلیٹ فارم ہمارے لئے بن سکتا ہے اور اس قومی پلیٹ فارم سے ہم اپنی تحریک آزادی کو آگے چلا سکتے ہیں۔ اس قومی پلیٹ فارم سے ہم اپنی تحریک آزادی کو آگے چلا سکتے ہیں۔ اس قومی پلیٹ فارم کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے ہم اس نظریہ کو اپنائیں گے۔ دوسری چیز جو میں آپ سے عرض کروں گا وہ یہ کہ محاذ نے کافی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔ بلکہ ہم عمل بھی شروع کر چکے ہیں اس منصوبہ پر کہ یہاں ہماری آزادی کو قریب سے قریب تر لانے کے لئے سیاسی پلیٹ فارم پر..... پولیٹیکل پلیٹ فارم پر..... انٹرنیشنل پلیٹ فارم پر اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کا سوال ہے۔۔۔۔۔ وہ ہم کرتے رہیں۔۔۔۔۔ یہ ایک موثر ذریعہ ہے وطن کی آزادی حاصل کرنے کا۔۔۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں کوئی عملی اقدام بھی کرنا چاہئے اور عملی اقدام کے سلسلے میں ہم نے بہت پہلے کارروائی شروع کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ ہم کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوں گے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان جو ہماری ریاست کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہے۔ سیاسی طور پر ہمارے مقابلے میں جنگ ہار چکا ہے۔ اور اس وقت حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے اس حصہ پر ہندوستان صرف طاقت کے بل پر قابض ہے اور جب تک ہم اپنے اندر اتنی طاقت پیدا نہیں کریں گے کہ ہم

ہندوستان کی ARMED MIGHT کو۔۔۔۔۔ اس کی عسکری قوت کو، ہم ریاست میں نہیں
 نہیں نہیں کر لیتے۔ اس وقت تک ہماری آزادی کی منزل قریب نہیں ہو سکتی۔ اس میں ہمارا طریق
 کار جو ہے وہ بہت ہی موثر اور بہت واضح ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی قابض حکومت کو کسی علاقہ
 سے نکالنا، اس علاقہ کو خالی کرنا جس علاقہ پر اس نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس کے لئے کسی روایتی
 جنگ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ جب بھی کوئی دوسرا ملک اس قوم کی آزادی کی جنگ
 لڑتا ہے تو وہ جنگ فی الوقت آزادی کی جنگ نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ایک باقاعدہ
 CONVENTIONAL WAR (ایک روایتی جنگ) ہوتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ
 کشمیر میں کسی بھی روایتی جنگ، کسی بھی CONVENTIONAL WAR کے ذریعے ہم
 آزادی کی منزل نہیں حاصل کر سکتے۔ کشمیر میں اگر ہم نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا ہے تو وہ
 ایک عوامی مسلح جدوجہد ہونی چاہئے اور عوام کی مسلح جدوجہد کے ذریعے ہی ہم ہندوستان کی فوجی
 طاقت کو کشمیر میں اس حد تک کمزور کر سکتے ہیں۔ اور اس حد تک نیچے گرا سکتے ہیں کہ وہ ہماری آزادی
 کے حق کو تسلیم کرے۔ یہ ایک پیشہ ورانہ موضوع ہے اور میں اس سلسلے میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت
 نہیں لوں گا کیونکہ PEOPLES RESISTANCE MOVEMENT اور گوریلا وار اور اس قسم کے جو STRATEGIC اور PRACTICAL
 POINTS ہیں ان پر بحث کرنے کے لئے مہینوں درکار ہیں۔ ہر حال مختصر میں آپ سے یہ
 عرض کروں گا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک مقبوضہ کشمیر کے عوام کو مسلح نہ کیا جائے۔۔۔۔۔ جب تک
 مقبوضہ کشمیر کے عوام کو اس بات پر آمادہ نہ کیا جائے کہ وہ خود اٹھ کر ہندوستانی فوجوں کے خلاف
 لڑیں اور ان کے مقابلے پر خود کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت تک آزادی کی منزل قریب نہیں
 آ سکتی۔ ایک اور موضوع جس سلسلہ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے
 کہ ہم کسی قسم کی INFILTRATION کے بھی حامی نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وطن کی
 آزادی کے لئے ہم یہاں سے ہزاروں مجاہد اندر بھیجیں اور ان سے وہاں گڑبڑ کرائیں۔ اس قسم

کا کوئی منصوبہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم جس مسلح جدوجہد کی بات کرتے ہیں۔ محاذ کے سامنے جو پروگرام ہے وہ یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کا شہری جو ہے۔۔۔۔۔ وہاں کا باشندہ جو ہے۔ اسے ہندوستان کے خلاف آمادہ بغاوت کیا جائے۔ اسے مسلح کیا جائے۔ اسے تربیت دی جائے۔ اسے TRAIN کیا جائے۔ (تالیاں۔۔۔۔۔) ممکن ہے کہ آپ میں سے بعض لوگ یہ سوال کریں کہ INFILTRATION کیوں نہیں کیا جائے۔ یہاں سے مجاہد کیوں نہیں بھیجے جائیں۔ اس سلسلہ میں، میں آپ سے عرض کروں، ہمارے اس خیال کے پیچھے کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہم کسی پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں سے جو آدمی جائے اس پر ہم اعتماد نہیں کرتے۔ بات یہ ہے PRACTICAL POINT OF VIEWS سے۔۔۔۔۔ فن حرب کے نکتہ نگاہ سے، یہاں کا آدمی جو ہے کشمیر میں کام نہیں کر سکتا۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں بغاوت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سرحد سے اس طرف رہنے والے لوگ جو ہیں، وہ اگر کوئی کام کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے اسلحہ لے جائیں۔ وہاں DUMP کریں۔۔۔۔۔ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے ایک ماہر، ایک TRAINED آدمی جائے۔ وہاں اُن لوگوں کو تربیت دے۔ ان کو منظم کرنے میں، ان کو تربیت دینے میں وہ اپنا فرض انجام دے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں سے جا کر ایک آدمی اگر کشمیر میں لڑے گا تو آپ کی پوزیشن کشمیر میں بالکل ایسی ہی ہوگی جولدھیانہ کے موہن سنگھ کی یا دہلی کے چندر سنگھ کی ہو سکتی ہے، اس لئے کہ CLIMATIC CONDITION جو ہیں۔ آب و ہوا کے سلسلے میں، TERRAIN، جو بہت سارے عنصر جو WAR FARE میں INVOLVE ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان کا سپاہی جتنا ناقص ہے۔ اتنا ہی یہاں کا سپاہی ہے جو یہاں سے جائیگا۔ جو وہاں پر کام کرے گا۔ اس لئے ہماری بنیادی فلاسفی جو ہے، ہمارا بنیادی فلسفہ اور بنیادی نظر یہ جو ہے وہ یہ ہے کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے عوام کو بغاوت پر آمادہ کریں۔ ہم مقبوضہ کشمیر کے عوام کو مسلح کریں۔ ہم مقبوضہ کشمیر کے عوام کو تربیت دیں اور ہمارا رول یہ ہوگا کہ ہم ان کے لئے ایک مضبوط BACK کی حیثیت سے ان کے پیچھے

تائم رہیں اور مسلح جدوجہد کے سلسلہ کو آگے پلانے کے لئے انہیں جس قسم کی مدد ضرورت ہو۔۔۔۔۔ جو کچھ وہ ہم سے چاہیں، ہم سے طلب کریں۔ ہم ان کو یہاں سے دے سکیں۔ اس طرح آپ سے یہ عرض کروں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ بندی لائن کے اس طرف کے جو عوام ہیں وہاں ایک مضبوط بیک میں ہونے چاہیں۔ ایک مضبوط دیوار ہونی چاہیے اور مقبوضہ کشمیر کے لوگ جو ہیں وہ اس مسلح جدوجہد کا ہر اول دستہ ہونے چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی جماعت کے نظریہ کی وضاحت کر دی ہے اور اس بنیادی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارا جو مستقبل کا پروگرام ہے اس پر ہم نے عمل بھی شروع کیا ہے۔ اس کی بھی میں نے وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد آپ میں سے جو اصحاب سوال کرنا چاہیں، سوال کیجئے تاکہ میں آپ لوگوں کو جواب دے سکوں۔ میرے خیال میں سارے سوالات نوٹ کر لیں اور اس کے بعد آپ لوگوں کو جواب دوں۔ سوال: مقبوضہ کشمیر کا محاذ رائے شماری اور آپ کا محاذ ایک ہی ہے یا جدا جدا ہیں؟ نیز انکے نظریات ایک ہی ہیں یا کوئی فرق ہے؟ کیا وہ بھی اس قسم کے نظریات رکھتے ہیں جس طرح آپ کہہ رہے ہیں؟

سوال: کیا جو INFILTRATION کا تجربہ ہے، پاکستان کی طرف سے۔ یہ ناکام رہا ہے ۱۹۶۵ء کے دوران جنگ ستمبر میں؟

سوال: آپ نے اتحاد کا ذکر کیا ہے ایک پلیٹ فارم کے لئے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی آپ کو معلوم ہے کتنی جماعتوں نے اتحاد کیا۔ آپ کی جماعت کو کیا ان کی طرف سے دعوت دی گئی تھی؟ اور اگر دی گئی تھی تو آپ کا کیا جواب تھا؟

سوال: ۱۹۶۵ء میں دو قسم کے مجاہدین گئے تھے ایک وہ مجاہدین جن کے متعلق کہا گیا کہ یہ آزاد کشمیر کے مجاہدین ہیں اور اس کے بعد کچھ مجاہدین گئے تھے جن کے میر کارواں آپ تھے۔ دونوں سے آپ مطمئن ہیں؟ یا آپ ان کے علاوہ کوئی اور لائحہ عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ آپ اس سلسلہ میں کیا ٹھوس اقدامات کر رہے ہیں؟

سوال: وادی VALLEY میں محاذ رائے شماری نے ووٹ درج کرائے ہیں، آئندہ الیکشن کیلئے؟ یا اس کا بائیکاٹ کیا ہے؟

جواب: سب سے پہلے جو سوال ہم سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں کیا شہوں اقدامات کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں عرض کروں کہ مسلح جدوجہد جو ہے اس کا ایک فطری اور NATURAL طریق کار ہوتا ہے۔ ہم جس مسلح جدوجہد کی بات کر رہے ہیں۔ وہ کوئی فوجی بغاوت نہیں ہوتی ہے جسے ہم انگریزی میں (COUP-DE-TAT) کہتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہم مقبوضہ کشمیر میں پیراشوٹ کے ذریعے کوئی فوج اُتار رہے ہیں یا مقبوضہ کشمیر میں جو قابض ہندوستانی فوج ہے ان کے درمیان یا ان کے ذریعے کوئی انقلاب، کوئی بغاوت پیدا کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے POINT OF VIEW کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ہم جو چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے عوام کو ہندوستانی قابض فوج کے خلاف مسلح کاروائیوں کے لئے آمادہ کریں اور انہیں اس قدر مضبوط اور مستحکم کریں اور ان کے پاس اس قدر STORES پہنچائیں تاکہ وہ کھڑے ہو کر جب ہندوستانی فوج کے مقابلے میں لڑنا شروع کریں تو وہ ایک PROLONGED RESISTANCE MOVEMENT ہوئی چاہئے۔ اس لئے اس سلسلہ میں ابتدائی کاروائی کے لئے ہمارا جو ایک REVOLUTIONARY COMMAND ہے۔ یعنی ہمارا جو شعبہ اس سلسلہ میں تحقیق کرتا ہے اور اقدامات لیتا ہے۔ اس کو ہم نے پروگرام دیا ہوا ہے اور ان کے سامنے جو گائیڈ لائن دی ہوئی ہیں۔ ان گائیڈ لائنز کے اندر رہتے ہوئے وہ جو STEPS ضروری سمجھتے ہیں اٹھاتے ہیں۔ مثلاً جہاں وہ ضروری سمجھتے ہیں وہاں وہ اسلحہ بھیجتے ہیں جہاں وہ ضروری سمجھتے ہیں وہاں وہ آدمی بھیجتے ہیں۔ تربیت دینے کے لئے لوگوں کو۔ اور جہاں وہ ضروری سمجھتے ہیں وہاں اس قسم کا لٹرچر تقسیم کرتے ہیں، اس قسم کی کتابیں تقسیم کرتے ہیں۔ اس قسم کے پوسٹر تقسیم کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس سلسلہ میں EDUCATE کیا جائے کیونکہ یہ RESISTANCE

MOVEMENT جو ہوتی ہے ایک ہمہ گیر موومنٹ ہوتی ہے۔ ایک ہمہ گیر موومنٹ ہوتی ہے۔ اس میں شامل ہر سپاہی جو ہوتا ہے بجائے خود ایک پولیٹیکل سولجر ہوتا ہے۔ ایک سیاسی سولجر ہوتا ہے۔ ایک باشعور سولجر ہوتا ہے۔ وہ محض ایک تنخواہ دار ملازم نہیں ہوتا۔ جسے عرف عام میں MERCINERY کہتے ہیں۔ وہ مرسیزری نہیں ہوتا ہے۔ وہ کرائے کا سپاہی نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک CONCIENCE SOLIDER ہوتا ہے ہم CONCIENCE کی ایک پوری فورس قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہر شخص جو کہ ہماری اس مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں۔ جو بھی ہم نے اسکا نام رکھا ہے۔ اس میں شامل ہو جائے۔ جو بھی شامل ہو جائے اسے معلوم ہو کہ وہ کس کام کے لئے FIGHT کر رہا ہے۔ تاکہ اس فائٹ کو PROLONGE کرنے کے لئے اس کو PROTECT کرنے کے لئے، اس کو طویل سے طویل تر کرنے کے لئے اپنا کام انجام دے سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً ماحول میں ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پر ہم وہ چیز مہیا کر دیتے ہیں۔ جہاں ہمیں اسٹورز کی ضرورت پڑتی ہے وہاں ہم STORES بھیجتے ہیں۔ جہاں ہمیں تربیت کی ضرورت پڑتی ہے وہاں تربیت دیتے ہیں اور جہاں MASS EDUCATION کی ضرورت پڑتی ہے وہاں MASS EDUCATION کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ سوال CLEAR ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے۔ یہ محاذ رائے شماری جو اس طرف کام کر رہا ہے اور وہ محاذ رائے شماری جو اس طرف کام کر رہا ہے۔ جو مقبوضہ کشمیر میں کام کر رہا ہے۔ اس کے درمیان کیا فرق ہے؟۔ جہاں تک نظریات کا تعلق ہے۔ جہاں تک دونوں جماعتوں کی بنیادی پالیسی کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں ہم متفق ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کا محاذ رائے شماری جو ہے وہ بھی ریاست جموں و کشمیر کے عوام کو بغیر کسی تخصیص کے حق خود ارادیت دلانے کا حامی ہے اور دعویٰ ہے اور محاذ رائے شماری جو جنگ بندی لائن کے اس طرف قائم ہے وہ بھی عوام کو حق خود ارادیت دلانے کا حامی ہے مگر فرق جو اس محاذ اور اس محاذ میں ہے وہ ایسا ہے کہ اس طرف والا محاذ جو ہے

(ایک آواز)..... ”اصلی ہے“ (بٹ صاحب) ”ہاں اصلی ہے اور ہم بھی اصلی ہیں۔ انتظامی طور پر چونکہ مقبوضہ کشمیر میں حالات مختلف ہیں اور یہاں کے حالات مختلف ہیں۔ حالات۔ اسلئے ہمارے طریق کار میں تھوڑا DEVIATION ہے تھوڑا سا فرق ہے۔ بنیادی مقصد ہمارا ایک ہے کہ ہمارا فیصلہ کرنے کا حق تسلیم کیا جائے۔ یہ حق جب تک آپ جدوجہد نہیں کریں گے۔ کبھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسلئے پہلے ہم جدوجہد کر لیں۔ اس حق کو تسلیم کروالیں۔ اس کے بعد جب ہم اس کے مالک تسلیم کئے جائیں گے تو ہماری مرضی ہوگی کہ بحیثیت ایک قوم ہم اس کا فیصلہ کریں گے۔ سوال: آپ کی جماعت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستان سے الحاق کے مخالف ہیں۔ کیا آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

جواب: اس سلسلہ میں بعض شکوک و شبہات ضرور پیدا کیے جاتے ہیں۔ میں آپ سے یہ عرض کروں کہ قوموں کی زندگی میں تنگ نظری سے اور کوتاہ دامنی سے نہیں سوچنا چاہئے۔ ہماری جدوجہد چونکہ اس وقت جاری ہے۔ اسلئے ہماری دوستی کا جو تعین ہوگا۔ وہ بہت ہی نازک ہے۔ میں آپ سے عرض کروں۔ میں صاف صاف بات کرتا ہوں۔ میں ڈرتا اور تاکسی سے نہیں ہوں۔ نہ مجھ میں کوئی لاگ لپٹ ہے۔ اس سوال کے پیچھے ایک خاص ذہن کام کر رہا ہے اور وہ ذہن یہ چاہتا ہے کہ ہم تحریک شروع کرنے سے پہلے ہی الحاق پاکستان کا فخرہ کیوں نہیں لگاتے ہیں اس سلسلہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ اپنی پالیسی بیان کروں گا کہ ہمارے ساتھ الحاق دوستی اور دشمنی جو ہے وہ فیلڈ میں ثابت ہوگی۔ (تالیاں) جو طاقت فیلڈ میں ہمارے ساتھ تعاون کرے گی۔ فیلڈ میں جو طاقت ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر ہمارا مقصد حاصل کرنے میں مدد دے گی۔ فیلڈ میں جو طاقت ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر ہمارا مقصد حاصل کرنے میں ہماری مدد کرے گی۔ یقیناً ہم اتنے بے غیرت نہیں ہوں گے کہ اپنی منزل پر پہنچ کر اس کو دور سے سلام کریں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ دشمنی ہوگی تو وہ بھی اس مقصد کے حصول کے سلسلہ میں، جو ہم سے دشمنی کرے گا، ہم اس سے دشمنی کریں گے۔ یہ بات صاف ہے کشمیر کی آزادی کے سلسلہ میں جو فرد، جو گروہ

، جو جماعت جو طاقت، جو حکومت ہمارے ساتھ دشمنانہ رویہ اختیار کرے گی اس کے ساتھ ہم علی الاعلان دشمنی کریں گے۔ چاہے وہ ہمارا کوئی بھی ہو۔ وہ ہمارا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو طاقت اس سلسلہ میں ہماری اعانت کرے گی۔ ہمارے مدد کرے گی، ہمارے ساتھ چلے گی۔ ہم ہمیشہ اس کو وہی درجہ دیں گے، وہ سلوک کریں گے اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو کامریڈ ان آرمز COMRADE IN ARMS کا ہوتا ہے۔

سوال۔ پاکستان نے اس سلسلے میں آج تک کچھ دوستی کی ہے؟

جواب۔ بالکل دوستی کی ہے اور ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور ہم نے اسے دوست اور بھائی کا درجہ دیا ہے لیکن دوستی کا تعین اس راستے پر ہوگا۔۔۔۔۔ دوستی کا فیصلہ اس راستے پر ہوگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے کچھ حلقے چاہتے۔۔۔ کشمیر کی آزادی کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔ اور اس قسم کے حلقے پاکستان میں ضرور موجود ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کیونکہ میں خود اس فیلڈ سے گزر چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے پاکستان میں ایسے حلقے ضرور موجود ہیں جو کشمیر کی آزادی نہیں چاہتے اور خود ہمارے کشمیریوں میں کچھ ایسے حلقے موجود ہیں اور ایسے عناصر موجود ہیں جو کشمیر کو آزاد نہیں دیکھنا چاہتے۔۔۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ سبز فائز لائن ٹوٹے اور ریاست آزاد ہو جائے۔ لیکن ان عناصر کو ہم فتناء، فتنہ میدان میں ایکسپوز کریں گے۔ ہم ان کو فیلڈ میں EXPOSE کریں گے (تالیاں)

سوال: جناب! امیر اسوال ہے کہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ ہم مسلح جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اس کیلئے آپ دوسرے ممالک سے کوئی امداد حاصل کریں گے؟

جواب: میں آپ سے عرض کروں۔ ہماری بنیادی پالیسی ہے کہ ہم جب تک اپنے پاؤں پر خود کھڑے نہیں ہوں گے۔ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگیں گے۔ میں امداد کی بات کر رہا ہوں۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ ہم امداد کسی سے مانگیں۔ ہم امداد کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ ہماری بنیادی پالیسی یہ ہے کہ ہم اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جائیں۔ جب ہم اپنے پاؤں پر خود

کھڑے ہوں گے اس کے بعد ہر وہ طاقت، ہر وہ قوم، ہر وہ ملک جس میں انسانی آزادی کا کچھ بھی پاس ہوگا، جو انسانی آزادی کے سلسلے میں کچھ احترام رکھتی ہوگی وہ ضرور ہماری مدد کرے گی (تالیاں)۔ بنیادی چیز جو ہے میں آپ سے عرض کروں۔ ہم سب سے پہلے اپنی قوم میں ایک ایسا کریکٹر (CHARRACTER) پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایسا کردار پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پہاڑوں سے ٹکرائیں۔ ویسے عام طور پر ایسی باتیں جو ہوتی ہیں، جنوں کی باتیں ہوتی ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ جنوں پیدا ہو جائے، لوگوں میں یہ جنوں پیدا ہوگا اس کے بعد خود بخود دنیا کی ہر طاقت آپ کی مدد کرے گی۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے لیکن مدد کے لئے ہم پکاریں گے نہیں، کسی کی مدد میں خود بخود ملے گی اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ امداد جو ہوگی جو اس مرحلے پر ہمیں دی جائے گی وہ صحیح معنوں میں امداد ہوگی وہ UNCONDITIONAL امداد ہوگی۔ اس کیساتھ کوئی SITRINGS POLITICAL نہیں ہوں گے۔ UNSTRINGED امداد ہم ضرور چاہیں گے اور وہ ملے گی۔ وہ امداد جب ملے گی جب ہم میدان میں کھڑے ہوں گے۔ ادھر چوک میں کھڑے ہو کر تقریر میں آپ دنیا سے کہیں کہ میری مدد کیجئے، آپ کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ آپ کی یہ بہت بڑی بھول ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ میں جب میدان میں لڑ رہا ہوں گا۔ جب میرے ہاتھ میں ایل۔ ایم۔ جی۔ LMG ہوگا اور میں دشمن کے مقابلے میں ہوں گا۔ اس وقت میں جب کہوں گا کہ اس وقت مجھے ایمپونیشن AMMUNITION کی ضرورت ہے تو ہر طاقت مجھے امداد دے گی۔

سوال: صاحب! بات یہ ہے کہ خورشید صاحب کہتے ہیں کہ اگر پاکستان گورنمنٹ ہماری حکومت کو آزاد کشمیر حکومت تسلیم کر لے تو ہم اپنے وطن کی آزادی کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ کیا آپ اس چیز کو درست سمجھتے ہیں جو ان کا نظریہ ہے؟

جواب: ۱۹۶۲ء میں پشاور یونیورسٹی کے لاء کالج میں لاء کا ایک طالب علم تھا۔ اس زمانے میں خورشید صاحب نے RECOGNITION کی تھیوری پیش کی تھی اور میں ذاتی طور پر ان کا بڑا

مدح تھا۔ چنانچہ ہم نے خورشید صاحب کو دعوت دی اور ہم نے ان سے کہا کہ چونکہ یہ تھیوری آپ نے پیش کی ہے تو آپ آئیے اسے لوگوں کو سمجھائیے۔ چنانچہ انہوں نے پشاور کا دورہ کیا۔ پروگرام یہ بنا کہ یونیورسٹی میں ان سے تقریر کروائی جائے۔ چونکہ یونیورسٹی میں INTELLIGENTIA زیادہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تقریر ہوئی اور ہمارے پرنسپل صاحب جو پہلے پاکستان کی فارن سروس میں شامل تھے۔ یونائیٹڈ نیشنز کے ممبر بھی رہ چکے تھے اور ایم پیسڈ بھی رہ چکے تھے۔ وہ جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ خورشید صاحب نے تقریر کی اور وہ تھیوری پیش کی۔ جب انہوں نے تقریر ختم کی تو ہمارے پرنسپل صاحب خطبہ صدارت کے لئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے مخصوص DIPLOMATIC انداز میں اور BEAUROCRATIC انداز میں ایک ٹیل ٹینس میچ کی مثال دی۔ جس سے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ کشمیری ٹیل ٹینس کھیل رہے ہیں اور آخر میں انہوں نے کہا کہ ”جن لوگوں نے آزادی کی جنگیں لڑنی ہوتی ہیں وہ پہلے خود کو تسلیم نہیں کرواتے ہیں۔ وہ میدان میں کود جاتے ہیں۔ لڑائی شروع کر دیتے ہیں اور عملاً اپنے زور بازو سے اپنی طاقت سے خود کی طاقت سے خود کو تسلیم کرواتے ہیں۔“ اس وقت میں نے اس کو بہت محسوس کیا۔ اس لئے کہ میں نے سمجھا یہ ہمارے لئے بہت INSULTING بات ہے۔ ایک پاکستانی جو ہے وہ ہماری اسلٹ کر رہا ہے لیکن بعد میں، میں نے محسوس کیا کہ اس شخص کی بات میں کافی وزن تھا۔ اسلئے کہ RECOGNITION جو ہے۔ ہمیں ایک POINT کو مد نظر رکھنا ہے BASIC POINT یہ ہے کہ عملاً ہم ایک غیر منظم اور ایک غیر مسلح قوم ہیں اور مقصد ہمارا پورا کشمیر کو آزاد کرانا ہے۔ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے سب سے پہلے جس بات کی ضرورت ہے۔ یہ کہ ہم منظم اور مسلح ہو جائیں۔ جب ہم منظم اور مسلح ہو جائیں گے اور پاکستان یا دنیا کے دوسرے ممالک کو یہ باور کرائیں گے اور انہیں ہم یقین دلائیں گے اپنے عمل سے کہ ہم اس قابل ہیں کہ ہم تحریک آزادی کو شروع کر سکتے ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ ہم یہ جنگ لڑ سکتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کیا پوری دنیا ہم کو تسلیم کرے گی۔ لیکن جب ہم اپنے کردار اپنے عمل سے یہ ثابت ہی نہیں کرتے۔ یہ ثابت کرنے میں ماکام رہے ہیں کہ ہم اس قابل ہیں کہ جنگ آزادی کو چلا سکتے ہیں۔ ہم اس قابل ہیں کہ جنگ آزادی کو شروع کر سکتے ہیں۔ ہم اس قابل ہیں کہ ایک PROTECTED WAR لڑ سکتے ہیں۔ اس صورت میں، میں سمجھتا ہوں کہ RECOGNITION کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ایک فضول سی بات ہے۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ ہم اپنی NATIONAL IDENTITY جو ہے۔ اسے قائم کریں۔ جب تک ہم میدان میں اپنی DEPENDABILITY کو ثابت نہیں کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ہمیں تسلیم نہیں کرے گا۔ آپ دیکھتے ہیں الفتح کو۔ جب الفتح والوں نے اپنی تحریک شروع کی تو اس وقت تمام عرب ممالک نے اس کی مخالفت کی۔ اردن نے ان کی مخالفت کی۔ لبنان نے ان کی مخالفت کی۔ یو۔ اے۔ آر۔ UAR سبھی عرب ممالک نے ان کی مخالفت کی لیکن جب انہوں نے اپنی پوزیشن کو۔ اپنی IDENTITY کو، INDIVIDUALITY کو میدان میں ثابت کیا تو اب پوزیشن یہ ہے کہ کوئی عرب ملک جرأت نہیں کر سکتا کہ ان کو اپنے ایریا سے نکالنے کی یا ان کو روکنے کی۔ میں آپ سے عرض کروں۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اسی الفتح کے چار سو مجاہد اردن کی قید میں تھے جبکہ صرف ایک مجاہد اسرائیل کی قید میں تھا لیکن آخر جب انہوں نے تحریک چلائی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ ہم مرنے مارنے کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ آپ ہمیں روک نہیں سکتے ہیں تو مجبوراً شاہ حسین کو بھی ان کی حمایت کرنی پڑی اور اس کی تازہ مثال لبنان ہے۔ جب تک ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہونگے۔ خود کو اس حد تک مسلح اور منظم نہیں کریں گے۔ اپنی تحریک کو چلانے کا اعتماد نہیں دلائیں گے۔ تو آپ پر کوئی اعتماد نہیں کرے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے بعض لوگ جو شکایت کرتے ہیں کہ پاکستان کشمیریوں پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیریوں نے خود کو قابل اعتماد ثابت نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم خود سازشوں کے چکر میں پھنستے رہے۔ خود سود بازی کے چکر میں پھنستے رہے۔ اگر ہم نے اپنے عمل سے ثابت کیا ہوتا کہ ہم

DEPENDABLE ہیں۔ اگر ہم نے اپنے عمل سے ثابت کیا ہوتا کہ ہم اپنی تحریک کو چلا سکتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کبھی ہم پر بے اعتباری نہ کرتا۔ کلیئر (CLEAR)

سوال: کیا مستقبل میں آپ اپنی جماعت کا نام تبدیل کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: ہم جو ہیں۔ ہم مستقبل میں اپنی جماعت کا نام تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے کلیئر؟

سوال: کیا آپ الجاہد کی طرز پر کوئی فورس قائم کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: حضرات مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ الجاہد فورس جو مسلم کانفرنس نے بنائی ہے۔ کیا اسی پیٹرن (PATTERN) پر ہم کوئی فورس بنانا چاہتے ہیں۔ ہم کوئی الجاہد فورس قائم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں آپ سے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ جس نوعیت کی، جس نیچر کی مسلح جدوجہد ہم کشمیر میں کرنا چاہتے ہیں، اس میں یہاں سے ہم کوئی حملہ ہم کوئی INFILTRATION نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں کوئی فوج نہیں بھیجیں گے۔ ہاں یہ ضرور کریں گے کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کو مسلح کر کے آمادہ بغاوت کریں گے۔ (تالیاں) آؤ کشمیر میں اس طرف جتنے بھی ریاستی عوام ہیں۔ ہم مقبوضہ کشمیر کے جدوجہد کرنے والوں کے لئے ایک مضبوط بیک بنا چاہتے ہیں۔

سوال: ایک بات EXPLAIN کریں۔ بات یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اعتماد کے قابل اپنے آپ ثابت نہیں کیا۔ ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے بے سروسامانی کی حالت میں ۶۳ ہزار مربع میل رقبہ فتح کر کے دیا ہوا ہے۔ ہم نے پہلے روز سے اپنے آپ کو قابل اعتماد ثابت کیا ہے۔ اب آپ فرماتے ہیں ہم نے ثابت نہیں کیا۔ ذرا اس تضاد کی وضاحت کر دیں؟ جواب: میں وضاحت کرتا ہوں، جس دور کے سلسلے میں، میں نے عرض کیا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اعتماد کے قابل ثابت نہیں کیا وہ دور جو جنگ بندی کے معاہدہ سے لے کر آج تک چلا آ رہا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء جس روز جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ اس کے بعد سے لے کر آج تک واقعی ہم نے اپنے آپ کو اعتماد کے قابل ثابت نہیں کیا۔

بابائے قوم محمد مقبولؒ نے ۱۹۷۱ء میں بھارتی طیارہ کے اغواء کے بعد ہفت روزہ ”زندگی“ کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں انہوں نے کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔

انٹرویو کا متن حسب ذیل ہے:-

”ہم گزشتہ پانچ سال سے بھارت کو عوام کی خواہشات کے برعکس تسلط قائم رکھنے کا مزہ چکھا رہے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں حریت پسند عوام کے تعاون سے ہم نے بارہا فوج اور پولیس کے دانت کھٹے کیے اور دشمن کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں۔ مجاہدین کی سرگرمیوں کی داستانیں اب بھی ہندوستانی اخبارات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہندوستان چیخ رہا تھا لیکن باہر کی دنیا کو خبر ہی نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں، یا ہم پر کیا ہیبت رہی ہے؟ بڑی طاقتوں، عالمی رائے عامہ اور خود اپنوں نے ہمیں نظر انداز کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ آخر ہم نے اپنے وجود کا احساس دلانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کس طرح ہوا اور اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ آپ جانتے ہیں۔ یہ الفاظ جناب مقبولؒ بٹ کے ہیں۔ یہ مجاہد ہوئے انٹرنیشنل کے کمرہ نمبر ۲۶ میں میرے سامنے اپنی داستان حیات جو جد مسلسل سے عبارت ہے کے مختلف اوراق اُلٹ رہے تھے۔ پہلے کچھ اپنے بارے میں؟ میں نے اس کتاب کا سرورق دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔“ ۱۹۳۸ء میں ترہگام شائع بارہ مولہ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں اپنے گاؤں کے سکول ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ شاید پوچھیں گے کہ میں نے زندگی کا سب سے جذباتی اور ہنگامہ خیز دور یونیورسٹی چھپ چاپ گزار دیا؟ تو ایسا نہیں۔ بلکہ مسلسل ایچی ٹیشن کے ذریعے اپنے گاؤں کے پرائمری سکول کو میٹرک کے درجے تک پہنچایا۔ اس طرح اپنی کوششوں سے لگے ہوئے درخت کا پھل نہ صرف خود کھانے میں کامیاب رہا بلکہ دوسرے بھی اب تک کھا رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک کازمانہ سینٹ جوزف کالج بارہ مولہ میں گزرا اور گریجویٹیشن کی۔

سوال: کالج کا زمانہ کیسا گذرا؟ میں نے دریا کو کوزے میں بند ہوتا دیکھ کر بے ساختہ استفسار کیا؟
جواب: ”بہت اچھا مقرر تھا۔ سڑائیکلیں بہت کرتے تھے۔ ہر کشمیری باشندے کی طرح ہمیں بھی محاذ رائے شاری سے دلچسپی تھی۔ شروع سے ایک مقصد سامنے تھا۔ ہماری سڑائیکلیں کا یہ ناپید ہوا کہ کورنمنٹ نے اس کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اگست ۵۶ء میں ہم پاکستان آ گئے۔“

سوال: پاکستان آنے کا فیصلہ آپ نے یکا یک کیسے کیا؟
جواب: ”یہ بات نہیں، یہ ایک سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ بات یوں ہے کہ جب دسمبر ۵۷ء میں بھارتی حکومت نے شیخ محمد عبداللہ کو پہلی مرتبہ رہا کیا تو ایجنسی ٹیشن کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مارچ اپریل میں میرا بی اے کا امتحان تھا۔ سری نگر سفر تھا۔ حریت پسندوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ ۲/۴ اپریل کو میرا آخری پرچہ تھا اور ۲/۴ ہی کو شیخ صاحب کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ طالب علموں کو بھی اندھا دھند گرفتار کیا جا رہا تھا۔ میری گرفتاری بھی یقینی تھی۔ لہذا میں روپوش ہو گیا اور تین ماہ تک روپوش رہا۔ تین ماہ بعد جب میرا رزلٹ نکالا تو میں نے لاجان سے عارضی سرٹیفکیٹ لانے کو کہا اور پھر ہم سب اگست ۱۹۵۷ء میں پاکستان آ گئے۔ پہلے لاہور آئے لیکن ستمبر ۱۹۵۸ء میں پشاور جا کر آباد ہو گئے۔ میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنی تعلیم کو جاری رکھنے اور ساتھ ساتھ اپنے اخراجات کا بندوبست کرنے کا تھا کیونکہ اس کے بغیر پاکستان میں رہنا مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ میں نے اردو میں ایم، اے کیا اور ۶۵ء میں اپنی باقاعدہ سیاسی زندگی کے آغاز تک ”انجام“ سے رابطہ رہا۔“

سوال: اس دوران آپ نے کیا محسوس کیا؟
جواب: ”ایک بات شدت سے اس وقت بھی کہی تھی اور اب بھی کہتا ہوں، کہ وہ لوگ جو اپنی کوشش سے دو وقت کی روٹی نہیں کما سکتے، وہ کسی قوم کو آزادی کی منزل سے کیسے ہمکنار کر سکتے ہیں؟ وظیفہ خور سیاستدانوں اور سیاسی کارکنوں کی کوئی بڑی سے بڑی تعداد بھی آزادی کی جنگ نہیں لڑ سکتی۔ جن کا نصب العین شکم پروری ہو اور جب منفعت ہو۔۔۔ وہ ایسا کر بھی کیسے سکتے ہیں؟“

سوال: صحافت سے سیاست کی وادی میں داخل ہونے کے کیا محرکات تھے؟

جواب: ”۶۵ء میں شیخ محمد عبداللہ کی دوبارہ گرفتاری کے بعد میرے خیالات میں انقلاب آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جس قوم کی آزادی کی جنگ لڑی جا رہی ہے اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ شروع سے لیکر اب تک کی ساری جدوجہد میں یہی بنیادی خامی ہے۔ انقلابات عالم کی تاریخ پر ہمیں تو معلوم ہوگا کہ جب قوم کی نجات کا سوال ہو تو اس قوم کے افراد کو منظم کیا جاتا ہے۔ جب تک اس قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے آمادہ نہ کر لیا جائے وہ کوئی رول ادا نہیں کر سکتی۔ لیکن کشمیر میں یہ صورتحال نہیں تھی۔ محاذ بنانے کا بنیادی مقصد اس تحریک کی باگ دوڑ کشمیری عوام کے ہاتھ میں دینا تھی۔ یہ بات فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہے کہ آپ کی آزادی کی جنگ کوئی اور لڑے۔ ہمارے ذہنوں میں شروع سے یہ بات تھی کہ سیاسی جدوجہد کے ساتھ مسلح جدوجہد کے سلسلے میں بھی کچھ کریں۔ اپریل ۶۵ء میں سیالکوٹ میں محاذ رائے شماری کی بنیاد رکھی اور ابتداء ہی سے مسلح جدوجہد کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ پاک بھارت جنگ کے دوران میں یہ منصوبہ تعطل کا شکار رہا۔ اعلان تاشقند کے ساتھ ہی ہم نے زور شور سے کام بھی شروع کر دیا۔“

سوال: اعلان تاشقند کے راز سے آپ بھی باخبر ہیں؟

جواب: ”راز۔۔۔ کھلی کتاب کو بھی راز کہا جائے گا۔ یہ راز تو کشمیر کی آزادی سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے۔“

سوال: کیا مطلب؟

جواب: ”گورنمنٹ آف آزاد کشمیر ایکٹ کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ جس کے تحت کشمیر میں حالیہ انتخابات ہوئے۔ اس کی بنیادی روح کو آپ اعلان تاشقند کی سپرٹ کہہ سکتے ہیں۔ اگر اس ایکٹ پر گورنمنٹ آف آزاد کشمیر ۱۹۷۶ء کاٹ کر اعلان تاشقند جنوری ۱۹۶۶ء لکھ دیں اور اس میں بھارتی آئین میں کشمیر کی تعریف سے متعلق دفعات کا اضافہ کر دیں تو اعلان تاشقند کا راز فاش

ہو جاتا ہے۔“

سوال: بھارتی آئین میں کشمیر کی کیا تعریف کی گئی ہے؟

جواب: ”بھارتی آئین میں کشمیر کی کیا تعریف کی گئی ہے؟ بھارتی آئین میں کشمیر سے مراد تمام علاقے ہیں جو تقسیم ہند سے قبل مہاراجہ ہری سنگھ کے کنٹرول میں تھے اور اس میں گلگت اور بلتستان بھی شامل ہیں۔ اس کے برعکس آزاد کشمیر ایکٹ ۱۹۷۰ کے مطابق کشمیر سے مراد وہ علاقہ ہے جو کشمیریوں نے ۱۹۴۷ء میں آزاد کر لیا اور جو اب آزاد کشمیر حکومت کے زیر انتظام ہیں۔ اعلان تاشقند کاراز یہ تھا کہ جو جہاں ہے وہیں رہے (لیکن بھارت کے لئے سارے کشمیر کو ہڑپ کرنے کی گنجائش رکھی گئی تھی)۔ آزاد کشمیر ایکٹ ۱۹۷۰ء میں یہ بھی مذکور ہے کہ آئین میں کوئی ایسی ترمیم بھی نہیں کی جاسکتی جس سے بین الاقوامی معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ راز کیا ہے؟ یعنی بھارت کو تو یہ آزادی ہے کہ وہ گلگت اور بلتستان سے لیکر جموں تک سارے علاقے کو کشمیر کہہ کر اپنا علاقہ سمجھے، لیکن آزاد کشمیر حکومت بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرتے ہوئے صرف چار ہزار مربع میل علاقے تک محدود رہے۔ اعلان تاشقند کاراز جاننے میں اگر اب بھی کوئی دشواری پیش آئے تو اس اعلان کو ایک مرتبہ پھر پڑھنے کے بعد بھارتی آئین کی متعلقہ دفعات اور کورنمنٹ آف آزاد کشمیر ایکٹ کا مطالعہ کریں۔“

سوال: مسلح جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے آپ نے کیا طریق کار اختیار کیا ہے؟

جواب: ”مئی ۱۹۶۷ء میں ہماری پہلی پارٹی مقبوضہ کشمیر میں پہنچی۔ ستمبر ۶۷ء تک وہاں کام کرتے رہے۔ ستمبر میں حکومت کو کسی طرح ہماری کاروائیوں کا علم ہو گیا۔ ہمیں گرفتار کرنے کے لئے وسیع و عریض علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مقابلے میں ہمارا ایک آدمی شہید ہو گیا۔ بالآخر ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ ایک اصولی بات کی وضاحت کر دوں کہ انقلابی جدوجہد کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں جو بہت فطری ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان پر چلتے رہیں تو بالآخر کامیابی ہوگی، اگر کہیں ان کی خلاف ورزی ہو یا ان سے انحراف ہو تو ناکامی یقینی ہے۔ اگر ہمیں بھی کوئی ناکامی ہوئی تو اس

میں یقیناً ہماری کوتاہیوں کا دخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت میرے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ صحیح راہ پر آگے بڑھتے چلے جائیں اور ادھر ادھر نہ بھٹکیں۔ اگر آپ نے اصلی راہ چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلنا شروع کر دیا اور اس طرح اصولوں سے انحراف کیا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت کی توقع نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت صرف اس صورت میں شامل حال ہوتی ہے جب آپ صحیح مقصد کے لئے صحیح راستہ اختیار کر کے اس پر مسلسل چلتے جائیں۔ ہم پر ۲ سال تک مقدمہ چلتا رہا اور اگست ۶۸ء میں فیصلہ ہوا۔ ہم کل تین آدمی تھے۔ دو کو سزائے موت اور ایک کو عمر قید ہوئی۔ مقبوضہ کشمیر میں ہمارے ساتھیوں کو تین ماہ سے لیکر تین سال تک سزائیں دی گئیں اور تین سو کے قریب آدمیوں کو نظر بند کیا گیا۔ ان میں طالب علم، انجینئر، اساتذہ، ٹھیکیدار، دکاندار اور سرکاری ملازم بھی شامل تھے اور ان کا تعلق محاذ رائے شماری وغیرہ سب جماعتوں سے تھا۔ ۲۲/ اکتوبر ۶۸ء میں ہم نے جیل سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔ اور ۸ دسمبر ۶۸ء کورات کے ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر جیل کی دیوار توڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے ساتھ تیسرا آدمی آزاد کشمیر کا ایک نظر بند تھا۔ آزاد کشمیر کی پہلی سرحدی چوکی پر پہنچنے میں ۱۶ دن لگے۔ ۲۵ دسمبر کو مظفر آباد پہنچے۔ ۲۵ دسمبر سے لیکر مارچ ۶۹ء تک مظفر آباد کے تفتیشی مرکز میں ہم سے پوچھ گچھ ہوتی رہی اور پھر ہمیں رہا کر دیا گیا۔ نومبر ۶۹ء میں مظفر آباد میں محاذ رائے شماری کا سالانہ کنونشن ہوا جس میں مجھے پارٹی کا صدر چن لیا گیا۔“

سوال: مقبوضہ کشمیر میں آپ کے کام کرنے کا کیا طریقہ تھا اور آپ کو کیا کامیابیاں ہوئیں؟
جواب: ”پورے مقبوضہ کشمیر میں ہم نے خفیہ سیل قائم کیے۔ ان کے لئے مواصلات اور باہمی رابطے کا نظام قائم کیا۔ سب سے بڑی کامیابی جس پر مجھے فخر ہے اور جس نے ہمارے حوصلے بڑھائے، وہ یہ تھی کہ کوئی بھی عنصر جس کا تعاون کسی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے وہ ہمارے خلاف نہیں تھا۔ کسی تحریک کی کامیابی میں دعوائل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلی چیز عوام کا حق میں ہونا ہے۔ اس بات کا کریڈٹ کشمیر کی قیادت کو ملتا ہے کہ وہاں عوام میں زبردست سیاسی

بیداری اور شعور پایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ زمین بالکل تیار اور ہموار تھی۔ صرف اس بیداری اور شعور کو عملی شکل دینے کے لئے مختلف ذرائع تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ دوسری چیز تربیت اور جدوجہد تھی۔ میدانِ علاقوں میں جنگی حکمت عملی مختلف ہوتی ہے۔ وہاں روایتی ہتھیاروں سے کام لیا جاسکتا ہے اور چند منٹوں کے نوٹس پر فوج یا پولیس حرکت میں آکر کسی علاقے کو گھیرے میں لے سکتی ہے اور دشمن کو بچ کر نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن مقبوضہ کشمیر میں یہ صورتحال نہیں۔ وہاں ایک آدمی سو آدمیوں کو مصروف رکھتا ہے اور پھر بھی سو کی ماکامی کا امکان زیادہ اور ایک کی ماکامی کا امکان کم ہوتا ہے۔ سیل قائم کرنے کا بھی یہی مقصد تھا، بلکہ اس کے لئے طریق کار یہ نہیں تھا کہ ہم نے کسی ہمہ گیر پروگرام پر بیک وقت عمل شروع کر دیا، بلکہ اسکے لئے تجربہ، کامیابی، تجربہ کا طریقہ کار اختیار کیا۔ یعنی ایک وقت میں بھی سارے چراغ جلائے گئے بجائے چراغ سے چراغ جلائے۔ بہت سارے چراغ ایک لخت جل انھیں تو پھر ان کا انقلابی جدوجہد کے دوران اسی سرعت سے بجھنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، لیکن ہم نے مایوس کی ساری ڈبیا ضائع کرنے کے بجائے ایک ہی تیلی سے کام چلایا۔ ہم نے جس حلقے سے بھی رابطہ قائم، کہیں سے بھی مایوسی نہیں ہوئی۔ جب ہم پکڑے گئے تو وہ ہمارا آپریشن منسحب نہیں تھا۔ ہم ابھی تنظیمی مراحل میں ہی تھے اور تصادم کا خطرہ مول لینے کے لئے مکمل طور پر تیار نہ تھے۔ دشمن سے تصادم اس وقت مول لینا چاہئے جب خود اس کی دعوت دینے کی اہلیت ہو۔ لیکن اس واقع نے بھی ہماری تحریک کے لئے ہمیز کا کام کیا۔ مگر گزشتہ دو تین سال میں ہمیں خاصی کامیابیاں ہوئیں۔ اب ہم ایک نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب ہم نہ صرف طاقت کی زبان سمجھنے والے بھارت سے اس کی زبان میں بات کر سکتے ہیں بلکہ عالمی رائے عامہ کو جو ہمیں مسلسل نظر انداز کرتی چلی آئی ہے پر بھی اپنے وجود کا احساس دلا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں اپنا وجود منوانا پڑتا ہے ہم نے اپنا وجود منوالیا ہے اور ہم انشاء اللہ پوری کشمیری قوم کا وجود منوا کر دم لیں گے۔

سوال: کیا یہ کوریڈر جنگ کا نقطہ آغاز ہے؟

جواب: ”کوریل! جنگ تو کب سے شروع ہے، البتہ اس میں قدرے شدت آگئی ہے۔ یہ جنگ جاری رہے گی۔ جتنا ہم اسے کریں گے اتنی ہی کامیابی ہوگی۔ ہم دشمن کو سکون سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ دریاؤں میں، پہاڑوں میں، جنگلوں میں فیکٹریوں میں گھروں میں، کارخانوں میں، دفاتروں میں ہر جگہ اس کا تعاقب جاری رکھیں گے۔ جب وہ تھک کر چور ہو جائے گا تو اس کے سر پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگائیں گے تاکہ وہ دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ ہم انشاء اللہ دشمن کے اعصاب پر اس وقت تک سوار رہیں گے جب تک وہ ہمارے مطالبات تسلیم کرنے کے واضح اعلان کے ساتھ کانفرنس ٹیبل پر آکر نہیں بیٹھ جاتا۔ بھارت یہ فیصلہ بہت دیر بعد کرے گا لیکن ہمیں یقین ہے کہ اپنی موت یا اس فیصلے میں سے کسی ایک کے انتخاب کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔“

سوال: آزاد اور خود مختار کشمیر کے فعرے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ”(لش ٹرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) یہ لش ٹرے ہوٹل والوں کی ہے۔ کیا میں آپ کو بطور تحفہ دے سکتا ہوں یا آپ کے ہاتھ بیچ سکتا ہوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔۔۔ جب تک اس پر میرے حقوق ملکیت تسلیم نہ کیے جائیں، میں اسے ٹھکانے لگانے کا مجاز نہیں۔ کشمیر آزاد ہوگا یا پاکستان سے الحاق کرے گا۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے ہمیں اپنے ملک کا مالک بننا چاہئے۔ پھر قوم خود فیصلہ کرے گی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ قوم کا مجموعی فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اجماع امت کو اسلام میں قانون سازی کا ایک ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔ جو شخص اس پر یقین نہیں رکھتا، مجھے اس کے مسلمان ہونے میں شک ہے۔ اگر قوم کی عظیم اکثریت پاکستان سے الحاق کے حق میں ہے تو آزادی ہونے کے بعد یک لخت اپنا فیصلہ کیسے تبدیل کر سکتی ہے۔ (بشکر یہ، ہفت روزہ ”زندگی“، ۱۴ تا ۱۸ فروری)

مقبول بٹ شہید کا فروری ۱۹۷۱ء میں ہفت روز

”کہانی“ لاہور کو دیا گیا خصوصی انٹرویو!

”پاکستان میں بیوروکریسی کی غلط منصوبہ بندی کے سبب بھی کشمیر میں ہماری تحریک کو نقصان پہنچا۔ پاکستان کی بیوروکریسی نے کشمیری لیڈروں کو اعتماد میں لئے بغیر جو بھی قدم اٹھایا وہ صریحاً ناکام ہوا اور اس کا نقصان پہنچا، اور سب سے بڑا اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کے اکثر حکمرانوں نے مسئلہ کشمیر کو اس انداز میں عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کیا جیسے یہ کوئی سرحدی تنازعہ بھارت اور پاکستان کے مابین ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بھارت و پاکستان میں کشمیر اور فرخاچہ کے مسئلہ تنازعہ فیہ ہیں۔ حالانکہ کشمیر کا مسئلہ بھارت اور پاکستان کے مابین سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ ایک قوم کی آزادی کا مسئلہ ہے۔ اس کی بقاء کا مسئلہ ہے۔ ہم تہہ دل سے پاکستان کے ساتھ ہیں مگر ہم اس مسئلے کو اس انداز میں لیتے ہیں کہ بھارت ایک غاصب ملک ہے۔ کشمیری ایک قوم ہیں جو اس عفریت کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اور ایک مسلح جدوجہد کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔ اور جو لوگ آزادی کی راہ میں یہ سوچ کر روڑے اٹکاتے ہیں کہ کہیں ہم پاکستان کے خلاف نہ ہو جائیں وہ شدید قسم کی غلطی کرتے ہیں۔ ہمیں اور ہماری جماعت کو پاکستان کی حکومت نے ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھا اور ہمیں بار بار گرفتار کیا گیا، مگر اسکے باوجود ہم پاکستان کے پوری طرح خیر خواہ ہیں اور دل سے اس کی سلامتی کے خواہاں ہیں۔ البتہ یہاں کی بیوروکریسی کے ہم مخالف ہیں کہ یہ مسئلے کو خراب کر رہی ہے۔“

سوال: ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے بارے میں کیا آپ کو پہلے سے علم تھا کہ وہ طیارے کو اغواء کر کے یہاں آئیں گے؟

جواب: ”جی ہاں۔ البتہ جیسا کہ کوریڈر گرمیوں میں ہوتا ہے انہیں بعض خطوط کے اندر کام

کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ان کا راولپنڈی میں منتظر رہا اور وہ راولپنڈی کے راستے لوٹ کر لاہور آ گئے۔ یہ سب ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ہوا اور اس کا مقصد بھارت کے اس پروپیگنڈہ کو غلط ثابت کرنا تھا جس میں اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ کچھ لوگ شورش پسند تھے اور نہیں کچل دیا گیا ہے اور ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔“

سوال: کیا یہ سرگرمیاں جاری رہیں گی؟

جواب: ”جہاز کو لاہور میں اتارنے کا واقعہ صرف ایک پہلو ہے۔ ہماری سرگرمیاں مقبوضہ کشمیر میں جاری و ساری ہیں اور ہم کو تعداد میں کم ہیں لیکن واضح پروگرام کے تحت کام کر رہے ہیں اور اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ آزاد کشمیر میں ہوائی اڈہ نہ ہونے کے سبب ہم اپنے پروگرام پورے نہیں کر پاتے۔“

سوال: دونوں حریت پسندوں سے بعض کشمیری لیڈر بھی ملنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے سوا کوئی سیاستدان ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔ کیا آپ کی وجہ بتا سکتے ہیں؟

جواب: ”وجہ بالکل واضح ہے۔ ان کے پاس ہدایات تھیں اور وہ طیارے میں کسی بھی شخص پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے سوائے ہمارے اپنے آدمیوں کے۔ بھٹو صاحب سے ملاقات جذباتی امر تھا اور وہ بھی محض اسلئے پاکستان سیاست میں ان کی ذاتی اہمیت کے پیش نظر۔ کسی نے انہیں طیارے کی طرف جانے سے نہیں روکا۔ مگر نہ اس کی تہہ میں کوئی خاص بات نہ تھی۔“

سوال: کیا بھارت مقبوضہ کشمیر میں ان نوجوانوں کے اور آپ کے عزیز واقارب پر کسی قسم کی سختی کرے گا؟

جواب: ”ذیل دشمن سے ہر اقدام کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ تاہم اگر وہ سمجھ سے کام لے تو ایسا کرنا بیکار ہوگا، کیونکہ اگر وہ ان کی کھال بھی اتار لے تو بھی وہ اپنے ارادے سے باز نہیں رہ سکتے۔“

سوال: کیا آپ بتا سکتے ہیں حریت پسندوں کا آئندہ منصوبہ کیا ہوگا؟
جواب: فی الحال وہ پاکستان میں رہیں گے جب تک حالات معمول پر نہیں آجاتے۔ رہا آئندہ منصوبہ تو میں آپ کو ضرور بتاتا مگر آپ ہی کہنے کیا اسے وقت سے پہلے بتانے سے نقصان نہیں ہوگا؟

سوال: مقبول بٹ دو حریت پسند کشمیری نوجوانوں نے گزشتہ رات بھارتی طیارے کو لاہور کے ہوائی اڈے پر نذر آتش کیا۔ ان کا تعلق کس جماعت سے ہے؟
جواب: یہ نوجوان قومی محاذ آزادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان میں اس کی شاخ ہے اسے ہم قومی محاذ آزادی برائے آزاد کشمیر و پاکستان کا نام دیتے ہیں۔ میں اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتا ہوں۔

سوال: کیا یہ نوجوان الفتح سے تعلق رکھتے ہیں؟
جواب: الفتح نام کی فی نفسہ کوئی تنظیم نہیں ہے۔ قومی محاذ آزادی کی عسکری شاخ کو الفتح کا نام دیا جاتا ہے اور وہ کشمیر یہ ہے کہ پاکستان میں امان اللہ خان صاحب جو قومی محاذ آزادی کے لیڈر اور اس کے پلیڈی ونگ کے سیکرٹری ہیں اور جو آج کل گلگت میں قید ہیں نے الفتح اور کشمیری نوجوان کے نام سے ایک پمفلٹ لکھا تھا۔ یہ پمفلٹ مقبوضہ کشمیر میں خفیہ طور پر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوا۔ بھارتی حکومت نے چونکہ اس پوسٹر کے حوالے سے کوریڈا طرز پر جنگ شروع کرنے والوں کو پہچانا تھا۔ اس لئے ان کا نام الفتح پر لگایا۔

سوال: مقبول بٹ صاحب کل سے بھارتی ریڈیو بار بار آپ کا نام لے رہا ہے اور اسی ریڈیو کے حوالے سے ہمارے یہاں کے عام لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھارتی حکومت نے پھانسی کی سزا دی تھی۔ کیا آپ اپنے حالات زندگی پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: مختصراً یہ عرض ہے کہ میں ۱۸/فروری ۱۹۳۸ء کو تہ گام نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا جو مقبوضہ کشمیر کے ضلع بارہ مولہ میں واقع ہے۔ والدین کاشت کار تھے اور زرعی اصلاحات سے قبل

مزارع تھے۔ اصلاحات کے بعد زمین کی ملکیت مل گئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، سینٹ جوزف کالج بارہمولہ سے ۱۹۵۸ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا اور پاکستان آ گیا۔

سوال: یہاں آنے کے مقاصد پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

جواب: یوں سمجھ لیجئے سیاسی مقاصد کے لئے یہاں آنا ضروری تھا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک پشاور کی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا اور روزنامہ انجام پشاور سے بطور سب ایڈیٹر منسلک ہو گیا۔ سب ایڈیٹر کے بعد انجام میں نیوز ایڈیٹر بنا اور ستمبر ۱۹۶۵ء میں ملازمت چھوڑ کر پورے طور پر آزادی کی تحریک میں حصہ لیتا شروع کیا۔ سیز فائر لائن کر اس کر کے مقبوضہ کشمیر پہنچا اور وہاں نیشنل لبریشن فرنٹ یا قومی محاذ آزادی کی تنظیم اور ان عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا شروع کیا جو اپنے اپنے طور پر آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کر رہے تھے یا کرنے کے حق میں تھے۔ چھ ماہ تک ہم اپنے طریقے پر کام کرتے رہے۔ ہم لٹریچر تقسیم کرتے تھے۔ عام لوگوں کو جو ہم سے متعلق ہوتے، انہیں کوریڈا جنگ کے طریقے بتاتے تھے۔ اس دوران میں بھی اور اس سے پہلے بھی کشمیری نوجوانوں نے وہاں بہت سی کاروائیاں کیں جن کی تفصیل میں جانے سے ہم گریز کرتے ہیں۔ لیکن خود بھارتی اخبارات ان کارناموں کے گواہ ہیں۔ ہماری جماعت نے اس ضمن میں ایک پمفلٹ بھی شائع کیا جس کا عنوان ہے ”ایک کلیم سرکف“۔ آپ وہ پمفلٹ دیکھ سکتے ہیں۔ بہر کیف ۱۳/ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں یعنی ۶ ماہ بعد ہماری مہجری ہو گئی۔ مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر کی حکومت چاہتی تھی کہ بلٹری کورٹ میں سزا دیکر ہمیں فوراً ختم کر دیا جائے، لیکن سول کورٹ میں مقدمہ چلتا رہا۔ ثبوت کافی تھے اور الزامات کی فہرست طویل۔ موت کی سزا ۱۸/ اگست کو سنائی گئی اور ہمیں سری نگر جیل میں کڑے فوجی پہرے میں رکھا گیا۔ جہاں ہم نے انتہائی خوش اسلوبی سے اور منظم طور پر فرار کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی تفصیلات کے لئے وقت چاہئے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہم دوسرا بھی جنہیں موت کی سزا ہوئی تھی، اپنے ایک کشمیری نوجوان کے ساتھ جو آزاد کشمیر کا رہنے والا تھا مگر ہماری تنظیم سے متعلق نہ تھا ساتھ لیکر فوج کے کڑے پہرے

کے باوجود جیل سے فرار ہوئے اور کشمیر کے ان راستوں پر سے ہوتے ہوئے جہاں ہمیں کھانا اور دیگر چیزیں مل سکتی تھیں اور ۱۵/۱۶ ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کرتے ہوئے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۸ء کو آزاد کشمیر کے علاقے میں پہنچے۔

سوال: اس گرفتاری کی کیا وجہ تھی؟

جواب: کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ ایوب خان کی حکومت تھی اور ایوب خان کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص پاکستان کے عوام کا بھلا چاہتا تھا نہ کشمیر کے عوام کا۔ اس کی حکومت نے ہم پر بے انداز مظالم ڈھائے۔ مجھے جس کنسٹرکشن کمپ میں رکھا گیا وہاں شدید تکلیفیں دی گئیں۔ دل یہ سوچ کر اور بھی کڑھتا تھا کہ تکلیفیں اپنوں سے مل رہی ہیں۔ ۲۴ دسمبر سے آٹھ مارچ تک انٹرگیشن سنٹر مظفر آباد میں رکھا گیا اور ۸ مارچ کو جب محاذ کے کارکنوں نے اسلام آباد میں مظاہرہ کیا تو مجھے رہا کیا گیا۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں محاذ کا صدر منتخب ہوا۔

سوال: آپ کی جماعت نے آزاد کشمیر کے انتخابات میں حصہ کیوں نہیں لیا؟

جواب: اس لئے کہ ہم آزاد کشمیر کی موجودہ حیثیت سے مطمئن نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۴۸ء میں جتنا علاقہ ہم نے بھارت سے آزاد کرایا تھا اس میں سے پانچویں حصے پر حکومت آزاد کشمیر قائم ہے اور چار حصے پر جو گلگت اور بلتستان کہلاتا ہے ایک ریڈیڈنٹ راج کرتا ہے۔ اس علاقے کے باشندوں کو نہ تو ابھی تک ووٹ کا حق مل سکا ہے اور نہ انہیں دیگر سہولتیں میسر ہیں جو پاکستان یا آزاد کشمیر کے علاقے میں عوام کو ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت آزاد کشمیر کا اپنا ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ ہم اس مطمئن نہیں۔ یہ کالونیل سسٹم (colonial system) کے یادگار لوگ امور داخلہ و کشمیر میں ملازم ہیں اور بیوروکریسی کے یہ پرزے

بعض غیر جمہوری اور غیر نمائندہ حکمرانوں سے مل کر مسئلہ کشمیر کو دبانی کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس حالت میں ہم انتخابات میں حصہ لینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ہم امور کشمیر کے گماشتے بن کر کام کرنا نہیں چاہتے۔

سوال: کشمیر کی باقی سیاسی جماعتوں کا تعاون آپ کو کس حد تک حاصل ہے؟

جواب: آزاد کشمیر میں ایک ہی سیاسی جماعت تھی۔ مسلم کانفرنس، اور اس کا حال یہ تھا کہ اس کے اکثر ارکان تنخواہ دار تھے اور ۱۹۵۸ء تک باقاعدہ حکومت پاکستان کے ان سروں سے تنخواہ وصول کرتے تھے۔ ایوب خان صاحب نے انہیں چار برس کی یکمشت تنخواہیں دے کر یہ نظام ختم کر دیا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں یعنی یہ مدت ختم ہونے کے بعد وہاں اپورٹ لائنس سسٹم جاری کیا گیا اور تنخواہیں تقسیم ہونے کے بجائے لائنس تقسیم ہونے لگے۔ آپ اس جماعت کی بات کیا کرتے ہیں اور اس سے بھلائی کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ یہ سیاسی جماعتیں تو پاکستانی بیوروکریسی کی نمائندہ ہیں۔ کیونکہ اسی مسلم کانفرنس کے حصے ہو کر موجودہ بظاہر بڑی بڑی سیاسی جماعتیں معرض وجود میں آئی ہیں۔

سوال: اگر کشمیر کی کسی سیاسی جماعت کی طرف سے تعاون کی پیش کش ہو تو آپ اسے قبول کریں گے؟

جواب: ہم تو پیش کش قبول کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ بعض لوگوں پر اعتقاد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہم جس راستے پر چل رہے ہیں پاکستان کی بیوروکریسی ان راستوں کو پسند نہیں کرتی اور آج اگر کشمیر کا موجودہ سیاسی لیڈر خلوص دل سے ہمارے ساتھ کام کرنا چاہے تو یہ بیوروکریسی کے عناصر اسے ڈرا دھمکا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے کارناموں پر مشتمل فائلیں اس کے ایسے ایسے کمزور پہلو بیوروکریسی کے پاس ہیں کہ اس کی لیڈری کا سارا بھرم کھل سکتا ہے۔ بھائی ہم آپ کو کیا بتائیں کہ یہاں کوئی ایسی تنظیم موجود نہیں جو آزادی کشمیر کے لئے مسلح جدوجہد کو اختیار کر سکے۔ ہم لوگ یہاں اس انداز کی باتیں کرتے تھے تو ہم

پر لوگ ہنستے تھے اور ہمارا مذاق اڑاتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس واقعے سے لوگوں کو ہماری جماعت کے وجود کا یقین ہو گیا۔

سوال: مسلم کانفرنس کے رہنما اور حکومت آزاد کشمیر کے موجودہ صدر سردار عبدالقیوم صاحب نے

بھی ایک تنظیم الجاہد کے نام سے قائم کر رکھی ہے۔ کیا آپ اس تنظیم کے بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟

جواب: کیا آپ کو یقین ہے کہ ایسی کوئی تنظیم واقعتاً موجود ہے؟

سوال: میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں؟

جواب: یہ تنظیم سردار صاحب کی تقریروں میں ملتی ہے۔ کشمیر کے بارے میں مسلم کانفرنس کے طرز عمل سے میں آپ کو آگاہ کر چکا ہوں کہ یہ جماعت وہی کچھ چاہتی ہے جو حکومت پاکستان چاہتی ہے۔ جو حکومت پاکستان کے انسر چاہتے ہیں۔

سوال: مسئلہ کشمیر کے بارے میں آپ کو حکومت پاکستان سے کیا شکایت ہے؟

جواب: ہم پاکستان کے عوام کے ہر طرح سے شکرگزار ہیں اور یہ تو یہ ہے کہ صرف عوام کے دباؤ کے تحت کوئی پاکستانی حکمران کشمیر کی تقسیم یا اس انداز کی دیگر تجاویز پر عمل نہ کر سکا۔ لیکن پاکستان کے حکمران طبقے سے ہمیں بے شمار شکایات رہی ہیں۔ پاکستان کی بیوروکریسی نے اس مسئلے کو صحیح انداز میں غیر ممالک کے سامنے پیش نہیں کیا۔ مختصراً اس مسئلے کو دیکھئے کہ پہلا نقصان مسئلے کو اس وقت پہنچا جب سر ظفر اللہ خان پہلے وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ میں یہ تسلیم کر لیا کہ حکومت آزاد کشمیر ایک لکھل اتھارٹی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان نے یہ تسلیم کر لیا کہ اصل حکومت وہ ہے جو مقبوضہ کشمیر میں ہے۔ چنانچہ طے یہ پایا تھا کہ رائے شماری کے لئے اگر وہ ہوتی تو ایڈمنسٹریٹر کا تقرر بھی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کرے گی۔ دوسرا نقصان ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کے اس اعلان کے وقت جو انہوں نے بھارت کے خلاف کیا، پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کا بھارت جانا اور وہاں پنڈت نہرو سے میل ملاقات اور ساتھ پر تلک لگوانے سے پہنچا کہ غیر ملکی پریس نے اس ملاقات کو خوب اچھا لایا۔ تیسرا نقصان فیروز خان نون کی وزارت خارجہ اور وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں پہنچا کہ اگر آپ ان کی کتاب ”چشم دید“ دیکھیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ دل سے سمجھتے تھے کہ مسئلہ کشمیر کا حل چناب لائن پر اس کی تقسیم ہے، ظاہر ہے جو شخص دل سے تقسیم کو درست سمجھتا

ہو وہ دوسرے ملکوں کے نمائندوں کے سامنے مسئلے کو کیونکر پیش کرتا ہوگا۔ چوتھا بڑا نقصان بھوسورن سنگھ مذاکرات کی شکل میں پہنچا کہ اس وقت دنیا بھر کے ساتھ ساتھ جب پاکستانی اخباروں نے بھی لکھا تھا کہ رائے شماری کے بجائے کوئی متبادل حل اس مسئلے کے لئے ہونا چاہئے اور پانچواں بڑا نقصان آزاد کشمیر کے علاقے منگلا ڈیم کی تعمیر سے پہنچا اور چھٹا اعلان تاشقند کی صورت میں۔ کشمیری عملاً اپنے ایک بہت بڑے ہمدرد یعنی پاکستان کی عملی مدد سے وقتی طور پر محروم ہو گئے۔ یہ سیاسی طور پر مسئلے کو نقصانات پہنچنے کی تفصیل ہے۔ اب فوجی نقطہ نظر سے دیکھئے ۱۹۶۵ء میں کشمیریوں کو ہٹلائے بغیر جنگ مسلحہ کر دی گئی جو بہت بڑی غلطی تھی۔

(بحوالہ۔ ہفت روزہ مشعل کوئٹہ)

☆☆☆☆☆☆

بابائے قوم محمد مقبول بٹ کا آخری انٹرویو جو کشمیری

عوام کے نام ان کا آخری پیغام ثابت ہوا۔

دہلی کے قریب تھارڈیل میں ایک اخبار نویس شہادت سے تھوڑے عرصہ قبل متعدد رکا وٹیں عبور کرنے کے بعد بابائے قوم محمد مقبول بٹ شہید کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہوا تھا جو باہر کی دنیا کے ساتھ شہید رہنما کا شاید آخری تفصیلی رابطہ تھا۔ بابائے قوم محمد مقبول بٹ نے آسمیں اپنی ذات اور نظریات کے بارے میں چند سوالوں کا جواب دیا تھا۔

سوال: آپ اپنے خاندان کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟

ج: میرے والد زراعت پیشہ بھی تھے اور دست کار بھی۔ ان کی وفات ۱۹۷۳ء میں میرے آبائی گاؤں میں ہوئی۔ والدہ کی وفات اُس وقت ہوئی جب میں ابھی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ وہ ایک گھریلو عورت تھی۔ میرا ایک حقیقی بھائی غلام نبی ہے، وہ قریب دس سال مجھ سے چھوٹا ہے اور وہی

خاندان کی دیکھ بھال کرتا ہے اس کے علاوہ میرا سوتیلے بھائی منظور احمد اور ظہور احمد نیز دوستی نہیں ہیں جن کی شادی ہو چکی ہے۔ ہمارا خاندان اکٹھے رہتا ہے۔ شادی شدہ افراد خانہ کے بچے بھی ہیں۔

سوال: کیا آپ تعلیم یافتہ ہیں؟

جواب: میرے پاس پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری ہے۔ میں آرٹس کا طالب علم رہا ہوں میں نے ۱۹۵۸ء میں ایک باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے سینٹ جوزف کالج بارہمولہ سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور تاریخ و سیاسیات میرے موضوعات تھے۔ ایم۔ اے میں نے ۱۹۶۵ء میں پشاور یونیورسٹی سے کیا۔

س: کیا آپ بہت پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟

ج: اس اصطلاح کے لغوی معنوں میں تو یقیناً نہیں۔

س: کیا آپ نے تعلیم حاصل کرنے بعد کام بھی کیا ہے؟

ج: میں نے پشاور کے ایک اردو روزنامہ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا اور نیوز ایڈیٹر بننے میں کامیاب ہو گیا۔

س: کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

ج: جی ہاں میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔

س: کیا آپ اپنی بیوی کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟

ج: میری بیوی بنیادی طور پر ایک گھریلو خاتون ہے وہ میری عمر کی ہے اور ایک ٹیچر ہے آج کل پشاور میں ہے۔

س: کیا آپ کے بچے ہیں؟

ج: ہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے کی عمر بیس سال کی ہے اور بی۔ ایس۔ سی آنرز ایگریکلچر میں فیصل آباد پاکستان میں پڑھ رہا ہے۔ چھوٹے بیٹے کی عمر اٹھارہ سال ہے اس نے پشاور

میں ایف۔ ایس۔ سی میڈیکل کا امتحان دیا ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی سترہ سال کی ہے اور اس سال کراچی سے سینٹر کیمرج مکمل کرنے والی ہے۔

س: آپ پہلی مرتبہ کب اور کیوں گرفتار ہوئے؟

ج: پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں مجھے جموں کشمیر کی حکومت کا تختہ الٹنے اور اس سلسلہ میں بعض ایسے اقدامات کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا جو میرے مدعیان کی نگاہ میں غیر قانونی سمجھے گئے۔

س: سنا ہے کہ آپ کو کسی جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا ہے؟

ج: جرم نے میری زندگی میں کبھی کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ معاشرے کی تبدیلیوں کے لئے کام کرنے والے اگر اس راہ پر لگ جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بزدلی کا شکار ہو کر جبر کی قوتوں کے سامنے جھک گئے ہیں۔

س: جیل میں آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟

ج: جیل میں کبھی میرے ساتھ ایک قیدی جیسا برتاؤ نہیں ہوا۔ میری حفاظت ہمیشہ ہی قانون کے تقاضوں کے مطابق نہیں بلکہ توہمات کے پس منظر میں ہوتی رہی ہے۔ اسلئے میں اپنے آپ کو جیل کا قیدی نہیں ایک غلام قیدی تصور کرتا ہوں۔

س: کیا اس سے آپ کے زاویہ نظر میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے؟

ج: جیل کے تلخ ترین تجربات نے بھی میرے زاویہ نگاہ کو نہیں بدلا۔ میرے پاس مقدمہ چلانے والوں کے لئے دعاؤں اور اچھی خوشامناسی کے علاوہ کچھ نہیں۔

س: آپ پر اس کے کیا اثرات پڑے ہیں؟

ج: جیل کا بدسلوک میرے عزم راسخ کو متزلزل نہیں کر سکا۔ میرا ارادہ برے اثرات کی مزاحمت کے لئے کافی ہے۔

س: کیا آپ مذہبی ہیں؟

ج: میں اس اصطلاح کے روایتی معنوں میں کوئی گہرا مذہبی آدمی نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ

مذہب کو نظر انداز کر کے سماجی زندگی کی تمام اخلاقی بنیادی منہدم ہو جائیں گی۔ میرا مذہب ہی مطالعہ اگرچہ بہت تھوڑا ہے مگر پھر بھی اس نے میری شخصیت کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

س: آپ کس بات پر یقین رکھتے ہیں؟

ج: بنی نوع انسان کی مساوات جس میں سماجی انصاف میسر ہو۔

س: آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟

ج: آزادی فکر و عمل اور آزادی اظہار و اجتماع میرا سیاسی عقیدہ ہے۔

س: کیا آپ کو کچھ بچپناوے ہیں؟

ج: میں زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ بے اطمینانی تب ہوتی ہے جب عقل پر نیند غالب ہو جاتی ہے۔

س: کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ آپ ایک مشہور یا کامیاب آدمی ہیں؟

ج: کامیابی و نام کامی تو نسبی اصطلاحیں ہیں لیکن کسی کا زندگی نوعیت اپنا مقام رکھتی ہے اور اگر کسی مرحلہ پر اس کے حصول میں وقتی نام کامی سے دوچار ہونا پڑے تو اس کا مطلب نام کامی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت مسیح علیہ السلام اور کارل مارکس انسانی تاریخ میں سب سے نام کام آدمی قرار پاتے۔ مشہور آدمی ہونے کا کوئی خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا۔

س: کیا آپ کو مطالعے کا شوق ہے اور آپ کو کس مصنف نے زیادہ متاثر کیا؟

ج: میں اچھی کتابیں پڑھنے کا شوقین ہوں۔ میرے لئے اچھی کتاب کی تعریف اُس سے ہے جو ایک ممتاز مصنف کی ہے۔ تاہم مجھے اس فکر و عزم سے محروم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ یہ میری زندگی کا تلخ تجربہ ہے۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سے مصنفین نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ دستور و ہنر کی ہویا چٹو ف ہویا بالڈاک والیفر ہویا جدید دور کے مصنفین، ہمنگ وے، جان شٹین، ہمرسٹ یا ہنسلٹن سب میں ایک خاص کشش ہے۔

س: کیا آپ پوکری سے شفقت رکھتے ہیں؟

ج: میرا یہ خیال نہیں کہ میں پوسٹری کا شوق رکھتا ہوں۔ اس میں یقیناً میرے لئے ایک جذبہ ہے مجھے جب کبھی اعصابی کھنچاؤ کا دور دورہ ہو یہ مجھے تسکین مہیا کرتی ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد غالب، اقبال، فیض، ندیم قاسمی، سردار جعفری اور فراق کو پڑھ کر بہت لطف اندوز ہوا ہوں۔

س: آپ کا نام ۱۹۷۱ء میں بھارت کے فضائی طیارے کے انوائس بھی لیا جاتا رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ آپ اس میں ملوث تھے؟

ج: ۱۹۷۱ء میں مختلف لوگوں نے مختلف اسباب کی وجہ سے میرا نام اس سلسلہ میں لیا ہے۔ میں نے اس ڈرامائی مہم میں ایک کردار بھی ادا کیا تھا۔ لیکن یہ مکمل طور پر قانونی نوعیت والا رول تھا، اور حفاظت خود اختیاری فطری جذبہ نے اس کو آگے بڑھایا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پاکستان و بھارت کے سیاست دانوں نے اپنے فوری مقاصد کی تکمیل کے لئے اسے خوب ایکسپلاٹ (exploit) کیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سچائی دھند میں چھپ کر رہ گئی۔ اگر گنگا کی اصل کہانی منظر عام پر آجائے تو متعلقہ ایجنسیوں کی الماریوں میں پڑے ہوئے کئی ڈھانچے اور آدمی اپنے اصل روپ میں سامنے آجائیں گے۔ سچ جاننا لوگوں کا حق ہے اور ایک دن یقیناً انہیں اس کا پتہ لگ جائے گا۔

س: کیا آپ موت سے ڈرتے ہیں؟

ج: میں ہرگز موت سے نہیں ڈرتا۔ جب ہر زندہ چیز کو ایک دن مرنا ہے تو پھر اس سے ڈرنا کیا۔ وہ لوگ جو معزز انسانی مقاصد کے لئے کھڑے ہوتے ہیں موت انکے لئے محض عبوری حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت میں وہ جسمانی طور پر مخفی ہو جانے کے باوجود بھی زندہ رہتے ہیں۔ میں ہونٹوں پر مسکرائشیں لئے پھانسی کا سامنا کروں گا۔ میرے رد عمل کو ایک شاعر کا شعر شاید اپنے اندر سمو سکے۔

”زندگی سے بہت پیارا ہم نے کیا۔۔۔ موت سے بھی محبت نبھائیں گے ہم۔“

س: آپ زندگی کا کیا مطلب لیتے ہیں؟

ج: زندگی ایک نعمت ہے۔ مقصد کی خاطر کام کرنے والے لوگ اس کے انجام پر نظر نہیں رکھتے

بلکہ وہ اسے مطلب و مفہوم عطا کرتے ہیں۔

س: آپ نے زندگی کو کیا دیا ہے؟

ج: مجھے جو اس سے محبت ملی ہے اس کا مثبت جواب دیا ہے اور میں معاشرے کو کیا دے سکتا تھا۔

س: کیا آپ کو اپنے خاندان کے لئے افسوس ہے؟

ج: ذاتی سطح پر مجھے افراتفرات خاندان کے بارے میں افسوس بھی ہوتا ہے، کیونکہ میں ان پر وہ توجہ نہیں دے سکا جس کی وہ مجھ سے توقع کرتے تھے۔

س: کیا آپ کے خاندان کو آپ کے لئے تاسف ہے؟

ج: اس کا جواب صرف میرے خاندان والے ہی دے سکتے ہیں۔

س: کیا آپ سزائے موت کی حمایت میں ہیں؟

ج: میں اصولی طور پر اس کے حق میں نہیں۔ یہ سزائی روح کا سماجی مقصد پورا نہیں کرتی۔ اس سلسلہ میں میرے خیالات سپریم کورٹ آف انڈیا کے جسٹس بھاگ وتی کے نظریات سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ سزائے موت کے حامی خواہ کچھ کہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سزائے موت ایک مہذب سوسائٹی میں سماجی سکون مہیا کرنے کا مقصد پورا نہیں کرتی۔

س: کیا آپ سے جیل میں اچھا سلوک ہو رہا ہے؟

ج: ذاتی طور پر جیل حکام مجھ سے برا سلوک نہیں کرتے۔

س: ذاتی طور پر جیل حکام کے خلاف شکایت کرنا پسند کریں گے؟

ج: مجھے شکایتیں کرنے کی عادت نہیں ہے۔ ایسا کر کے اپنے قید کرنے والوں کی اذیت پسندی کو تسکین نہیں دینا چاہتا۔ جو بھی جیل میں ہوتا ہے اس کا سامنا کرتا ہوں۔

س: بھٹو، ضیاء اور مسز گاندھی میں سے آپ کسے زیادہ قابل تعریف سمجھتے ہیں؟

ج: میں لوگوں کی محض اس لئے تعریف نہیں کرتا کہ انہیں اقتدار پر براجمان ہونے کا موقع ملا ہے۔ کیونکہ یہ چالپوسی ہے، میں کسی کی شخصیت میں کوئی خوبی دیکھتا ہوں تو تعریف کرتا ہوں۔

س: آپ کی آخری خواہش کیا ہوگی؟
ج: میں اپنے نظریاتی ساتھیوں سے کہوں گا کہ وہ بدترین حالات میں بھی ثابت رہیں اور مشترکہ مقاصد کے حصول کیلئے جدوجہد کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شعرائے کرام کا خراج عقیدت

مرنے کا ہنر سکھا گیا تو..... احمد فراز

کو آنکھ سے دُور جا چکا تو
روشن ہے مگر چراغ سا تو
محروم لبوں کا حرف زندہ
مظلوم دلوں کا ہموں تو
میں بھی تیرا ہم سفر تھا لیکن
میں آبلہ پا تھا برق پا تو
زندوں کے عذاب تک رہا میں
اور منزل دار تک گیا تو
دشمن کے حصار میں اکیلا
لشکر کے مقابلے پہ تھا تو
کب قتل ہوئی ہے سچ کی آواز
خوشبو کی طرح ہے جا بجا تو
اے جان جہاں سر فروشاں
لیا ئے وطن کا دلربا تو

تھا تذکرہ مسیح و منصور

بے ساختہ یاد آگیا تو
اے کشتہ شب فراز کو بھی
مرنے کا ہنر سکھا گیا تو

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

.....محمد اسراہیل مہجور کاشمیری

مقبول بٹ شہید وہ فرزندہ کاشمیر
جرات میں حوصلے میں جو ایک شیر مرد تھا
آزادی وطن تھی جسے جان سے عزیز
مقصد کی لگن، ولولہ، ہر درجہ درد تھا
اس مقصد حیات کی خاطر وہ رات دن
میدان و دشت و کوہ و بیابان نورد تھا
اس راہ میں مشکلات یقیناً تھیں بے شمار
یہ جذبہ مگر سرد ہوا اور نہ سرد تھا
اس مرد جاں نثار کی ہمت کے سامنے
ہر خطرہ عظیم بھی مانند گرد تھا
یہ پاسدار عزت و ناموس کاشمیر
غیور تھا، ہڈر تھا، شجاعت میں مرد تھا
پردانہ وار شمع وطن پر ہوا نثار
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

حق نواز خان کوٹلی جموں کشمیر

ہم نے سنا، چشمِ فلک نے دیکھا
اک شخص آیا اور کشمیریوں کی روح میں اتر گیا
وہ شخص مقبول بٹ شہید ہے۔
مقبول بٹ رحمۃ اللہ علیہ

..... پر فخر نذیر انجم

اک شہید وفا جاں نثار وطن
جس پہ مازاں رہے گی عروں چمن
بہر آزادی خطہ کاشمیر
فقد جاں دار کے ہو گیا ہے امر
ایک آہنگ تھا اس کی تقریر میں
کس قدر جان تھی اس کی تحریر میں
جب لوح و قلم پر گریں بجلیاں
اپنے خون میں ڈبوتا رہ انگلیاں
بچ کی آواز کا پاسبان بن گیا
جبر کی راہ میں کوہ گراں بن گیا
بڑھ کے زنجیر جو رو ستم توڑ دی
موج خواب فسطائیت موڑ دی
نغمے اُجالا کئے روح جاں ساز سے
رشتے بندھتے گئے اس کی آواز سے
بجھتی چنگاریوں کو ہوائیں ملیں
جذبہ حریت کو صدائیں ملیں

قلبِ مہجور کے دلوں بڑھ گئے
 روحِ جمہور کے حوصلے بڑھ گئے
 سونبو خون کے چشمے اُبلنے لگے
 سرفروشوں کے پرچم اُبھرنے لگے
 کاروانِ سحر کا وہ سالار تھا
 جیشِ ظلمات سے محو پیکار تھا
 تھے ستارہ کہاں دارِ شب گھات میں
 پابجولاں ہوا ایسے حالات میں
 سر جھکایا نہیں آخری دار تک
 وہ رجزِ خواں رہا منزلِ دار تک
 اس کا عزمِ صمیم و ثبات قدم
 لوحِ تاریخ پر ہو گیا ہے رقم
 ماسٹر عبدالرحمان مرزا اسلام گڑھ

وہ بیکِ عزم و ہمت تھا وہ مینا رہ نور تھا
 وہ مشعلِ راہِ مظلوماں، وہ لائقِ صد تحسین ہے
 کھولے تو کوئی اپنی سماعت کے درپے
 آواز اس کی آج بھی آواز اذیاں ہے

اس قدر برہم ہوا قتلِ سفارت کا پر
 بند نے لٹکا دیا مقبول بٹ کو دار پر
 کیا خبر اُس کو شہیدِ حریت کی موت سے
 نغمہء ہستی لکھا ہے وقت کی دیوار پر۔
 مظفر وارثی

شہید بابائے قوم کے تحریر کردہ
چند خطوط جو ان کی شخصیت اور نظریات
کو جاننے کا بیش قیمتی خزانہ ہیں۔

تعارف مکتوبات الیمہم (بہ ترتیب حرف تہجی)

شعور فردائیں جن خواتین و حضرات کے نام مقبول ہٹ کے مکتوبات شامل ہیں ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

(۱) ارشد محمود انصاری میرپور کے رہنے والے ہیں۔ مقبول ہٹ شہید کے نظریاتی پیروکاروں میں سے ہیں۔ جب ہٹ صاحب نے انہیں تھانڈ جیل سے خطوط لکھے وہ سعودی عرب میں سلسلہ روزگار قیام پذیر تھے۔

(۲) ایڈووکیٹ محمد اصغر ملک کوٹلی کے رہنے والے ہیں۔ ملک غلام سرور (برطانیہ) ان کے بڑے بھائی ہیں۔ موصوف وکالت کے پیشے سے وابستہ ہیں اور مقبول ہٹ شہید کے دیرینہ ساتھی ہیں۔ ان کی ساری زندگی نظریاتی تحریکی سرگرمیوں میں گزری۔ آج کل جموں کشمیر نیشنل فرنٹ سے وابستہ ہیں۔

(۳) محمد اعجاز ملک کوٹلی کے رہنے والے تھے۔ وہ لاہور جیل سے تھے اور کچھ عرصہ کوٹلی میں وکالت بھی کرتے رہے۔ وہ گولگاہائی جینٹل کس کے سلسلے میں شاہی قلعہ لاہور میں پابند سلاسل بھی رہے۔ جنوری 1976ء کا واقعہ ہے کہ ایک صبح ملک اعجاز اور مقبول ہٹ شہید ڈاکٹر فاروق حیدر کے گھر سے صدر بازار راولپنڈی کی طرف موٹر سائیکل پر سوار تھے کہ راستے میں انہیں حادثہ پیش آگیا۔ ڈرائیونگ ملک اعجاز کر رہے تھے اس لئے حادثہ میں انہیں سر پر شدید چوٹ آئی جس سے وہ بے ہوش ہو گئے اور کئی روز تک اس حالت میں سی ایم ایچ میں داخل رہے۔ جب ہوش آیا تو ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہ تھی۔ ہٹ صاحب کو معمول چوٹ آئی۔ ملک اعجاز نے ذہنی عارضے میں ہی وفات پائی۔

(۴) اکرام اللہ جسوال کشمیر کے بھارتی مقبوضہ علاقے سے ہجرت کر کے آزاد کشمیر میں آباد ہوئے۔ 1947ء سے پہلے بھی اور بعد میں بھی فوج میں تعینات رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد غم روزگار کے ساتھ ساتھ کشمیر کی قومی آزادی کیلئے محاذ رائے شماری کے پلیٹ فارم سے سرگرم عمل رہے۔ کشمیر کی

قومی آزادی کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چند سال قبل وفات پا گئے۔ مرحوم میر پور شہر میں دفن ہیں۔

(۵) جاوید مقبول بٹ مقبول بٹ شہید کے فرزند ہیں۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے فارغ التحصیل ہیں۔ آجکل پشاور میں بطور ایگریکلچر آفیسر تعینات ہیں۔

(۶) جی ایم مفتی مقبول بٹ شہید کے لڑکپن کے دوست ہیں۔ دونوں دوست یکے بعد دیگرے مقبوضہ کشمیر سے مہاجر ہوئے اور کچھ عرصہ پشاور میں اکٹھے رہے۔ بعد ازاں مفتی صاحب نے مظفر آباد سکونت اختیار کر لی۔ موصوف آزاد کشمیر کے مامور صحافی ہیں اور گزشتہ کئی برسوں سے منت روزہ ”تلاید“ شائع کر رہے ہیں۔

(۷) رشید مظفر عباس پور آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ یہ عرصہ دراز سے بسلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ رہنمہ مظفر خان کی وساطت سے یہ بٹ صاحب کی شخصیت اور نظریات سے متعارف ہوئے۔ ان کے نام مقبول بٹ شہید کا ایک خط دستیاب ہوا ہے۔

(۸) شوکت مقبول بٹ مقبول بٹ شہید کشمیر کے چھوٹے فرزند ہیں۔ لاہور بھوٹ ہیں اور زمانہ طالب علمی سے ہی باپ کی نقش قدم پر چلتے ہوئے جدوجہد آزادی میں سرگرم عمل ہیں۔ آج کل جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے مرکزی صدر ہیں۔ موصوف مظفر آباد میں سکونت پذیر ہیں۔

(۹) محمد عارف کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے۔ یہ عرصہ دراز سے برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں۔ انہوں نے برطانیہ سے مقبول بٹ شہید سے خط و کتابت جاری رکھی۔

(۱۰) انصاری عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ محاذ رائے شماری کے بانیوں میں سے ہیں۔ محاذ کے مرکزی صدر بھی رہے۔ موصوف مقبول بٹ شہید کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ انہیں خود مختار کشمیر کی جدوجہد میں کئی بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ آزاد کشمیر کی نوجوان نسل میں فکری بیداری کرنے میں انصاری صاحب نے قابل قدر کام کیا۔ موصوف ممتاز قانون دان اور ہرگز دانشور ہیں۔

(۱۱) عہد اعزیز بٹ مقبولؒ بٹ شہید کے سکے چچا تھے۔ دونوں چچا بھتیجا 1957 میں مقبوضہ کشمیر (ب) رہمولہ سے نقل مکانی کر کے آزاد کشمیر آ گئے اور پھر پشاور میں سکونت اختیار کر لی۔ عزیز بٹ پیشے کے اعتبار سے ٹیلر ماسٹر تھے۔ موصوف 1991 میں پشاور میں ہی فوت ہوئے اور وہیں دفن ہیں۔

(۱۲) عذرا میر جی ایم میر کی بیٹی ہیں۔ آج کل ایبٹ آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ عذرا کے نام شہید کا ایک تاریخی خط موجود ہے۔ انہوں نے کوٹ کھپت جیل لاہور سے لکھا تھا۔ ان دنوں بٹ صاحب گنگا ہائی جینٹک کیس کے سلسلے میں پابند سلاسل تھے۔

(۱۳) بیگم عفت فاروق ڈاکٹر فاروق حیدر کی اہلیہ ہیں۔ اس عظیم خاتون نے مقبولؒ بٹ شہید اور ان کے تحریری دوستوں کی بہت خدمت کی۔

(۱۴) میاں غلام سرور سرینگر کے رہنے والے ہیں۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے 17 اگست 1971 کو مقبولؒ بٹ شہید کے نام مقبوضہ کشمیر سے پہلا خط لکھا۔ میاں صاحب کے نام مقبولؒ بٹ شہید کے دو مکتوبات دستیاب ہوئے ہیں۔ موصوف نے آج کل پاکستان میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ ☆

(۱۵) ملک غلام سرور کوٹلی کے رہنے والے ہیں۔ آج کل برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں۔ ملک صاحب کے والد برٹش آرمی میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر تھے۔ 1947ء کی جنگ میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ جدوجہد آزادی کا یہی جذبہ اپنے فرزندوں ملک غلام سرور اور ملک اصغر میں بھی پیدا کیا۔ ملک غلام سرور مقبولؒ بٹ کے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ برطانیہ میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کی بنیاد ڈالی گئی تو ملک صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ موصوف کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے 18 جنوری 1980 کو تہاڑ جیل دہلی میں مقبولؒ بٹ شہید سے ملاقات کی۔ انہوں نے خط و کتابت کے ذریعے بٹ صاحب سے مسلسل رابطہ رکھا۔

(۱۶) ڈاکٹر فاروق حیدر ☆ مقبولؒ بٹ شہید کے انتہائی قریبی دوست اور نظریاتی ساتھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقبولؒ بٹ شہید نے اپنے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب کو ”برادر عزیز“ کہہ کر مخاطب کیا۔

کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تہاڑ جیل میں بھی بٹ صاحب سے مسلسل رابطہ رکھا۔ ان کے نام شہید کے کافی خطوط موجود ہیں۔ ڈاکٹر فاروق حیدر نے سفر و حضر میں مقبول بٹ شہید کا ساتھ دیا۔ جانی و مالی قربانی دی اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ موصوف پیٹے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں لیکن وطن آزادی کے لئے فکری و عسکری محاذ پر بھی سرگرم عمل میں ہیں۔ راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں۔

(۱۷) راہبہ مظفر خان راہبہ مظفر جان مظفر آباد کے رہنے والے ہیں۔ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے سینئر نائب صدر ہیں۔ راہبہ صاحب نے مقبول بٹ شہید کو قریب سے دیکھا اور ان کے نظریات و خیالات سے متاثر ہو کر خود مختار کشمیر کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ راہبہ صاحب بسلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم تھے، جب مقبول بٹ سے ان کی مراسلت ہوئی۔ ۳۰ ☆

(۱۸) محمد مقبول بٹ ماسٹر محمد مقبول بٹ ماسٹر ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کے زیر قبضہ کشمیر سے ہجرت کر کے آزاد کشمیر آ گئے اور ایبٹ آباد (پاکستان) میں سکونت اختیار کی۔ ماسٹر صاحب نے تحریک آزادی کشمیر میں مقبول بٹ شہید کے شانہ بشانہ کام کیا۔ مقبول بٹ شہید کی عدم موجودگی میں ماسٹر صاحب نے ان کے بیوی بچوں کے سر پر دست شفقت رکھا۔

(۱۹) محمد یوسف زرگر محمد یوسف زرگر مقبول بٹ شہید کے لڑکپن کے دوستوں میں سے ہیں۔ انہیں حریت پسندانہ سرگرمیوں کی پاداش میں مقبوضہ کشمیر سے آزاد کشمیر و حلیل دیا گیا۔ یہاں آ کر موصوف مسلم کانفرنس سے وابستہ ہو گئے لیکن جب بٹ صاحب کی ولولہ انگیز قیادت میں محاذ رائے شماری نے خود مختار کشمیر کیلئے جدوجہد شروع کی تو زرگر صاحب بھی اس قافلے سے آن ملے۔ زرگر صاحب مظفر آباد میں مقیم ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۷ میاں غلام سرور صاحب سری نگر واپس آئے تھے۔ کینسر کے موزی مرض میں مبتلا رہے اور دلیرانہ وار اس بیماری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے وفات پا چکے ہیں۔ ۲۶۷ ڈاکٹر فاروق حیدر نے ہجرت کشمیر کی مزاحمتی تحریک کے سنیر قائد بورلبریشن فرنٹ کے ایک بانی ممبر ڈاکٹر فاروق حیدر 75 سال کی عمر میں راولپنڈی پاکستان میں انتقال کر

گئے۔ ان کے انتقال کو کشمیر کی مزاحمتی تحریک کے لئے ایک بڑا نقصان قرار دیا گیا ہے۔ وہ گزشتہ دو برس سے علیل تھے اور انہیں وقفے وقفے سے آکسیجن دینا پڑتا تھا۔ 6 اکتوبر کی صبح ان کی حالت کافی بگڑی گئی اور اس دنیا سے چل بسے۔ اکی نماز جنازہ منگل کی شام پشاور روڈ پر ادا کی گئی اور سہ ماہیستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ میں کشمیری سیاسی قیادت، صحافیوں، وکلاء اور تاجروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ سربنگر میں بھی ڈاکٹر فاروق حیدر کی غائبانہ جنازہ منگل کو سہ ماہی سربنگر میں انجام دی گئی، جس میں علیحدگی پسند لیڈروں نے مرحوم کو تحریک حریت کا ستون قرار دیتے ہوئے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ نماز جنازہ میں لبریشن فرنٹ چیئرمین محمد یاسین ملک کے علاوہ دوسرے سرکردہ قائدین نے اس میں شرکت کی۔ محوں کے رکھنا تھا بازار میں جنم لینے والے ڈاکٹر فاروق حیدر کا خاندان 1947 میں فرقہ وارانہ تشدد کا نشانہ بن گیا اور فاروق حیدر اس فرقہ وارانہ تشدد میں اپنے والدین کو کھو بیٹھے، جس کے بعد فاروق حیدر اپنے کئی رشتہ داروں کے ساتھ راولپنڈی پہنچے، جہاں کامیاب ہوئے۔ پاکستان میں انہوں نے نیشنل میڈیکل کالج لکھنؤ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور وہاں کامیاب ڈاکٹر بن گئے۔ فاروق حیدر کو کشمیر کی آزادی کے ساتھ کافی دلچسپی تھی اور انہوں نے اپنی تمام کمائی ہوائی دولت کو کشمیر کی تحریک آزادی پر صرف کیا اور کشمیر کی آزادی کے حامی حلقوں میں انہیں کافی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر فاروق حیدر محوں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے بانی ممبر اور محمد مقبول بٹ کے قریب ترین ساتھی تھے۔ فاروق حیدر لبریشن فرنٹ کے یوم تاسیس سے ہی فرنٹ سے وابستہ رہے اور فرنٹ جیہٹن، سٹیروائٹس جیہٹن جنرل سیکرٹری جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے اور اس وقت لبریشن فرنٹ کے سرپرست تھے۔ 1991 میں جب راجہ گاگن پاشا کی حکومت کی دعوت پر پاکستان گئے تو اس وقت ہندوستان کی حکومت کے کہنے پر ڈاکٹر فاروق حیدر کو دو ماہ تک اپنے گھر میں نظر بند رکھا گیا جبکہ ڈاکٹر فاروق حیدر گنگا ہائی جینٹل کیس میں لاہور میں قید رہے۔ ڈاکٹر فاروق حیدر کے ساتھ بتائے ہوئے لٹھوں کو یاد کرتے ہوئے لبریشن فرنٹ کے سربراہ محمد یاسین ملک کا کہنا ہے ”جن 1988 میں پہلی بار میں اشتقاقی مجید والی کے ہمراہ ڈاکٹر فاروق حیدر سے راولپنڈی میں ملا اور ان کی محبت اور شفقت کو ہم کبھی بھول نہیں سکتے ہیں، انہوں نے ہمیں پناہ دی ہمیں اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے“۔ محمد یاسین ملک کا کہنا ہے کہ بغلی محبت اور شفقت ڈاکٹر حیدر نے ہمیں دی، ہمیں شاکہ دی کسی اور نے ہمیں اتنی محبت اور شفقت دی ہو۔ ملک کہتے ہیں ڈاکٹر فاروق حیدر کروڑوں کی جائیداد کے مالک تھے اور راولپنڈی کے کامیاب ترین ڈاکٹر تھے مگر انہوں نے اپنی ساری کمائی کشمیر کی تحریک آزادی کے لئے فوج کی اور وہ ایسا رکاز ایک مجسمہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر فاروق حیدر کشمیر کی تحریک آزادی کے لئے قوت کا ماخذ تھے اور اس تحریک کے تئیں ان کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یاسین ملک نے کہا کہ تحریک آزادی کیلئے جس خلوص، تہن دہی، اور لالچ کے بغیر ڈاکٹر فاروق حیدر نے کام کیا ہے اس کی برہی کما شاکہ کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر حیدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کافی تعداد میں اہل اویسی پارٹے نوجوانوں کو پناہ دی، جس کی وجہ سے 1990 کے آس پاس ان کا گھر بورنگنگ ون نوجوانوں کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ صدر

بازار اولپنڈی میں ان کے کلینک پر کشمیر کی تحریک آزادی سے متعلق مینگیس منعقد ہوئی تھیں اور جس کی وجہ سے 1991 میں ان کے میڈیکل کلینک کو جتانے کے لئے وہاں دھا کر بھی کیا گیا جس میں 22 افراد جن میں زیادہ تر بھارتی تھے ہلاک ہوئے۔ ۳۶ سالہ مظفر صاحب کی تحریک آزادی جموں کشمیر کیلئے کاوشیں ہماری تاریخ کا زریعہ باب ہیں۔ آنجناب کی سر فرم امریکہ میں آباد رہے اور وہاں بھی آزادی کی مشعل لئے برسرِ جدوجہد رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جی ایم مفتی کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پشاور/22 مئی 1960ء

برادر مفتی صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط آج سے کچھ روز قبل مل چکا ہے مگر جواب دینے میں دو دن کی تاخیر ہوئی۔ اصل میں جیسا کہ آپ کو خود ہی معلوم ہے میرے امتحانات نزدیک آرہے ہیں۔ اس لئے آج کل پڑھنے کا سوچ رہا ہوں ☆ اگرچہ اس معاملے میں بھی محض خیالی چیزیں ہوتی رہتی ہیں۔ خیر یہ ضرور ہے کہ اب پڑھنے کا احساس شدید ہو گیا ہے۔ آپ کے گزشتہ خط کا دانستہ جواب نہیں دیا اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی بلکہ اس لئے کہ آپ ایک طویل دورے پر روانہ ہوئے تھے۔ پہلے کاغان اور پھر راولپنڈی۔ خیال تھا جب تک آپ کسی سٹیشن جائیں خط لکھنا بے فائدہ نہ ہو۔

بھائی آپ کا خط پڑھ کر ایک طرف خوب قہقہہ لگاتا ہوں اور دوسری طرف نگاہوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ پھر اپنے ان قہقہوں کو زہرِ خند میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ گزشتہ دنوں کشمیر سے ایک شاعر ۳۶ دوست کا خط آیا تھا۔ کم بخت نے خط کیا لکھا کہ پورا ماضی سوز و گداز کے ساتھ پھر یاد دلایا ہے۔ طبیعت کئی دنوں تک اس رعبی اور ہواں ٹھکانے سے دور ہو گئے۔ اب بتائیے سوائے رونے کے اور کیا چارہ تھا۔ آپ نے جو حکم کیا ہے اس کی تعمیل ہوگئی مگر آپ نے نکاح

کو ملتوی کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس پر ابھی غور کرنے کی ضرورت ہے ☆۳۰۔ آپ ضرور ملنے تو باتیں ہو گئی۔ میرا پنڈی آجما تو فی الحال ناممکنات میں سے ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے لمحے بھر کی بھی فرصت نہیں۔ میں نے اب یہ سوچ رکھا ہے کہ امتحانات ختم ہونے سے پہلے کہیں باہر نہ جاؤں۔ اسلئے آپ آئیے اور ضرور آئیے۔ ساتھ ہی چراغ الدین ☆۳۱ سے ضروری بات چیت بھی کیجئے۔ بلکہ نمونے اور ان کے زرخ بھی ساتھ لائیے۔ سائیکلون اور لیڈی ہملٹن ہی عام طور پر مل سکتا ہے۔ ☆۵۵ خیر آپ اس سلسلے میں ضروری تفصیلات خود ہی متعین کریں۔ میرے وہاں آنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ باقی آپ جس ذہنی کوفت کا شکار ہیں اس کو دماغ سے یکسر محو کر ڈالیں۔ انسان پر آزمائشیں آجاتی ہیں اور ان سے کامیابی کے ساتھ گزرنا ہی انسان کی اصل معراج ہے۔ باقی آپ گھبرانے کے بغیر ہی کام کرتے رہیں۔ آپ نے جو اپیل کی ہے اس کے انجام سے باخبر کریں ☆۶۰۔ اللہ تعالیٰ شاید آپ ہی کے حق میں فیصلہ کر لے۔ میں آپ کی کامیابی کیلئے دعا کروں گا۔ باقی میری طرف سے جو بھی عملی مدد ممکن ہوگی میں وہ کرنے کیلئے تیار ہوں۔ آپ اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس نہ کریں۔ وقت آنے پر آپ کو خود ہی اس کا اندازہ ہوگا۔ لیکن آپ ضرور تشریف لائیں۔ تمام مسائل پر یہاں ہی بات چیت ہوگی۔ ہاں تو آپ سے ایک بات کرنی بھول گیا۔ آج جب انجام کے دفتر آ رہا تھا تو مقبول کشمیری ☆۷۱ نے اپنے انسانی انداز میں ”دفتر“ کی کھڑکی پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ شاید کوئی رومانوی ناول ہوگا۔ خیر میری طرف اُس نے خواہ مخواہ دیکھا اور میں اس کے انتظار میں ہی تھا، میں نے سلام کیا اور آپ کے خط کا پیغام دیا۔ کہنے لگا ”ڈاکیا صاحب آپ کا شکریہ“۔ میں نے جواب دیا ”ایک سچے اور مخلص دوست کا ڈاک یہ بنا اس سے بہتر ہے کہ ایک ”مخصوص“ دوست کا شناسا بن جاتے اور وہ بھی ایسا پھول جوشہد کی کئی کھٹیوں کیلئے رس بہم پہنچائے“۔ خیر وہ الوکیا سمجھتا۔

ایک اعلان مظفر آباد سے کوہستان میں چھپا ہے کہ مقبوضہ کشمیر کیلئے ڈاک کی ترسیل کی اجازت دے دی گئی ہے۔ معلوم نہیں کس حد تک درست ہے۔ اگر واقعی ایسا ہو جائے تو بڑا اچھا ہوگا۔ یار جب

سے تم گئے ہو ”زندگی زندگی نہیں“ والی مثال بن گئی ہے ☆۸۔ کشمیر سے شاعر دوست نے کچھ بند لکھے ہیں۔ ایک تم کو سناؤں۔

تم بھی ہوتے ہم بھی لاتے تاب غم نہ جہنم زار بن جانا ارم
پرکشش پر سوز بھی ہے اور نفیس یاد آئی ہے تمہاری ہم جلیس

ہاگرو صاحب ☆۹ کے دو خط آچکے ہیں اور اب عنقریب ہی تیسرا بھی آرہا ہوگا۔ یا ایک کام تو کرلو۔ غلام نبی میرا گرل جائے تو اس کو سلام عرض کر کے یہ شکایت کر دو کہ ان کے نام خط ارسال کیا تھا مگر جواب نہ دارو ☆۱۰۔ ان کو میرا پتہ دے کر بتائیے کہ اب آپ کے لکھنے کی باری ہے۔ ان سے اپنا صحیح پتہ بھی لکھنے کیلئے کہہ دیں۔ میں نے ان کو ’یونیورسٹی بک ڈپو‘ کی معرفت خط بھیجا تھا۔ نہ معلوم ان کو ملا۔ اگر ملا تو جواب کیوں نہیں بھیج دیا۔ باقی آئندہ لکھوں گا۔ رات کا ایک نچکا ہے۔ کاپی تیار ہوگئی ہے۔ اس کو دیکھ کر ابھی دفتر سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ☆۱۱ پھر رات بھر سو کر کل کسی اور کام میں مشغول ہو جاؤں گا۔ بھیا اپنے دوستوں کو میرا سلام کہہ دیں۔

خیر اندیش۔۔۔۔۔ محمد مقبول

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆۱۲ مقبول بٹ شہید پشاور یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے طالب علم تھے۔ ☆۲۲ مقبول بٹ شہید کے اس شاعر دوست کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ☆۳۲ مکتوب الیہ مقبومہ کشمیر چلا جاتے تھے اس لئے نکاح کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ ☆۴۲ جے ایچ الدین راولپنڈی صدر میں ایک کشمیری ٹیلر ماسٹر تھے۔ مقبول بٹ نے اپنے دوست جی ایم مفتی سے وعدہ کیا تھا کہ میں جے ایچ الدین سے تمہیں ارزاں نرخوں پر کپڑے سلوا دوں گا۔ ☆۵۲ یہ دو سستے قسم کے کپڑے تھے جو اس وقت کی خواہش میں بہت مقبول تھے۔ ☆۶۲ مکتوب الیہ جی ایم مفتی چونکہ KLM کی تحریک میں گرفتار رہ چکے تھے۔ چنانچہ چند کارڈن کالج کے طالب علم کی حیثیت سے انہیں جو ٹھکانہ ملا تھا وہ بھی بند کر دیا گیا جس کے خلاف مفتی صاحب نے اپیل کی تھی۔ ☆۷۲ مقبول کشمیری خفیہ انجمنی کا ایک اہل کار تھا۔ وہ روزنامہ امروز میں بھی کام کرتا تھا۔ اس کا آبائی تعلق بارہمولہ سے تھا۔ ☆۸۲ جی ایم مفتی نے ۱۹۵۹ء

کے آخر میں تقریباً چھ ماہ تک بٹ صاحب کے ساتھ پشاور میں قیام کیا تھا۔ ۱۹۶۵ء ہاگرو صاحب غالباً مقبول بٹ شہید کے کلاس فیلو تھے۔ ۱۹۶۰ء غلام نبی منظر آج دہائی تھے۔ وفات پانچلے ہیں۔ ۱۱ ستمبر ۱۱ مقبول بٹ شہید ان دنوں روزنامہ ”انجام“ میں بطور سب ایڈیٹر کام کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عبدالحق انصاری کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

ریکس ہوٹل راولپنڈی/22 دسمبر 1970ء

محترم عبدالحق انصاری صاحب

سلام مسنون:

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہونگے۔ میں نے پاکستان کی بدلتی ہوئی سیاسی حال کے پیش نظر جماعت کی سیاسی مہم کے سلسلہ میں بعض اہم مسائل پر غور و خوض کرنے کی غرض سے چند دوستوں کو صلاح مشورے کے لئے 27 دسمبر اتوار کو لاہور میں طلب کیا ہے۔ اس صلاح مشورے میں آپ کی موجودگی لازمی ہے۔ میں انشاء اللہ 26 دسمبر کو بعد دوپہر کسی بھی وقت میرپور میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوں گا تاکہ وہاں سے ہم اکٹھے لاہور کے لئے روانہ ہو سکیں۔ مجھے آپ کی صحت کی کمزوری کا پورا لحاظ ہے مگر موجودہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم سرعت کے ساتھ آگے بڑھیں تاکہ منزل قریب تر ہو سکے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ یہ تکلیف کو ادا فرمائیں گے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو چوہدری شہباز خان صاحب ☆ اور صوفی محمد زمان کو بھی آمادہ کر لیں۔ میرا خیال ہے ان کی موجودگی سودمند ثابت ہوگی۔ خیر اندیش/محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆ چوہدری شہباز صاحب آج کل برطانیہ میں قیام پذیر ہیں۔

ڈاکٹر فاروق حیدر کے نام

کوٹ لکھپت جیل لاہور

15 دسمبر 1972ء

برادر عزیز

السلام علیکم

”آپ کا نوازش نامہ کافی عرصہ ہوا ملا تھا۔ مگر عدالت کی تعطیلات اور کسی رفیق کے عازم پنڈی نہ ہونے کے باعث جواب نہ دے سکا۔ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی تشویش قابل فہم ہے۔ مگر یہ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ زنداں آخر زنداں ہی تو ہے۔ رہی جھکنڈیاں، یہ تو ہمارا دل پسند زیور ہے۔ آپ شاید محسوس نہ کرتے ہوں مجھے تو ان کڑیوں سے پیار ہے۔ اور اب تو ہم خاصے ”Jail bird“ بن چکے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مہتاب باغ، سرینگر کا سینٹرل جیل، مظفر آباد کا دلائی کیپ اور لاہور کا رسوائے زمانہ شاہی قلعہ بھی ہم سے ایمان و ایقان کی قوت صلب نہ کر سکے۔ قید بند کی موجود صعوبتیں تو محض رسمی ہیں۔ ان سے کیا اثر قبول کیا جاسکتا ہے۔ ویسے آج کل ہم چکی بند ہیں اور رسوائے ان لحاظ کے جو ہم پیشی کے دوران اکٹھے گزارتے ہیں باقی وقت حکام جیل کے حکم کے مطابق تنہائی میں گذرتا ہے۔

اس ملک کے قید خانے بھی عجیب ادارے ہیں جہاں زندگی کی روشیں حکام کے تبادلوں کے ساتھ ہی بدلتی رہتی ہیں۔ انسانوں پر مشتمل ان قید خانوں کے ماحول اپنی شاہانہ رنگ میں آتے ہیں تو انسانوں کو دی جانے والی اذیت میں انہیں ایک کونہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ ان کی سیاہ و فانی بجائے خود مطالعہ کا ایک مواد ہے۔ بڑا ہی دلچسپ مواد۔ بیسویں صدی کے ان جابلوں کو، جنہیں اپنی جھوٹی صلاحیتوں پر بے جا پندار (گھمنڈ) ہے، یہ کون سمجھائے کہ تم، ہمارے اطوار، ہمارے ضابطے اور قوانین ایک بے معنی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس نمائش پر قائم تمہارا پندار

اپنا مہمہ آپ چڑانے والی بات ہے۔ ویسے اس بازگیری میں بھی تفریح کا ایک پہلو ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لئے دل و دماغ حاضر ہوں۔ رہے ”ظلمتوں کے سینے“ یہ تو چاک ہونے کے لئے ہی وجود پاتے ہیں اور حق کا سورج طلوع ہو کر ہی رہتا ہے۔ آپ کو یہ کیا سوچھی کپڑی کی ٹھنڈی ہواؤں کا ذکر کر دیا اور یوں لاہور کی گرمی کی شدت کا احساس زندہ کر دیا۔ اپنے یہاں تو اب گرمی اور خشکی کا احساس ہی تقریباً مٹ چکا ہے ۲۶۔ یہ اب کو یا قصہ پارینہ ہے جو صرف یادوں کے ساتھ آشنائی حاصل کرنے کے بعد اب اپنے اور پر فارسی کا وہ شعر صادق آتا ہے، جس میں شاعر نے کیا خوب کہا تھا۔

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف از دوزخیاں پر اعراف بہشت است ۲۷

آزمائش کا یہ مرحلہ واقعہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور اس میں بقول آپ کے ہمارا کیا قصور۔ میرا خیال ہے کہ نومبر کے آخر تک قانونی موٹنگا فیوں کی یہ بے ہودہ ورزش اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گی۔ رہا اصل فیصلہ وہ تو میدان کا رزاعی میں ہوگا۔ خواہ ”انصاف و قانون کے مدعی“ اپنے موقع کی سیاسی کسی بھی عنوان صرف کیوں نہ کریں۔ آپ کی تحریر کردہ نظم کے اشعار بہت پسند آئے۔ بڑی حد تک حسب حال ہے۔ رجعت پسندی اور فرسودگی کے علمبردار اگر الوؤں کی اس منظوم گفتگو سے بھی کوئی سبق حاصل نہ کریں تو پھر ان کی شوئی قسمت پر سوائے آنسو بہانے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ تعمیر مکان کی تکمیل پر مبارکباد قبول فرمائے۔ نام دونوں سعید ہیں۔ ”محاذ منزل“ کچھ زیادہ ہی دل کو بھاتا ہے۔ ویسے آپ کی پسند ہماری بھی پسند۔ آپ کی وہاں منتقلی بہتر ہے۔ اس مقام سے ویسے بھی ہم سب کا خاص لگاؤ ہے۔ کافی عرصے سے بچوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آخر اطلاع کے مطابق وہ ایٹ آباد میں مقبول صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ آپ کے جذبات خیر۔ گالی کا شکریہ۔ کوگی، کوشی اور دوسرے تمام احباب اور عزیزوں کو میرا سلام کہہ دیں۔ بھابھی صاحبہ اور ہمشیرگان کو سلام عرض کریں اور عزمہ اور میز کو پیار۔ ان سے میرا ذکر کرنا نہ بھولنے گا۔ آخر میں اپنے رفیقان زنداں کا محبت بھر اسلام۔ آپ کا بھائی / محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۵۱ قبول ہٹ شہید نے یہ خط ڈاکٹر فاروق حیدر مرحوم کو کوٹ لکھتے جیل لاہور سے لکھا۔ ان دلوں وہ گنگا ہائی
چینگ کیس کے سلسلے میں زیر حراست تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو "برادر عزیز" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ۱۵۲ قید خانے
کے پرندے ۱۵۳ حصول مقصد کی خاطر جسم و جان کی اذیتیں برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں تو پھر سردی اور
آرام و تکلیف کا احساس واقعی مٹ جاتا ہے۔ ۱۵۴ ترجمہ: "جنتی حوروں کیلئے اعراف دوزخ کی مانند ہے اور اگر
دوزخیوں سے پوچھا جائے تو ان کے نزدیک اعراف ہی جنت ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یوسف زرگر کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیپ جیل لاہور/30 جنوری 1973ء

برادر زرگر صاحب

السلام علیکم!

یقین جانیں کہ آپ اور آپ کی بے لوث محبت سے ہی ظلمت کے ان گھٹا ٹوپ
اندھیروں میں امیدوں کے چراغ روشن ہیں۔ پھر بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کی یاد بھولنے کے لئے
بھی ذہن سے محو ہو جائے۔ اپنے لئے تو آپ جیسے دوستوں کا خلوص اور جذبہ ایثار و قربانی ہی سب
سے بڑی متاع ہے۔ ایک ایسی متاع عزیز جس پر فخر کیا جاسکتا ہے اور بھروسہ بھی۔ پرسوں ہی نسیم
صاحب ☆ اٹلے آئے تھے۔ ان کے ساتھ عبداللہ ☆ بھی تھے۔ ان کی زبانی آپ کا پیغام
محبت ملا اور اور وہ پر خلوص تھنہ بھی جو شاید آپ نے ماضی کی یادیں تازہ کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔
☆ ماضی کی یہ یادیں بھی کیا عجیب شے ہیں۔ اتنی حسین کہ ان کے افسانوی ہونے کا گمان ہوتا
ہے اور دوسوڑ سے اس قدر بھرپور کہ دل تڑپ اٹھتا ہے۔ حال کے سیاسی رشتوں کو تو جانے دیجئے،
آپ کے اظہار محبت نے یادوں کے سمندر میں گویا تالیم پیدا کر دیا۔ میں تو گھنٹوں ماضی کے اس

حسین دور میں کھویا رہا جب اوائل جوانی میں ہم لوگ ایک والہانہ جذبے کے ساتھ اپنے محکوم وطن کی آزادی کی تحریک میں اپنی اپنی بساط کر مطابق بھرپور حصہ لیتے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے اس وقت بھی اس حسین اور روماں پرورشہر ☆۴ کی گلیاں ہیں جس نے آپ کو جنم دیا اور مجھے پروان چڑھایا۔ وہی گلیاں جہاں کبھی آپ مستانہ دار آزادی کے نعرے لگایا کرتے تھے اور اس جرم حق کوئی کی پاداش میں آزادی کے دشمنوں کے ظلم و ستم کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے چلے جاتے۔ ولند بارہ مولہ پر پڑنے والی سورج کی زرد شعاعیں۔ اس کی سونی فضا میں اور اس شہروں آشوب کے درودیوار یوسف ☆۵ مفتی ☆۶ پرویز ☆۷ اور مجاہد عبداللہ ☆۸ کی والہیت، جذبہ و شوق اور جنگ آزادی سے ان کی دلی وابستگی اور اس راہ میں برداشت کی جانے والی کافتوں کی گواہی دیں گے۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات باعث افتخار ہو سکتی ہے کہ اس رواں تافلے کا شریک سفر تھا اور ان جیسے بے لوث فرائد کی دوستی اور محبت کا امین۔ بھلا وہ منظر بھی بھلائے جاسکتے ہیں جب یوسف اور عبداللہ کی نگلی پٹنیوں پر کوڑے برستے تھے اور شوق آزادی کے جرم میں انہیں سرینگر کے زنداں خانے کا طواف کرنا پڑتا۔ یا پھر وہ احساس درد بھی کبھی محو ہو سکتا ہے جو پرویز اور مفتی کی جبری جا وطنی سے پیدا ہوا تھا ☆۹ کیا وہ شفقتیں فراموش کی جاسکتی ہیں۔ جو بدروز ☆۱۰، ہواباز ☆۱۱ اور پروفیسر مقبول احمد شیخ کے بے داغ سیاسی کردار کا حصہ تھیں؟ یہ تو خیر اللہ کو معلوم ہے کہ قفس کے اس حصے میں پڑے ہوئے ان اسیرانِ بلا کا کیا حال ہے۔ ہمارے لئے ماضی کی ان محبت سے لبریز رفاقتوں کے علاوہ اور کیا باعث اطمینان ہو سکتا ہے۔ یادوں کے اس حسین مرقع کے کتنے ہی گوشے ہیں جو رہ کر ذہن میں ابھرتے ہیں۔ کس کس کا بیان کروں۔ اس کے لئے تو دفتر چاہیے۔ اور رتو اس بات کا ہے کہ اس سلسلے میں نوک قلم سے نکلنے والا ہر لفظ درود گندار کی پنہانیوں کو اپنے اندر سمیٹ جاتا ہے۔ پھر ان رشتوں سے آپ کا دل بھی تو جھل ہو جائے گا۔ اس لئے بس کرتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے درمیان یک کونہ سیاسی رشتہ ہے۔ اور میری ان غیر سیاسی باتوں سے آپ قدرے حیران بھی ہوں گے۔ مگر کیا آپ کو دوستی اور محبت کے

اس لازول رشتے سے انکار ہے جو ہمارے درمیان اس وقت بھی قائم تھا جب آپ سیاسی طور پر ہمارے حریف کیمپ میں شامل تھے ۱۳۶۷ء۔ میں تو لحو بھر کیلئے بھی یہ بات بارو کرنے کو تیار نہیں کہ اس وقت بھی آپ کے دل میں میرے لئے سوائے الفت و مودت کے اور کچھ نہیں تھا۔ اور پھر جب ہمارے سیاسی نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی تو آپ نے مظفر آباد کے اس کنونشن میں اپنی روائتی مستانہ واری کے ساتھ ہماری جماعت میں شمولیت اختیار کر کے اپنے اسی جذبہ محبت کا اظہار انگلیاں آنکھوں سے کیا تھا۔ آپ کے وہ آنسو ہماری لازول محبت کے ماتھے پر تاباں چمکتا ہوا جھومر رہے گا۔ آپ نے عبداللہ کے ساتھ جو کلچے بیچے تھے وہ مل گئے ہیں۔ کہنے کو تو یہ محض کھانے کی عام چیزیں مگر آپ کو نہیں معلوم کہ وطن سے دور اس زنداں خانے میں اس کی خوشبو اور لذت کیا درجہ رکھتی ہے۔ آپ کو بتائی دیتا ہوں، جب میں NLF کی تنظیم سازی کیلئے مقبوضہ کشمیر میں سب سے پہلے بارہ مولہ پہنچا تھا تو اپنے اس عظیم دوست نے جس کی پر عزم اور بے لوث رفاقت تادم گرفتاری میرے ساتھ جاری رہی اور جس کے جوان چہرے پر غم و اندوہ کے طوفانوں میں بھی ایک خوش کن مسکراہٹ کھیلتی تھی، پہلے ہی روز مجھ سے اپنے من پسند کھانے کی فرمائش کی۔ شائد اس کا خیال تھا کہ آٹھ برس کی جا وطنی نے میرے کام و دھن کا مذاق بدل دیا ہو۔ میں نے چھوٹے ہی جواب دیا کہ نمکین چائے، کلچے اور ساگ میری طرف سے لازمی سمجھو۔ باقی جو آپ کی مرضی۔ وہ قدرے حیران ہوا اور میری فرمائش کو کسی حد تک کسر نفسی سمجھنے لگا۔ مگر جب میں نے بالآخر اس وطن کی اشیائے خورد و نوش کے بارے میں اپنی تشنگی کا اظہار کیا اور اسے یہ باور کرایا کہ فرقت کے لمحات میں ماضی کی مانوس چیزوں سے انسان کی شیفتگی کس حد تک بڑھ جاتی ہے اُسے میری بات ماننی پڑی۔ یوں خلوص و محبت کے پیکر، اس بے تکلف مگر مہمان نوازی میں حد درجہ وضع دار دوست غلام محمد شمیم ۱۳۶۷ء جسے طالب علمی کے شوخ زمانے میں بھی ہم اتر اُما (عمہ صاب) ”غلام محمد صاحب“ کہہ کر پکارا کرتے تھے کو مہمان نوازی کے روائتی کشمیری تکلف سے دستبردار ہونا پڑا۔ جذبات میں آکر خط کو یوں ہی طویل کر گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آپ اس سے بور ہوں گے۔ مگر کچھ دل کے ہاتھوں مجبور تھا

اس لئے کہ آپ سے دوستی جو ٹھہری ہے۔ سنائے منظر آباد کا کیا حال ہے۔ ہمارے دوسرے دوستوں اور رفیقوں کے مزاج کیسے ہیں۔ اور اپنے لالہ ☆۱۴ کے مزاج کیسے ہیں، اکبر صاحب ☆۱۵ قریشی صاحب ☆۱۶ انڈیر صاحب ☆۱۷ اور حنیف صاحب ☆۱۸ کیسے ہیں۔ حبیب جو ☆۱۹ اور بشیر احمد لون ☆۲۰ کی کیسے گزرتی ہے۔ عبدالستار ☆۲۱ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ ان تمام رفیقوں اور دوسرے ورکروں کو میرا محبت بھرا سلام کہہ دیں۔ عبدالغفار ریشی ☆۲۲ اور مقبول ٹانک ☆۲۳ اور اگر ہو سکے تو محمد یاسین بڑھانہ ☆۲۴ کی خدمت میں میرا آداب عرض کریں۔ کیا میں یقین رکھوں کہ آپ سب کی موجودگی میں تحریک حریت کی وہ شمع جو ہم نے اپنا خون دے کر روشن کی ہے مخالفت اور مخالفت کے طوفانوں میں بھی جلتی رہے گی۔ اور اپنی ضیا پاشیوں سے سچائی کے متناشیبوں کو راہ حق کے پہچاننے میں مدد دیتی رہے گی۔ اگر ایسا ہے تو زندان کی یہ صعوبتیں میرے اور میرے ساتھیوں کیلئے پرکاشہ کے بھی نہ ہوں گے۔ دیکھیے اپنے ارشاد بچھ صاحب اور مفتی صاحب کو میرا سلام کہنا نہ بھولنے گا۔ اپنی خیریت کی اطلاع کبھی کبھی دیا کریں۔ امید ہے آپ اور بھائی جان دونوں خرم ہوں گے۔

فقط و سلام! آپ کا بھائی/مقبول احمد بٹ

☆☆☆☆☆☆

☆۱ نسیم لون کو جرنلہ پاکستان میں رہائش پذیر ہیں۔ مقبول بٹ کے مخلص دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔
☆۲ عبداللہ کا تعلق منظر آباد کے علاقہ اہمت سے تھا۔ ☆۳ یوسف زرگر نے مقبول بٹ کو شہید کیلئے کلے بھیجے تھے۔ کلے کشمیر کی خاص سوغات ہے۔ یہ میدے سے تیار کئے جاتے ہیں۔ جنہیں کشمیری لوگ نمکین چائے کے ساتھ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ☆۴ بارہمولہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ مقبول بٹ اسی ضلع کے ایک گاؤں ترہگام میں پیدا ہوئے۔ یہ ضلع اب دو ضلعوں بارہمولہ اور کپورہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ترہگام ضلع کپورہ میں پڑتا ہے۔
☆۵ یوسف زرگر۔ ☆۶ جی ایم مفتی، مقبول بٹ کے دیرینہ دوستوں میں سے ہیں۔ مفتی روزہ فاکر کے لیڈر ہیں۔
☆۷ جیکل منظر آباد میں مقیم ہیں۔ ☆۸ غلام خالق پرویز صاحب میں جن کی کتاب جلا وطن سے ایک اقتباس اس کتاب میں موجود ہے۔ پرویز کا تعلق بارہمولہ سے تھا۔ ☆۹ حاجہ عبداللہ نے تحریک آزادی میں حصہ لے کر پاداش میں سخت آزمائشیں اٹھائیں۔ ☆۱۰ پرویز اور جی ایم مفتی کو کجاہانہ سرگرمیوں کی پاداش میں جبراً کشمیر سے نکال دیا گیا۔ اول الذکر کچھ عرصہ بعد

واپس چلے گئے لیکن مفتی صاحب کیس کے ہو کے رہ گئے۔ ☆ ۱۰ غلام محمد الدین بدرو بخار جلال صاحب بارہمولہ کے رہنے والے تھے تحریک آزادی کیلئے ان کی بڑی قربانیاں ہیں۔ ☆ ۱۱ غلام قادر ہولاز ☆ ۱۲ پروفیسر مقبول احمد شیخ بارہمولہ کالج کے پروفیسر تھے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ نئی نسل کو حریت کا درس دیتے تھے۔ بھارتی حکومت نے ان پر بہت ظلم ڈھائے۔ ☆ ۱۳ یوسف زرگر مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے آئے تو مسلم کانفرنس والوں کے ہتھے چڑھ گئے لیکن جب مقبول ہٹ چھپید مخاڑاے شماری کے صدر بنائے گئے تو زرگر صاحب بھی اس قافلے سے آن ملے۔ ☆ ۱۴ یوسف زرگر ہٹ صاحب کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ ☆ ۱۵ غلام محمد شمیم، ہٹ صاحب کے دیرینہ ساتھیوں میں سے ہیں۔ بارہمولہ کے رہنے والے ہیں۔ ☆ ۱۶ غلام الدین لالہ (مرحوم) پاکستان ہوٹل (منظر آباد) کے مالک ہیں۔ ☆ ۱۷ اکبر پلائی منظر آباد ☆ ۱۸ رشید قریشی مخاڑا کے سرگرم رکن تھے۔ نیند حیات ہیں۔ ☆ ۱۹ حبیب جو ۱۹۶۵ء میں ہجرت کر کے آئے اور مقبول ہٹ کی فکر سے متاثر ہو کر مخاڑا سے وابستہ ہو گئے۔ ☆ ۲۰ بشیر لون منظر آباد میں قیام پزیر ہیں ان کا شمار مقبول ہٹ کے چائے ریپا ہیروں میں ہوتا ہے۔ ☆ ۲۱ عبدالستار کشمیر شال ہوس کے مالک ہیں۔ ☆ ۲۲ عبدالغفار ریشی کا تعلق مقبوضہ کشمیر سے ہے آج کل چکا ر میں رہائش پزیر ہیں۔ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ مقبول ہٹ آخری بار اپنے دوستوں کے ہمراہ انہی کی رہنمائی میں وادی کشمیر میں داخل ہوئے تھے۔ ☆ ۲۳ مقبول ہٹ کا چکا ر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے تحریک آزادی میں مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے۔ ☆ ۲۴ محمد حسین چوہدری آزاد کشمیر کے خوبصورت نعلے وادی لیپاک کے رہنے والے ہیں۔ مقبول ہٹ چھپید جب ۱۹۶۸ء میں سرینگر خیل سے فرار ہوئے تو محمد حسین بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چوہدری صاحب جدوجہد آزادی میں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عذرا میر کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیمپ جیل لاہور

2 اپریل 1973ء

پیاری عذرا بیٹی

اللہ تجھے سدا سلامت رکھے۔

روبینہ بیٹی ☆، تمہاری خالہ ☆، کے ساتھ ۲۶ مارچ کو ملاقات کے لئے آئی تھی اور اس نے تمہارا خط دیا تھا۔ جواب لکھنے میں اس لئے دیر ہوئی کہ دوسرے ہی روز یعنی ۲۷ مارچ کو ہم سب دوستوں کو کہلپور جیل سے منتقل کر کے کیمپ جیل لاہور بھیج دیا گیا۔ اس جیل میں ہم پہلے بھی رہ چکے ہیں مگر پھر بھی یہاں کے نئے ماحول میں کچھ دشواریاں پیش آئیں اس لئے آپ کو جلد ہی جواب نہ دے سکا۔ پیاری بیٹی، تمہارا خط پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ تمہارے خیالات کتنے اچھے اور نیک ہیں۔ اس خط سے اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں تمہارے دل کو احساس کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ ایک بڑی نعمت ہے۔ تمہارا خط پڑھنے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اس چھوٹی عمر میں تجھے ان مشکل حالات کا کتنا احساس ہے جن سے ہم لوگ آج کل گزر رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سوچنے سمجھنے کی قوت میں اضافہ کرے۔ تیرے ننھے سے دل میں اپنی قوم کی غلامی کے باعث جو درد پیدا ہوا ہے وہ بڑھتا جائے اور تو اس قابل ہو جائے کہ کشمیر کی ہر بیٹی فخر سے تمہارا نام لے۔

پیاری عذرا مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم لوگوں نے جو سختیاں جھیلی ہیں ان سے تمہارے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ جس طوفان سے ہم لوگ گزر رہے اس نے تجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کیونکہ ہمارے ساتھ قید و بند اور تشدد و برداشت کرنے والوں میں تمہارے والد محترم بھی

شامل تھے ☆ ۳۔ میر صاحب کی نظر بندی کا خیال آتے ہی میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ تمہاری اور روہینہ کی معصوم صورتیں آ جاتیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ظلم و ستم کی آندھیاں دو اُن کھلی کلیوں کو مرجھانے پر تل گئی ہوں۔ پھر مجھے گذرے وقتوں کے وہ لمحے یاد آتے جب تم اور روہینہ ایٹ آباد کی خوشگوار فضاؤں میں پوہ ☆ ۴ اور ککوہ ☆ ۵ کے ساتھ دنیا کے غموں سے بے خبر ہنسی خوشی اور کھیل کود میں مصروف ہوتیں۔ کوئی سنگدل ہی ہوگا جو تم جیسے چھوٹے چھوٹے اور معصوم بچوں کی پیاری پیاری آنکھوں میں آنسو دیکھنا کو اوارہ کرنا۔ مگر آزادی کے دشمنوں کو یہی منظور تھا۔ جس کسمپرسی اور بے بسی سے تم سبھی دو چار رہے، اس سے ان جیل خانوں میں بھی ہم لوگ بے چین رہے۔ ہم یقین تھا کہ جس آزمائش سے ہم لوگ دو چار ہیں اس نے کو آپ کو ہماری شفقتوں سے کچھ عرصے کے لئے محروم کر دیا مگر اس کے باعث آپ کی سوچ میں انقلاب آجائے گا اور بچپن کی اٹھکلیوں کے ساتھ ساتھ آپ کے احساس میں شدت پیدا ہو جائے گی۔ بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ تم راضی پڑھ کر یہ یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ مجاہدوں کی اولاد ظالموں کی اولاد سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ ظالموں کی اولاد اپنی آنکھوں سے انسانوں پر ظلم ہوتے دیکھتی ہے مگر وہ اُس سے مس نہیں ہوتی۔ مجاہدوں کی اولاد ظلم کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ جب ظلم ہوتا ہے تو وہ خون کے آنسو روتی ہے اور اس میں ظالموں کے خلاف جنگ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ظالموں کی اولاد کو دنیا کی ہر آسائش اور آرام مہیا ہوتا ہے، انہیں کھانے کی ہر قسم کی نعمت، پہنے کو زرق برق پوشاک اور رہنے کو اعلیٰ درجے کی رہائش میسر ہوتی ہے اور وہ اسی میں خوش ہوتے ہیں۔ مگر مجاہدوں کی اولاد دنیا کے آرام اور آسائش کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کی عمارت گرنے والی ہوتی ہے اور اس کو سمار کرنے کی جدوجہد میں ہی ان کو اطمینان اور خوشی ملتی ہے۔ یہ خوشی اور اطمینان نہ تو کسی دنیاوی نعمت سے مل سکتا ہے نہ زرق و برق لباس یا اعلیٰ درجے کی رہائش سے میسر آ سکتا ہے۔ جی بھی تو مجاہدوں کی اولاد کا فخر ہوتا ہے:

ملے خشک روٹی جو آ زادرہ کر تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

پیارے بچے دنیا کی ہر غلام قوم کے بچوں کو نہ صرف ظالم آقاؤں کے ظلم و ستم کو سہنا پڑتا ہے بلکہ آزادی کی جنگ میں اپنے بڑوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنا بھی پڑتا ہے۔ غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو چھوٹے اور بڑے میں تمیز نہیں کرتی۔ غلامی میں جہاں بڑے اور بوڑھے سختیاں اور اذیت ماک تشدد برداشت کرنے پر مجبور کئے جاتے ہیں وہاں بچوں پر بھی اس کے اثرات پڑتے ہیں۔ میں آپ کو صرف چند ایسی باتیں بتاؤں گا جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری قوم کے بچوں کو غلامی کے باعث کیا کیا مصیبتیں برداشت کرنا پڑی ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، تب میری عمر آٹھ یا نو برس کے لگ بھگ تھی۔ اس زمانے میں کشمیر پر ڈوگرہ خاندان کی حکمرانی تھی اور پوری کشمیری قوم غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ غلامی کی ایک بہت بڑی لعنت جاگیرداری ہوتی ہے۔ جاگیرداری اس طرح قائم ہوتی ہے کہ بادشاہ اپنی سلطنت کی زمینیں چند لوگوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ لوگ چونکہ بادشاہ کے وفادار ہوتے ہیں اور رعایا پر ظلم و جبر کرنے میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسلئے ان کی اس خدمت کے بدلے میں انہیں بڑی بڑی زمینوں کا مالک بنادیا جاتا ہے۔ یہ زمینیں ان کی جاگیریں کہلاتی ہیں۔ جاگیردار نہ تو ان زمینوں میں مل چلا تے ہیں اور نہ ہی بیچتے ہیں۔ وہ کوئی محنت نہیں کرتے۔ مل چلا نا، بیچ بونا، اور فصل تیار کرنا کسان کا کام ہوتا ہے۔ جاگیردار کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ جب فصل تیار ہو کر کاٹی جاتی ہے تو وہ آدھمکتا ہے اور کسان کیلئے ایک حقیر سا حصہ چھوڑ کر باقی سارا مانج اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی ہمارے وطن میں جاگیردار مقرر کئے ہوئے تھے ☆ ۶ محنت ہمارے لوگ کرتے اور فصل جاگیردار لیجاتے۔ ہمارے علاقے کی زمینوں کا بھی ایک جاگیردار تھا۔ کوہم نے اس جاگیردار کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے ایجنٹ جن کو کاردار کے نام سے پکارا جاتا تھا، کسانوں سے مانج اور پھل جمع کرتے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا اس برس محض موسمی آفتوں کے باعث کسان جاگیردار کو اتنی مقدار میں مانج فراہم نہ کر سکے جتنی مقدار میں وہ پہلے سے کرتے آئے تھے۔ اس پر جاگیردار کے

کارداروں نے پورے علاقے میں ظلم و تشدد شروع کیا۔ غریب کسانوں کے گھروں اور خلیانوں پر چھاپے مارنے شروع کئے، انکے جسموں پر کوڑے برسائے گئے مگر ان کے پاس تھا ہی کیا جو جاگیردار کو دیتے۔ جب نلہ مقررہ مقدار میں جمع نہ ہوا تو جاگیردار ایک موٹر گاڑی میں سوار ہو کر ہمارے گاؤں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے گاؤں موٹر گاڑی آئی تھی اور ہم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ ہمارے علاقے کے کسانوں نے جمع ہو کر جاگیردار سے بڑی منت سماجت کی کہ انہیں کچھ چھوٹ دی جائے۔ جاگیردار کو پیداوار میں کمی کی پوری تفصیل بتائی گئی مگر وہ کسانوں کی بات ماننے پر تیار نہ ہوا۔ اُس کا اصرار تھا کہ کچھ بھی ہو، کسانوں کے بیٹے بھوکے کیوں نہ مریں اس کے حصے کا اناج بہر صورت پورا کر دیا جائے۔ جاگیردار نے اپنے کارداروں پر بھی غصہ کیا۔ ان کو ہدایت کر دی کہ وہ ہر صورت میں اناج کی وصولی مکمل کر لیں۔ ان کارداروں کو معلوم تھا کہ کسانوں کے پاس جاگیردار کو دینے کیلئے اب کچھ باقی نہیں رہا تھا مگر وہ اس حکم کے سامنے سرتابی کیسے کر سکتے تھے۔ جاگیردار جب یہ ہدایت دینے کے بعد موٹر میں سوار ہونے لگا عین اسی وقت گاؤں کے تمام بچوں سے کہا گیا کہ وہ جاگیردار کی گاڑی کے سامنے سڑک پر لیٹ جائیں۔ اس منصوبے میں کاردار بھی شریک تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں گاؤں کے بچے جاگیردار کی گاڑی کے سامنے لیٹ گئے اور عرض کیا کہ یا تو اناج کی مزید وصولی معاف کر دی جائے یا ان بھوکے بچوں کو گاڑی کے نیچے روند کر ہلاک کر دیا جائے۔ ان بچوں میں خود میں بھی شامل تھا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ اس وقت ایک کہرام مچا ہوا تھا، کیا بچے کیا بوڑھے سبھی اٹک رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر جاگیردار معافی کا وعدہ کئے بغیر واپس چلا گیا تو اس کے بعد کسانوں کے لئے قیامت برپا کر دی جائے گی۔ چنانچہ کسانوں کے ننگ دھڑنگ اور بھوک کے مارے زرد بچوں کی آہ وزاری کو دیکھ کر جاگیردار نے اپنے فیصلے میں کچھ ترمیم کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ صرف ایک واقعہ ہے جس سے تجھے اندازہ ہوگا کہ غلامی کے دور میں ہمارے غریب کسانوں اور ان کے ننھے منے پھول سے بچوں کو جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے کتنے ظلم و ستم برداشت کرنے پڑتے تھے۔ یہ بھی بتا دوں کہ

ہمارے وطن میں عوام کی اکثریت کسانوں پر مشتمل ہے اور ہر جگہ ان کو ایسے ہی واقعات سے دوچار ہونا پڑتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اپنے بھوکے اور ننگے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے ان غیر بکسانوں کو بڑی تعداد میں مزدوری کرنے کے لئے وطن سے نکل کر ہندوستان و پاکستان کے میدانی علاقوں خاص طور پر پنجاب میں در بدر پھر پڑتا تھا۔ انہی مظلوم انسانوں کو یہاں ”ہاتو“ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ سال کے چھ مہینے میدانی علاقوں میں مزدوری کر کے بمشکل کچھ رقم بچا کر واپس وطن جایا کرتے تھے تاکہ اپنے بھوکے بچوں کو روٹی کھلا سکیں۔ یہی حال ان دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کا بھی تھا جو اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کو فروخت کرنے کے لئے برصغیر کے شہروں میں ”پھیری“ کیا کرتے تھے ان ”پھیری والوں“ کے بچے بھی اپنے اپنے ابو کی محبت اور شفقت کو ترستے رہتے تھے کیونکہ غلامی نے ہماری قوم پر جو غربت اور مفلسی مسلط کی تھی اس کے باعث وہ برسوں وطن سے دور روزگاری تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔

جب ہماری قوم میں غلامی کا احساس بڑھ گیا تو اسے صاف طور دکھائی دیا کہ جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات پانے اور عزت کا مقام حاصل کرنے کے لئے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے اور یہ آزادی کا راستہ ہے۔ چنانچہ ہمارے عوام نے آزادی کی خاطر جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں ایک طرف کشمیر کے مجبور مظلوم اور مفلوک انال لوگ تھے اور دوسری طرف ڈوگرہ حکمران، ان کے تنخواہ دار ملازم اور وظیفہ پانے والے بڑے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار۔ یہ جنگ 1931ء میں شروع ہوئی اور اس کا ایک مرحلہ 1947ء میں مکمل ہوا۔ اس جنگ کے دوران ہمارے بے شمار غریب اور بے کس بچوں کو قربانیاں دینی پڑیں۔ کتنے ہی معصوم بچوں کے سہارے ان سے چھن گئے کیونکہ ان کے بڑے بوڑھے ظالموں کے خلاف جنگ میں شہید ہوئے اور اس طرح ان کے بچے یتیم ہو گئے۔ تمہارے جیسی کتنی ہی بچیوں کو برس ہا برس تک پیرا محبت سے اس لئے محروم رہنا پڑا کہ ان کے ابو ظلم اور غلامی کے علمبرداروں کے ہاتھوں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دئے گئے تھے۔ اس دوران ہماری قوم کے لاتعداد چھوٹے چھوٹے اور معصوم بچوں اور

بچیوں کو بے رحم حکمرانوں کے ہاتھوں صدمے اٹھانے پڑے۔

پھر 1947 کا ریلہ آیا۔ یہ ایک طوفان تھا۔ حالات نے ایسی کروٹ لی کہ ہم غلامی کے ایک دور سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو گئے۔ ڈوگرہ شاہی ختم ہو گئی مگر اس کے نتیجے میں وطن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصے پر ہندوستان نے فوجی یلغار کر کے قبضہ کر لیا اور دوسرا حصہ آزاد کہلائے جانے کے باوجود آزادی کی نعمتوں سے مالا مال نہ ہو سکا۔ اس طوفانی ریلے میں لاکھوں کی تعداد میں نہ صرف ہمارے بڑے بوڑھے بلکہ نوجوان اور بچے بھی شہید ہو کر امر ہو گئے۔ جموں اور وادی کے میدانوں، پونچھ، مظفر آباد اور میر پور کی پہاڑیوں اور کرگل و لداخ کی چٹانوں میں جذب ہمارے جواں سال شہیدوں کے خون کے ساتھ ہمارے ان گنت بچیوں اور معصوم بچوں کا لہو بھی شامل ہے۔ ان معصوم شہیدوں کی کوئی یادگار تو نہیں البتہ ان کی گمنام شہادت ہماری قوم کے لئے باعث فخر ضرور ہے۔ میں آپ کو کتنے ہی ایسے معصوم اور پھول جیسے بچوں اور بچیوں کی کہانیاں سناؤں جو اس جنگ میں کام آئے۔ اگر یہ کہانیاں سنانے بیٹھ جاؤں تو ایک بہت بڑی کتاب تیار ہو جائے گی۔ یہاں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ان میں بے شمار ایسے تھے جن کو حملہ آوروں نے اسی طرح گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جیسے موسم بہار میں کسی درخت پر چھپاتی چڑیوں کے جھنڈ پر کوئی بے رحم شکاری ہندوق چلا دے۔ ان میں لا تعداد ایسے تھے جن کو ظلم کے فتنے میں بدست فرقہ پرستوں نے نیزوں اور تلواروں سے اس طرح کاٹا جیسے کوئی خونخوار بھیڑیا بھیڑوں کے گلے میں گھس کر بھیڑوں کی چیر پھاڑ شروع کر دیتا ہے۔

عذرا بیٹی! ہماری محکوم قوم کے بچوں اور بچیوں کی قربانیوں کا یہ سلسلہ 1947ء میں ہی ختم نہیں ہوا۔ یہ اب بھی جاری ہے اس وقت تک جاری رہے گا جب تک پوری قوم آزاد نہ ہو جائے۔ کیا مقبوضہ کشمیر اور کیا آزاد کشمیر، دونوں طرف عوام برابر قربانیاں دے رہے ہیں۔ دونوں طرف سے معصوم بچے اور بچیاں غلامی کے ہیبت ناک سایوں میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ گزشتہ پچیس برس کی مدت میں نہ معلوم کتنے ہی کشمیری بچے آزادی کے دشمنوں کی قتل و غارتگری کے

باعث شہید اور یتیم ہو گئے، کتنے ہی ظلم اور لوٹ کھسوٹ کے باعث بے سہارا ہو گئے اور اس طرح ان سہولتوں سے محروم رہے جو ان کی نشوونما اور تربیت کے لئے ضروری تھیں۔ گزرے ہوئے ان واقعات کی تفصیل لمبی چوڑی ہے۔ ابھی حال ہی میں لندن میں ہندوستانی ہائی کمیشن میں احتجاجی مظاہرہ کے دوران جو دو معصوم شہید ہوئے وہ بھی ہماری قوم کے دو پھول تھے۔ میرپور کے بشارت اور حنیف نے لڑکپن میں جام شہادت نوش کر کے نہ صرف ہماری نوجوان نسل کی پرانی روایات کو تازہ کیا بلکہ مستقبل کے لئے ایک درخشاں مثال بھی چھوڑ گئے۔ کشمیری قوم کے ہر بچے کو ان پر فخر ہونا چاہیے۔ ۶۶ پیاری عذائیں یہ جو باتیں میں نے اُوپر لکھی ہیں ان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ محکوم قوموں کے بچوں کو کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ باتیں اس لئے بھی ضروری تھیں کہ تمہارے ننھے سے دل میں وطن کی آزادی کا زبردست جذبہ موجود ہے۔ شاید اسی لئے تمہارے خط کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا پھر تمہارا وہ عزم بھی قابل تعریف ہے جو وطن کی آزادی کے لئے تم نے کر رکھا ہے اور جس کا اظہار اس خط میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ”ہم اپنے پیارے وطن کشمیر کی آزادی بقاء اور مضبوطی کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کریں گے“ تمہارے اس جذبے اور عزم سے میں بہت ہی متاثر ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں سچائی کے اس راستے پر قائم رکھے۔ تمہارے خیالات ترقی کریں اور تمہاری آرزو پوری ہو۔

اب میں آپ کے خیالات کے بارے میں کچھ لکھوں گا جو آپ نے خط میں بیان کئے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ”ہم پر جو سختیاں اور مظالم ہوئے ہیں ان کی داستان سن کر آدمی کا دل دہل جاتا ہے لیکن بعض سنگدل اور بے سمجھ لوگ، ایسے بھی ہیں جو ایسی داستانیں پڑھ کر خوشی سے پھولے نہ سہاتے ہیں“۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے ظلم کی داستانوں سے وہی لوگ اڑھ لیتے ہیں جو یا تو خود مظالم کا شکار رہے ہوں یا ان کو ظلم کے خلاف جنگ لڑنے کا تجربہ ہو۔ سنگدل اور بے سمجھ لوگ ظلم کی

داستانوں سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ وہ نہ تو ان پر خوش ہوتے ہیں اور نہ ہی مغموم۔ ہاں ایک طبقہ ایسا ضرور ہے کہ ان پر خوش ہوتا ہے، یہ طبقہ ظلم کرنے والوں یا ان کے وظیفہ خوار ایجنٹوں کا ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی آزادی کیلئے ہم نے جو مظالم سہے ہیں اگر ان پر کوئی خوش ہوتا ہے، اچھی طرح سے جان لو کہ وہ پوری کشمیری قوم کی آزادی کا دشمن ہے۔ وہ ظلم اور جبر کا حامی اور حق و انصاف کا دشمن ہے۔ ایسے لوگ قابل نفرت ہوتے ہیں اور یہ دنیا میں ہی خوار ہو جاتے ہیں۔ جب حق و انصاف کا بول بالا ہوتا ہے تو ان کے حصے میں رسوائی آ جاتی ہے اور پھر وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کشمیریوں نے پاکستان کے لئے جانیں دی ہیں مگر پاکستان انہیں اب ”جاسوس“ قرار دے رہا ہے۔ یہاں آپ کے خیال میں تھوڑا سا نقص ہے۔ کشمیریوں کو پاکستان نے نہیں بلکہ اس ملک کے غدار حکمران ٹولے نے جاسوسی کا الزام دیا۔ یہ وہی غدار حکمران ٹولہ تھا جس نے اس ملک کے نکلے کر دیئے۔ جس نے 25 برس تک اس ملک کے عوام کو آزادی اور جمہوریت سے محروم رکھا۔ دراصل یہ غدار حکمران ٹولہ خود ”جاسوسوں“ سے بھی بدکردار کا مالک تھا۔ اس لئے اس نے تمام محب وطن اور عوام دوست لوگوں کو غیر ملکی ایجنٹ یا جاسوس قرار دیا۔ جس حکمران ٹولے نے اپنے عوام کیساتھ دشمنی کی اور اس کے مسلمہ لیڈروں کو جاسوس کہتا رہا اس نے اگر ہم کشمیریوں پر جاسوسی کا الزام لگایا تو اس سے خفا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رہا اصل پاکستان یعنی اس ملک کے عوام تو ان کے سامنے جب بھی حقیقت آئے گی وہ اسے تسلیم کریں گے۔ ہمیں یہاں جو سزائیں دی گئیں وہ پاکستان کے اصل مالکوں نے تو نہ دیں۔ یہ سزائیں اس ظالم حکمران ٹولے نے ہمیں دی ہیں جس نے اپنے ہی عوام پر گولیاں برسائیں۔ ظاہر ہے جو حکمران اپنے عوام کیخلاف اعلان جنگ کرتے ہیں وہ دوسروں کے ساتھ بھی نا انسانی ہی کرتے ہیں۔ کشمیری عوام کو پہلے بھی پاکستان کے حکمران طبقہ نے جنگ آزادی میں اس طرح کی مدد نہیں دی جیسا کہ اسے چاہیے تھا۔ اس طبقے کو تو کشمیر کی آزادی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ان کی تمام باتیں سب زبانی جمع خرچ ہیں ان پر بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ لہذا پاکستان کے عوام

ہمارے اصل دوست اور حامی ہیں ان کی مدد کشمیری عوام کو ضرور حاصل ہوگی۔ پاکستان کے عوام میں خلوص بھی ہے اور ہمدردی بھی۔ جب بھی کشمیری آگے بڑھیں گے تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے اور کبھی بھی ان کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ کشمیری حریت پسندوں کو جاسوس قرار دے کر ان حکمرانوں نے دراصل بھارت کی خدمت کی ہے۔ شاید اس دہائی پالیسی کے باعث قدرت نے ان کو رسوا کن انجام سے دوچار کر دیا۔ آپ کو خوشی ہے کہ ہم لوگ بیج پر قائم رہے اور آزمائش کے مرحلوں میں حق کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہ تو اللہ کی مہربانی تھی کہ اس نے ہر مرحلے پر ہماری مدد فرمائی اور ہمیں سیدھے راستے پر گامزن رکھا۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ پھر قومی محاذ آزادی انشاء اللہ پہلے سے بھی بڑے کارنامے کر کر دکھائے گا۔ یہ سوچنا بھی غلطی ہے کہ کشمیری نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ ہم لوگ پہلے بھی اپنے وطن کے سچے بیٹے تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ہمارے دلوں میں آزادی کا جو جذبہ ہے وہ انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرائیں گے۔ آپ نے خود ہی تو لکھا ہے کہ کشمیریوں نے وطن کی آزادی کے لئے جو خون بہایا ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ شہیدوں کا لہو ہمیشہ رنگ لا کر رہتا ہے اور یہ آزادی کا رنگ ہوتا ہے۔ آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ حق پر قائم رہنے والوں کو دنیا میں آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی عظمت اسی میں ہوتی ہے کہ وہ صبر اور ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں۔ آپ کے معصوم دل سے ہمارے کامیابی اور سرخروئی کے لئے جو دعا نکلی ہے وہ بارگاہ ایزدی میں ضرور قبول ہوگی۔ یہ تو خدا کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ جب تک وہ سچائی پر قائم رہتے ہیں دنیا کی کوئی طاقت ان کو اپنے مقاصد میں ماکام نہیں بنا سکتی۔

روبینہ اور پیو سے معلوم ہوا کہ آپ کی صحت بالکل اچھی ہے اور تعلیم کی طرف بھی آپ کی توجہ خوب ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ انسان کی اصل دولت علم ہے۔ یہ ایسی دولت ہے جو نہ تو کبھی چوری ہوتی ہے اور نہ خرچ۔ علم کے بغیر انسان زراعیوان ہے۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ آپ

پڑھائی کی طرف زیادہ ہی توجہ دیں گی۔ میری طرف سے اپنی امی جان کی خدمت میں سلام عرض کریں اور روپیہ بیٹی کو بہت بہت پیار۔

آپ کا پیارا اکل/مقبول احمد بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶؎ اروہینہ، مکتوب الیہ کی چھوٹی بہن اور جی ایم میر کی بیٹی ہیں۔ ۲۶؎ مقبول بٹ شہید کی زوجہ محترمہ رلیہ بیگم ۳۶؎ جی ایم میر ۴۶؎ مقبول بٹ شہید کے بڑے بیٹے جاوید مقبول بٹ جنہیں پیار سے پو پو کہا کرتے تھے۔ ۵۶؎ مقبول بٹ شہید کے چھوٹے بیٹے شوکت مقبول بٹ جنہیں پیار سے نکو کہتے تھے۔ ۶۶؎ بٹارت شہید اور ضیف شہید ۱۹ء کے پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں بھارتی ہائی کمیشن لندن کے سامنے مظاہرہ کرنے والوں میں شامل تھے۔ ہائی کمیشن کے سیکورٹی گارڈز کی فائرنگ کے نتیجے میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا اور اپنی دھرتی ماں (میر پور آزاد کشمیر) کی آغوش میں ابدی نیند سو گئے۔ بٹارت کی قبر پلاک میں ہے اور ضیف کی میر پور شہر میں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنے بیٹے شوکت مقبول کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نئی دہلی

13 مئی 1979ء

برخوردارم شوکت مقبول

السلام علیکم!

امید ہے آپ بخیر ت ہو گئے۔ پچھلے دنوں دہلی میں آپ کے ابو سے جیل میں ملاقات ہوئی ۱۶؎۔ بھائی جان بالکل خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت نیک چاہتے ہیں۔ آپ نے ۲۸ فروری ۱۹۷۹ء کو جیل کے پتے پر جو خط بھیجا تھا وہ کافی دیر کے بعد انہیں منی کے پہلے ہفتے میں ملا ہے

۔ مگر جیل میں کسی وجہ سے وہ آپ کو براہ راست ابھی تک جواب نہیں لکھ سکے ہیں۔ جو نبی ان کو جیل حکام کی طرف سے سہولت ملے گی وہ آپ کو جواب تحریر کریں گے۔ فی الحال انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ ان کی طرف سے آپ کو خط تحریر کروں۔ لہذا آپ اس خط کو انہی کی طرف سے خیریت کی اطلاع سمجھ لیں۔ میں کم و بیش انہی کے الفاظ میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

بھائی جان کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ خیریت سے ہیں اور وہ آپ کی خیریت اور سلامتی کیلئے ہر وقت دعا کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اس بات سے بھی خوشی ہوئی ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی جان (پپو) ☆۲ کی تعلیم جاری ہے۔ انہیں امید ہے کہ آپ دل لگا کر حصول تعلیم میں مصروف رہیں گے۔ کیونکہ علم ایک ایسا خزانہ ہے جو ہر وقت انسان کے کام آتا ہے اور جس کے ضائع ہونے کا کبھی بھی خطرہ نہیں رہتا۔ بھائی جان کو امید ہے کہ وہ جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کے باعث آپ اپنی زندگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑنے دیں گے بلکہ ہمت اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کریں گے۔ چاہے انجام کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے اور اسی ذات باری سے بھلائی کی امید رکھنی چاہیے۔ یہ بات کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور جب تک انسان اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے آخری فتح اسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔ وہ انسان ہی کیا جو حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ بس ہمت اور حوصلے کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھیں اور حالات کا مقابلہ مردانہ وار کریں۔

بھائی جان کو اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ اس عمر میں جب کہ آپ کو ان کی سرپرستی کی ضرورت تھی وہ آپ سے کافی دور پڑے ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ آپ کے سر پر ہاتھ رکھنے سے قاصر ہیں بلکہ وہ خود جس آزمائش سے گزر رہے ہیں وہ آپ کیلئے بھی کافی پریشانی اور فکر مندی کا باعث ہے۔ تاہم ان کو امید ہے کہ آپ ان حالات میں بھی صبر اور حوصلے سے کام لے کر زندگی کے راستے پر کامیابی کے ساتھ چل نکلنے کی اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔

بھائی جان کی طرف سے محترم چچا جان ☆ ۳۰، چچی جان ☆ ۴۰، بھابھی رابعہ ☆ ۵۰، بھابی ذاکرہ ☆ ۶۰ اور دوسرے عزیزوں کو سلام کہہ دیں، پوپ، صوبی ☆ ۶۰، رفیعہ ☆ ۷۰ اور مٹی ☆ ۸۰ کے لئے بہت بہت پیار، حمیدہ بہن ☆ ۹۰ اور ان کے شوہر کو بھی بھائی جان کا سلام پہنچا دیں۔ انہوں نے مزید آپ کے ماموں ماسٹر صاحب ☆ ۱۰، ”خالہ فاطمہ ☆ ۱۱“ اور عبدالغفار ☆ ۱۲ کو سلام بھیجا ہے۔ بھابی فہمیدہ ☆ ۱۳ کو ان کی طرف سے سلام کہہ دیں۔ ریاض احمد ☆ ۱۴ کے بھائیوں اور بہنوں کو بھی ان کی طرف سے سلام کہہ دیں اور خط کا جواب بھائی جان کے نام سینٹرل جیل نئی دہلی کے پتے پر ارسال کریں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ آپ کو یہ خط مل گیا ہے۔ باقی میری طرف سے بھی تمام عزیزوں اور دوسرے دوستوں کو سلام کہہ دیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھیں تاکہ خیریت کی اطلاع ملتی رہے۔ خط لکھتے وقت بھائی جان کو گھر کا حال احوال ضرور تحریر کریں اور اپنی تعلیم اور دیگر مسائل کے بارے میں ان کو مطلع کرتے رہیں۔ ابو کی طرف سے ان کے دوستوں کو بھی بہت سلام پہنچا دیں۔

والسلام / فقط / آپ کا انکل

غلام نبی اور ابو / محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆ مقبول بٹ شہیدؒ نے تہاڑ جیل سے یہ پہلا خط اپنے بیٹے شوکت کے نام لکھا۔ پس دو ہزار زندان ان پر چند سنگین مجبوریوں کے پیش نظر انہوں نے یہ خط اپنے چھوٹے بھائی غلام نبی کی طرف سے خود اپنے ہاتھوں لکھا۔ بیٹے کو چچا کی حیثیت سے مخاطب کیا۔ خط میں بھائی جان کا لفظ جہاں بھی آئے گا وہ خود مقبول بٹ ہو گئے۔ یہ خط بٹ صاحب نے لکھ کر اپنے بھائی کے ہاتھ جیل سے باہر بھیجا اور اس کو غلام نبی بٹ کی طرف سے اسلئے لکھا تاکہ اگر جیل سے باہر لے جاتے وقت دوران تلاش پکڑا بھی جائے تو وہ غلام نبی کا لکھا ہوا ظاہر ہو۔ ۲۶ چاویڈ مقبول بٹ ۳۶ عبدالعزیز بٹ ۴۶ ہاجرہ بی بی ۵۶ چونکہ مقبول بٹ شہیدؒ نے یہ خط اپنے بھائی کی طرف سے لکھا تھا اس لئے اپنی دلوں بیویوں کیلئے ”بھابی“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ۶۶ چچا زاد بہن اصل نام حمیدہ ہے۔ ۷۶ چچا زاد بہن ۸۶ چچا زاد بھائی اصل نام شفیق ہے۔ ۹۶ چچا زاد بہن ۱۰۶ ماسٹر محمد مقبول ایٹ آباد ۱۰۶

فاطمہ ماسٹر صاحب کی اہلیہ جو اب وفات پا چکی ہیں۔ ۱۱۶۶ ماسٹر صاحب کے بھانجے ۱۲۶۶ عہد الخغار میر کی اہلیہ ۱۳۶۶ ریاض احمد ڈار، مقبول بٹ شہید کا چاٹا رسائی جو ۱۶ برس کی عمر میں بٹ صاحب کے ہمراہ ۶۷۷ء میں وادی کشمیر میں ایک حریت پسند کے روپ میں داخل ہوا۔ بٹ صاحب کے ہمراہ گرفتار ہوا اور بارہ سال قید کاٹ کر ۱۹۸۸ء کو اپنے ایک دوسرے ساتھی حمید بٹ کے ساتھ جوں خیل سے رہائی پا کر آزاد کشمیر آ گیا۔ آج کل یہ مظفر آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیگم فاروق حیدر کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

نئی دہلی

21 جون 1979ء

ڈیر عنت بہمن

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ اور فاروق بھائی خیریت سے ہوں گے۔ اللہ کے فضل و کرم سے زندگی کے ایام صبر و شکر کے ساتھ گزار رہے ہیں اور آپ کی دعاؤں و نیک تمناؤں سے مشکلیں اور کھٹنیاں بھی سکون قلب کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ رہی ہیں۔ برسوں پہلے آپ سے ملاقات کی یاد ابھی تک دل میں تازہ ہے۔ آپ نے جس خلوص اور محبت سے مہمان نوازی کا حق ادا کیا تھا اور فاروق بھائی نے جس پیار اور الفت سے آپ کے یہاں اپنے چند روز قیام کو خوشگوار بنایا تھا اس کی تصویر ابھی تک ذہن پر نقش ہے، چھوٹے سلطان ۱۶ کی تو تلی باتیں اور عزیز عزا اور میزو ۲۶ کی اٹھکیلیاں ابھی تک فراموش نہیں کر پایا ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں گھر والوں سے الگ ہو کر یہاں قیام کرنے پر مجبور ہوا تھا ۳۳۔ اگرچہ یہی زندگی کسی بھی طور خوشگوار اور آرام دہ نہیں مگر جہاں آدمی کے اصول اور نظر بے کا سول پیدا ہوتا ہے وہاں انجام کی پرواہ کئے بغیر آزمائش کے

ہر دور سے خندہ پیشانی کے ساتھ گزارنے میں بھی ایک طرح کی راحت ملتی ہے۔ یقین کیجئے زندگی کے اس مشکل ترین دور میں بھی نہ تو اپنی ہمت و حوصلہ ہی پست ہوئے ہیں اور نہ ہی اپنے ایمان میں کوئی فرق آیا ہے۔ آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو اس دور سے بھی نصرت و کامرانی کے ساتھ گزر رہو جائے گا۔

آپ کی جانب سے کافی عرصے سے کوئی خیریت نامہ نہیں ملا اس لئے قدرے پریشانی ہے۔ بلا صاحب ☆۴ اور حسرت صاحب ☆۵ نے پچھلی عید پر یاد کیا تھا اور پشاور سے چھوٹے شوکت نے حال ہی میں ایک خط لکھا ہے۔ اسے جواب تو بھیجا ہے مگر نہیں معلوم کہ اسے میرا خط ملا کہ نہیں ☆۶۔ امان بھائی نے تو لندن ہی میں مستقل قیام کیا ہے۔ ایک عرصہ ہوا ان کی طرف سے بھی ایک خط آیا تھا۔ میرے واپسی خط کا انہوں نے جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کافی عرصہ قیام میں میری طرف سے تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب کو سلام کہہ دیں۔ کوگی ☆۷ بے کوشی ☆۸۔۔۔ اور فاروق بھائی کے دوسرے عزیزوں کو بھی میرا سلام کہہ دیں۔ چھوٹے سلطان اور عزا و میز کو بہت بہت پیار۔ چھوٹے سلطان کے چھوٹے بھائی کو میری طرف سے پیار۔ اس کا نام یاد نہیں۔ خط ضرور تحریر کریں۔ امید ہے کہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

آپ کا بھائی / ایم۔ ایم۔ بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۴۔ سلطان ڈاکٹر فاروق حیدر مرحوم کے بیٹے ہیں۔ ۲۶۴ عزا اور منزا ڈاکٹر صاحب کی بیٹیاں ہیں۔ ۳۶۴ اس خط میں بٹ صاحب نے اپنے آپ کو قیدی ظاہر نہیں کیا نہ ہی خط کے آخر میں اپنا پورا نام لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط ان دنوں میں لکھا گیا ہے جبکہ بٹ صاحب کو خط لکھنے کی سہولت نہیں دی گئی تھی۔ غالب امکان ہے کہ انہوں نے یہ خط لکھ کر خفیہ طور پر پوسٹ کروایا ہوگا۔ ۴۶۴ غلام محمد لاہنڈی میں رہتے ہیں۔ ۵۶۴ سردار رشید حسرت مقبول بٹ کے تخلص اور عیسیٰ دوستوں میں سے تھے۔ راولا کوٹ کے رہنے والے یہ جرأت پسند وفات پا چکے ہیں۔ ۶۶۴ شوکت مقبول کو یہ خط لکھا گیا تھا جو اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ ۷۶۴ افسوس! امان

فد خان کے نام بٹ صاحب کا یہ خط دستیاب نہ ہو سکا۔ ۸۶۲ جاوید ساغر (گوگی) اے آرساغر کے بیٹے ہیں۔
راولپنڈی میں رہتے ہیں۔ ۹۶۲ اصل نام نخل ہے۔

☆☆☆☆☆☆

ملک محمد اصغر کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی

6 مارچ 1980ء

براہر ملک محمد اصغر صاحب

السلام علیکم!

آپ کا پہلا خط جو غالباً آپ نے اوائل فروری میں تحریر کیا تھا مل گیا۔ یاد آوری کے لئے
بہت بہت شکریہ۔ تنہائی کے اس عالم میں آپ جیسے دوستوں کی جانب سے یاد آوری کے یہ تحفے ☆
اکس قدر باعث مسرت ثابت ہوتے ہیں اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ اس سے قبل جب
بھائی صاحب ☆۲ ملاقات کے لئے آئے تھے تب بھی آپ سے وابستہ یادوں کی ایک بہارا زہ
ہو گئی تھی۔ آپ کی اور دیگر احباب کی خیریت کی اطلاع پا کر دل کو سکون میسر آیا تھا اور اب آپ کے
نامہ گرامی سے ان۔۔۔ ☆۳ جو بجا طور پر ہماری پیش قیمت میراث کہلائی جا سکتی ہیں۔ آپ
نے جس کرب و اضطراب کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی خلوص و محبت اور ایثار و وفا کے عمیق جذبات کی
آئینہ داری کرتا ہے۔ آپ نے نہ معلوم خود کو کیوں ”مجرم“ گردانا ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں
جبکہ کوئی مدعی ہی نہیں ☆۴۔ یہ بات دوسری ہے کہ کچھ ”جرم“ ایسے ہیں جن کا ارتکاب اہل عزم
و ایمان کے لئے باعث صداقت قرار ہوتا ہے۔ ان میں یقیناً ”جرم ضعیفی“ شامل نہیں جس کی سزا مرگ
مفاجات ہوتی ہے۔ البتہ بغاوت کا وہ ”جرم“ ضرور شامل ہے جو غلاموں میں سوز و یقین پیدا کرتا
ہے اور ”کنجشک فرمایہ“ کو شاہین سے بچہ آزمائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس جرم کے ارتکاب پر اظہار

ندامت نہیں اظہار مسرت کیا جانا چاہیے۔ و شعر جو آپ نے تحریر کیا ہے مجھے اپنی صورت حال پر موزوں دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ یہاں شکوے کی گنجائش ہی کہاں۔ کامیابیوں پر ستائش و تعریف کی طلب اور ناکامیوں پر حالات کی ناصاعدگی کا شکوہ کر کے ہمدردی کے حصول کو زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار شمار نہیں کیا جاسکتا البتہ اگر چھوٹا منہ اور بڑی بات کا جرم معاف ہو تو بصد انکساریہ ضرور کہوں گا کہ۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم میں چراغ آخر شب ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے یہ کچھ آپ پر ہی نہیں ہم سبھی پر صادق ہے۔ پس ندامت و ملال کی چنداں ضرورت نہیں ☆۵۔ مجھے یقین ہے کہ خلوص و محبت اور عزم و ایمان کی جس دولت کے ہم ائین ہیں وہ سچائی کے راستے پر گامزن رہنے کی ہماری مساعی کو ضرور سرخروئی سے ہمکنار کرے گی۔ اس موضوع پر کسی لمبے چوڑے لکچر کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک ایسی ابدی حقیقت ہے جو انسانی تاریخ میں اپنی تمام تر جلوہ تابانیوں کے ساتھ ہمیشہ موجود رہی ہے اور رہے گی۔ تاریخ انسانی کے اس سدا بہار گلشن میں کوئی کمی نہیں شرط یہ ہے کہ ہم خودی نادانی میں چند کلیوں پر قیامت نہ کر بیٹھیں۔ یہ بات باعث خوشی ہے کہ آپ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ میرے تئیں اپنی پر خلوص دعائیں جاری رکھیں گے۔ آپ نے جن عید کارڈوں کا ذکر کیا ہے وہ تو مجھے نہیں ملے تاہم خوشی کے ان موقعوں پر یاد کرنے کیلئے ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ۔ عزیزم جاوید اور شوکت کے بارے میں آپ کی طرف سے خیریت کی اطلاع پر بھی شکریہ۔ میری طرف سے تمام دوست و احباب کو خلوص و محبت سے بھرپور سلام کہتے گا۔ والسلام

فقط آپ کا بھائی / محمد مقبول بٹ

نوٹ: (برادرم اعجاز ملک ☆۶ کی صورت حال کے بارے میں ضرور مطلع کریں۔ وہ جس عالم میں ہیں اس پر مجھے بہت صدمہ ہے۔ ان تک میرا خصوصی سلام پہنچا دیجئے گا۔ میری طرف سے ان کے عزیزوں کو ہمدردی کا پیغام پہنچائیں۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۷ "تھے" ہر اوروں کے فرستادہ مکتوب ۲۶۷ غلام نبی بٹ مرحوم ۳۶۷ خط کی بوسیدگی کے باعث یہ چند الفاظ پڑھے نہ جاسکے۔ ۴۶۷ ملک امیر صاحب نے اپنے تئیں شرمندگی اور مذمت کا اظہار کیا تھا کہ ہم آپ کی رہائی کیلئے کچھ نہ کر سکے۔ ۵۶۷ ملک امیر نے مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر لکھا تھا "کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزرتی دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں"۔ اس شعر میں امید اور ایسی پائی جاتی تھی اسلئے بٹ صاحب نے امید اور حوصلے سے زندہ رہنے کی بات کی۔ ۶۶۷ یہ جنوری ۱۹۷۶ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ ملک اعجاز NLF کی میٹنگ میں شرکت کیلئے راولپنڈی گئے ہوئے تھے۔ رات کو میٹنگ میں شریک ہوئے۔ صبح ڈاکٹر فاروق حیدر کے گھر (چوہڑ) سے وہ مقبول بٹ صاحب کو لے کر صدر بازار راولپنڈی کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں ریس کورس گراؤ کے نزدیک انہیں حادثہ پیش آیا جس میں مقبول بٹ کو معمولی چوٹیں آئیں لیکن ملک اعجاز کو سر میں گہری چوٹ لگی جس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ وہ کئی روز سی ایم ایچ راولپنڈی میں بے ہوش رہے۔ جب انہیں ہوش آیا تو ان کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔ اس بیماری کے دوران انہوں نے ایک مرزائی کو کوئی میں قتل کر دیا۔ گرفتار ہوئے اور ضمانت پر رہائی ملی۔ وہاں دم حیات ذہنی عارضے میں مبتلا رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اکرام اللہ جسوال کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/2 مئی 1980ء

محترم جسوال صاحب / السلام علیکم

فرقت کے اس طویل دور میں کچھ عرصہ قبل آپ کا محبت نامہ مل گیا۔ یاد آوری لئے شکریہ۔ خط کا جواب لکھنے میں بوجہ دیر ہو گئی اس لئے آپ کی Inconvenience (تکلیف) کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس وضاحت کو "غذر گناہ" سے تعبیر نہیں کریں گے۔ دوستوں میں باہمی مامہ و پیام کی اہمیت سے انکار غلط ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں برسوں سے اس سلسلے کو قائم نہ رکھ سکا۔ اس لئے نہیں کہ آپ کی یاد دہن سے محو ہو گئی تھی مگر حالات

کے اس جبر کا کیا علاج کیا جائے جو چاہت کے باوجود خواہشات کا خون کرتے ہیں۔ زنداں کی زندگی کے اس پہلو کے بیان کے لئے ایک کتاب چاہیے مگر یہاں اسی اکتفا کروں گا کہ اسیری اور وہ بھی ہم جیسے لوگوں کی اسیری کے لئے یہ مقولہ کہ Prisoners are not supposed to be choosers" ایک قدر مقرر (Governing Value) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ برسوں بعد اس قابل ہو سکا ہوں کہ رائٹنگ میٹریل (Writing Material) کا استعمال کر سکوں اور اس "حق" کو حاصل کرنے کیلئے ہائیکورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ آپ کے لئے میں یقیناً اپنے حالات لکھنے سے قاصر ہوں۔ اس لئے نہیں کہ لکھ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ حالات کا رونا اور انہیں ضبط تحریر میں لانا تو کبھی اپنا شعار رہا ہے اور نہ ہی طریقہ۔ پس اس خط کو آپ اپنے خیریت مامے کی وصولی وصولی کی رسید سمجھ لیجئے جس کی آپ نے فرمائش کی ہے اور جس کا مجھے یقین ہے کہ آپ بڑی بے تابی سے انتظار کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ اسے شاعرانہ بات قرار دیں تو میں یہ لکھنے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا محبت مامہ گنج قفس میں باد صبا کے کسی خوشگوار جھونکے کی طرح مسرتوں کا ایک پیغام لایا ہے۔ خوشگوار بادوں کی ایک بارات ذہن کے پردے پر محو رقص ہو اٹھی اور اس کے ساتھ ہی خلوص و محبت کے اس لازول رشتے کی تازگی دو چند ہو گئی جسے ہم بجا طور پر زندگی کی مشترک اور گراں بہا میراث قرار دے سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ "ذاتی" وجوہ کے باوجود جن کا آپ نے قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے مامہ و پیام کے اس سلسلے کو کم از کم میری خاطر جاری رکھیں گے۔ میرے لئے یہ محبت مامے کسی گراں قدر اثاثے سے کم نہیں۔ آپ جیسے وفا شعار دوستوں کیلئے اس ضمن میں "خدائی فوجداروں" کی کتر بیونت اور اس نوع کی دیگر کاروائیوں کا خدشہ پرکاش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اے آپ کا خط ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار پڑھا صرف اس لئے نہیں کہ یہ آپ کا خط تھا بلکہ اس لئے بھی کہ شاید اس طرح اس تصویر کو اچھی طرح دیکھ سکوں جو اس کے بین السطور پوشیدہ ہے۔ درد اور احساس کی شدت میں آپ بہت کچھ کہہ گئے ہیں اور اس سے اتفاق شاید عقل و خرد کے تقاضوں کو پورا

کرے، مگر عشق و جنون کی راہ چل پڑنے والوں کے لئے حالات و واقعات کو پرکھنے کے معیاری الگ واقع ہوئے ہیں۔ تمناؤں کی بے تابی اپنی جگہ سہی مگر اسے زندگی کا محور قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اہل عشق جانتے ہیں کہ عشق فی نفسہ صبر طلب ہے۔ عام معمولات زندگی کے بارے میں کسی انگریز مصنف کا مقولہ ہے "Nothing succeeds like a success but it is equally true that nothing fails like a failure"۔ وقت کے تقاضوں اور فوری مصلحتوں کو زندگی کا محور بنا کر قیادت انسانی کے منصوبوں پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے والے مدیروں کے لئے یہ مقولہ میکاوی کے کسی نسخے سے کم نہیں۔ مگر انہیں وہ درجہ یقیناً حاصل نہیں ہو سکتا جو صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جن کو تاریخ انسانی کی ترتیب و ترتیم کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ انسانی تاریخ کی ترتیب و ترتیم کی زمام ہمیشہ اہل عشق کے اس قبیلے کے ہاتھوں میں رہی ہے جنہوں نے وقت کی مقتدر روایات اور شخصیات کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور سوچ و عمل کو نئی سمت عطا کی۔ کامیابی اور ناکامی کا متذکرہ بالا معیار ان کے لئے کبھی بھی قابل رعایت (worth consideration) نہیں رہا ہے۔

سوچئے تو ارسطو کو زہر کا پیالہ کیوں پیایا؟ آتش نمرود میں وقت کے پیغامبر ابراہیم نے کیوں چھٹا لنگ لگائی؟ عیسیٰ علیہ السلام نے وقت کے حاکموں کی صلیب کو کیوں چوما۔ طائف کے بازار میں ابو لہان ہونے کے باوجود حضور پُر نور ﷺ کے چہرے پر مال کیوں نہیں آیا۔ کوتم بدھ نے برہمنی استحصال (Exploitation) کے ساتھ مصالحت کیوں نہیں کی۔ مارٹن لوتھر کی تحریک (Renaissance)، مارکس اور اینجلز کے نظریات اور نوآبادیاتی عروج میں قومی آزادی کی تحریکوں کا پھیلاؤ اپنے وقت کی کونسی مقتدر روایات اور شخصیات کے ساتھ مصالحت کی علمبردار رہی ہیں؟ انسانوں کی تاریخ میں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ وہ لوگ جو قوموں کی زندگی کا رخ متعین کرنے کی تحریکوں کی بنیاد ڈالتے رہے ہیں وہ اپنی طبعی عمر میں تصورات کی (جنگلی) Maturity کی حد سے آگے نہ جاسکے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان تصورات کی بنیاد پر تشکیل

پانے والی عمارت کی تعمیر میں ان کا رول کسی کم اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اپنے تاریخی کردار کے باعث وہ ہمیشہ السابقون الاولون میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ موضوع اس قدر طویل ہے کہ اس خط کی تنگ دامنی اس کی وضاحت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مختصر ایسی لکھ سکتا ہوں کہ اہل عشق ترک تشخص کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ ترک تشخص اہل عشق و ایمان کی ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ارتقاء کی بھی موت ہے۔ ہمیں اس وقت سے گھبرانا چاہیے جب انسان تصورات کے لئے ایثار اور قربانی کا راستہ چھوڑ کر مصلحتوں کا غلام بن جائے کیونکہ اس وصف کی عدم موجودگی میں یہ دنیا چلتے پھرتے انسانوں کا ایک وسیع قبرستان بن کر رہ جائے گا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو آپ کی تجویز نرم سے نرم الفاظ میں۔۔۔ ۲☆ ہی قراردی جاسکتی ہے۔ پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی بھی قومی تشخص کی تشکیل میں بیشارت تاریخی عوامل کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ نہ تو کسی کے دعوے سے وجود میں آتا ہے اور نہ ہی کسی کے ترک کرنے سے مٹ جاتا ہے قومی تشخص قدرت کی دین ہوتا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ اس لئے ترک تشخص کے ساتھ وابستہ تقسیم وطن کا تصور بھی ہمارے لئے ایک گناہ عظیم سے کم نہیں۔ ۳☆ تاریخی حقائق اپنے بل پر قائم رہتے ہیں۔ انسانوں کی بے بضاعتیاں (Frailities) ان پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ یہ دوسری بات ہے اپنی (Frailities) کے باعث کوئی انسان یا انسانوں کی جماعت تاریخ کے اس دھارے کا ساتھ نہ دے پائے اور کسی بے وزن شے کی طرح لہروں کے اوپر تیرتی ہوئی ساحل کی وقتی راحتوں سے ہمکنار ہونے میں ہی اپنی عافیت سمجھ لے۔ لیکن آپ سے بڑھ کر اور کون جانتا ہے کہ ہم اس قبیل میں شامل نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کون سکون و اطمینان کا خواہشمند نہیں لیکن قبرستان کے سکون اور رواں دواں زندگی کے سکون میں امتیاز نہ کرنا نادانی کی علامت ہے۔ وہ امن و امان جس کے پیچھے خوف و دہشت کے سائے لرزاں ہوں اور جس کے لئے ارمانوں کا خون کر کے ذہنی پرالگندگی کی کیفیت حاصل کرنی پڑے فی الواقع موت کا پیغام ہوتا ہے۔ خط خاص طویل ہو گیا اس لئے اس موضوع کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

میرے بارے میں پریشانی کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو میرے بارے میں منظور ہوگا وہ بہر طور ہم سب کے لئے بہتر ہی ہوگا۔ آپ بس میرے لئے اپنی دعائیں جاری رکھیے۔ آپ کی ذاتی پریشانیوں سے دکھ ہوا اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات آسان فرمائے۔ اتنی دور آپ کے لئے سوائے دعا کے اور کربھی کیا سکتا ہوں۔ محترم ساتھی مرحوم محمد زمان خان عباسی کی وفات کی خبر سے دل کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جو رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میری جانب سے مرحوم کے پسماندگان سے ضرور اظہارِ تعزیت کیجئے گا۔

محترم میر ہدایت اللہ صاحب کے دورہ دل کے بارے میں جان کر تشویش ہوئی۔ بہر حال یہ اچھا ہے کہ آج کل وہ کم کھاتے ہیں پر غم نہیں کھاتے۔ میری طرف سے محترم انصاری صاحب، بشیر تبسم صاحب، صوفی محمد زمان، محترم جی ایم میر صاحب، محمد صدیق بابا صاحب، ڈاکٹر صاحب اور دیگر تمام دوست و احباب تک خلوص و محبت سے بھرپور سلام پہنچا دیجئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی جانب سے فروری میں ایک خط ملا تھا جس کا جواب دے چکا ہوں مگر میرے جوابی خط کی جوان کے کلینک کے پتے پر ارسال کیا تھا وصولیابی کی تاہنوز اطلاع نہیں ملی۔ نسیم لون صاحب اور محترم ہارز کی صاحب کو بھی میرا سلام کہئے گا۔ نسیم صاحب کے احساس کی شدت کا مجھے نہ صرف علم ہے بلکہ اس کا تجربہ بھی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ”کوئچ“ کچھ گئی ڈاروں لہدی جہاں نوں“ اپنی جگہ ان کے احساس درد کی غمازی کرتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک دردناک صورت حال ہے۔ مگر انہیں میری طرف سے بتائے کہ اصل المیہ (Tragedy) اس وقت شروع ہوتی ہے جب ”ڈار کچھڑ جائے“ راہ توں لہدی منزل نوں“ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کی صورت حال سے محفوظ و مامون رکھے۔ ہاشم اور اشرف تک میرا سلام ضرور پہنچا دیجئے گا۔ ہاشم کی اپیل کی طوالت فکر مندی کا باعث ہے۔ اس کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھیں۔ نسیم لون کی معرفت محترم ڈاکٹر باسط ۴۴ تک میرا سلام ضرور پہنچا دیجئے گا۔

ایک آخری بات! یہ نہ سوچئے کہ ہمارا کوئی بھن نہیں ہے۔ جو لوگ اہل ایمان ہونے کا

دعویٰ کرتے ہیں ان کے لئے یہ ساری کائنات اور اس کا خالق ان کی دستگیری کے لئے منتظر رہتے ہیں۔ یہ محض فلسفیانہ بات نہیں بلکہ اپنے شعور و تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس موضوع پر یہاں کچھ زیادہ بیان کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ کاغذ کے ساتھ سیاحی بھی ختم ہو رہی ہے اور خط کا وزن بڑھنے پر خدائی فوجدار اسے بے رنگ قرار دے کر آپ کی جیب پر بھی بلہ بول دیں گے جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ اس خط کے ساتھ محترم اسلام آبادی کے نام ایک پرچہ ارسال کر رہا ہوں، امید ہے کہ آپ یہ ان تک پہنچا دیں گے۔ دراصل ان کے ایک دیرینہ خط کا جواب ہے جو میں تاہنو تجربہ نہ کر سکا۔

ہاں میرے سر کے بال سفید ضرورت ہوتے جا رہے ہیں مگر اس کا کیا کروں کہ دل ابھی تک جواں ہے۔ اور اس میں ملیں ارماں زندہ و تابندہ۔ رہا درویشانہ انداز تو یہ بس آپ کا الہام ہی ہے۔ یہاں ان اوصاف کا دعویٰ ہی نہیں حصول تو بہت دور کی چیز ہے۔ بزرگی اور درویشی تو صرف آپ کے لئے وقف ہے۔ البتہ ہم کبھی اپنے وقت پر بوڑھے ضرور ہو جائیں گے۔ آپ بس دعا کیجئے کہ جسموں کے بڑھاپے کے ساتھ ہمارے ارمان بوڑھے نہ ہونے پائیں۔ مقامی دوست احباب کے علاوہ آپ کے اہل خانہ کے لئے میرا سلام اور بچوں کے لئے ڈھیر سارا پیار۔

فقط

آپ کی دعاؤں کا تمنی
آپ کا بھائی محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۶ یہ لفظ مبہم ہونے کے باعث پڑھانہ جاسکا ۲۶۶ واضح تشخص اور الگ پہچان قوموں کی بناء کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ قوم کی تقسیم اسی وقت عمل میں آتی ہے جب قوم کا تشخص ختم ہو جائے۔ اس لئے مقبول بٹ نے قومی تشخص قائم رکھنے پر زور دیا ہے۔ ۳۶۶ اگرچہ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ فرد اپنی جماعت سے بچھڑ جائے لیکن مقبول بٹ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اصل المیہ فرد کا بچھڑنا نہیں بلکہ پوری جماعت یا قوم کا راہ منزل سے ہٹک جانا ہے۔ خدا کشمیری قوم کو اس المیہ سے محفوظ رکھے۔ ۳۶۶ ڈاکٹر باسط پاکستان کے امور قانون دان ہیں۔ کشمیری النسل ہیں اور آج کل لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

محمد عارف کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/8 اکتوبر 1980ء

عزیزم محمد عارف صاحب

السلام علیکم/آپ کا تعزیت نامہ ملا۔ اہلیہ مرحومہ کی وفات پر آپ نے خلوص و محبت سے بھرپور جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ میرے لئے مشکل کی اس گھڑی میں بہت بڑے حوصلے کے باعث بنے ہیں اور اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ یہ امر اہل ہے کہ موت سے کسی بھی ذی روح کو مغر نہیں۔ پس اس باب میں ایمان کے لئے غم و ملال کی کوئی گنجائش نہیں۔ تاہم ذاتی طور پر مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ سفر زندگی کے آخری مراحل میں ان حقوق و فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہا جن کا زوجین سے تقاضا کیا جاسکتا ہے۔ حالات کے جبر کے سامنے بے بسی کا احساس اس صورت حال میں دوچند ہو جاتا ہے۔ اگر اس احساس کو صدمے کا نام دیا جاسکتا ہے تو میں یقیناً ایک بڑے صدمے سے دوچار ہوا ہوں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ اور دیگر کئی دوستوں کی جانب سے اس موقع پر اظہار محبت و ہمدردی کے باعث اس ویرانہ زنداں میں حوصلہ قائم رہا ہے۔ پس میں اس سلسلے میں آپ کا شکر یہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کے اس خیال سے انکار ممکن نہیں کہ با مقصد زندگی گزارنے والوں کے لئے امتحان و آزمائش کے دور سے گزرنا لازمی ہوتا ہے۔ یہ مقاصد جس قدر اعلیٰ و ارفع ہیں اسی تناسب سے امتحان و آزمائش کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے دار و رسن کے مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اہل عزم و ایمان کے ماتھے شکن آلودہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حق و باطل کی کشمکش میں آخر کار ”وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَ أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ کی بشارت ایزدی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ پوری ہو ا کرتی ہے۔ یہ لوگ اپنی بے سر و سامانی اور ظاہری بے بضاعتی کے باوجود اعدائے حق کے وسائل کی فراوانی سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ اس

لئے نہیں کہ شوق سفر میں یہ لوگ ہوش و خرد سے عاری ہو جاتے ہیں بلکہ اس لئے کہ جس جہد و جدوجہد میں وہ مصروف ہوتے ہیں اس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اکثر اس میں ”کم من فتنۃ قلبیہ“ غلبت فتنۃ کثیرۃ ☆ ۲ کا اعجاز اپنی تمام تر عنایتوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوا کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے۔ پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صبر و ثبات قدمی کی نعمت سے نوازے تاکہ آزمائش کے جس دور کا ہمیں سامنا ہے اس میں ہمارے قدم ڈگمگانے نہ پائیں اور ہمارا عزم و استقلال قائم رہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ عزیزم جاوید کے دوستوں میں شامل ہیں۔ میری غیر موجودگی میں اپنی ولدہ کے انتقال پر اسے جو دکھ اور صدمہ پہنچا ہوگا اس کی شدت کا مجھے بخوبی احساس ہے تاہم یقین ہے کہ آپ جیسے دوستوں کی رفاقت اور دلجوئی اسے یہ صدمہ برداشت کرنے میں مدد ثابت ہوگی۔ امید کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوگی۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ میرے عزیز اور ساتھی جناب امان اللہ خان صاحب سے اچھی متعارف ہیں۔ یہ میرے لئے کسی بڑی خوشخبری سے کم نہیں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ ان تک میرا خلوص بھر اسلام پہنچا دیں گے۔ برسوں پہلے ان کی جانب سے ایک نوازش نامہ موصول ہوا تھا پھر وہ نامہ و پیام کے سلسلے کو قابل فہم شوجہ کے باعث جاری نہ رکھ سکے۔ ان سے وابستہ یادیں دل و دماغ میں اب بھی تازہ ہیں اور حالات کی گردان کی دھمک کو ماند نہیں کر سکی۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ خط کے ذریعے میرے پورے دوست احباب تک میری خیریت کی اطلاع کے ساتھ ساتھ ان تک میرا سلام بھی پہنچا دیں۔ بفضل ایزدی میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی فکر یا پریشانی کی ضرورت نہیں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی خط کے ذریعے یاد کرتے رہیں گے۔

والسلام

آپ کی دعاؤں کا طالب محمد مقبول بٹ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆ اور رحمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، تم ہی سر بلند رہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔ القرآن

(آل عمران ۲۶۶ القرآن (سورۃ بقرہ ۲۳۹)

اپنے بیٹے جاوید مقبول کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/9 اکتوبر 1980ء

برخوردارم جاوید مقبول بٹ/السلام علیکم

چند روز پیش تیر دل کو پاش پاش کرنے والی یہ خبر ملی کہ آپ کی والدہ ماجدہ اور میری اہلیہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس موقع پر آپ کو جو دکھ اور صدمہ پہنچا ہوگا اور بالخصوص میری عدم موجودگی میں آپ کے احساس درد نے جوشدت اختیار کی ہوگی اس کا اندازہ میرے لئے مشکل نہیں۔ مگر آزمائش کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ پس یہ میرا فرض ہے کہ آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ امید ہے کہ آپ اس المناک صورت حال میں صبر و ثابت قدمی کے ساتھ خود کو تباہی میں رکھیں گے اور پیش آمدہ صعوبتوں اور مشکلات کو مردانہ وار برداشت کرتے ہوئے اپنی زندگی میں منفی اثرات کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بات کبھی فراموش نہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو امتحان و آزمائش سے دوچار کرتا ہے جن میں ان سے عہدہ بردار ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مگر اس صلاحیت کو بروئے کار لانا انسانوں کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حالات کی مامساعدگی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرتے ہوئے زندگی کے اس مثبت راستے پر اپنا سفر جاری رکھیں گے جس کا آپ نے انتخاب کیا ہے ﴿۲﴾ ان اللہ مع الصابرين کی بشارت خداوندی آپ کے عزائم کو جواں اور حوصلوں کو بلند رکھنے کی کافی ضمانت ہے۔ اس پر کامل یقین رکھیے۔ آپ کی والدہ کے انتقال کی خبر کئی روز پیش تیر ملی تھی مگر اس سلسلے میں مجھے آپ کی جانب سے تفصیلات کا انتظار تھا۔ پر گزشتہ روز لندن سے ایک دوست کے تعزیتی خط سے معلوم ہوا کہ یہ حادثہ جانکاہ اس وقت پیش آیا جب آپ بسلسلہ تعلیم فیصل آباد میں تھے۔ اس سے دل کو دھکا لگا کہ

دم مرگ نہ صرف میں بلکہ آپ بھی مرحومہ کی قربت سے محروم رہے ہیں۔ تاہم مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بذریعہ خط مجھے اس سلسلے میں پوری معلومات سے باخبر کریں گے۔ اور خاص طور پر مرحومہ کی آخری خواہشات (اگر آپ کو معلوم ہوں) سے مجھے ضرور مطلع کریں۔

مجھے یہاں اس بات کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ مرحومہ کی وفات کے بعد اس مختصر سے گھرانے کو سنبھالنے رکھنے کی بھاری ذمہ داری اب آپ پر عائد ہوتی ہے جسے میں اپنے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کو تتر بتر ہونے سے بچانا اور سبھی افراد خانہ کو اتحاد و یگانگت کی لڑی میں پروئے رکھنا آپ کا فرض بنتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس فرض کی ادائیگی میں آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوگی۔ فرزند اکبر ہونے کے سلسلے میں آپ کی جانب سے بڑی توقعات ہیں اور یقین ہے کہ آپ ان کو پورا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑیں گے۔ برادر غلام نبی کی وساطت سے آپ نے جون میں جو خط میرے نام بھیجا تھا وہ کافی تاخیر سے ستمبر کے پہلے ہفتے میں مجھے ملا۔ اس کا جواب مظفر آباد کے پتے پر تحریر کر چکا ہوں۔ میرے خیال میں اگر اسے وہاں سے Redirect نہ کیا گیا تو آپ کو مل بھی نہ پایا ہوگا۔ آپ کے فیصل آباد والے ایڈریس کا ذکر عزیزم ہاشم قریشی نے اپنے تعزیتی خط میں کیا تھا۔ جو پچھلے دنوں مجھے یہاں موصول ہوا۔ اس لئے یہ خط اسی ایڈریس پر تحریر کر رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اپنی تعلیمی مصروفیات کے سلسلے میں مجھے بائفصل مطلع کریں اور اس سلسلے میں درپیش مسائل سے مجھے باخبر کریں۔ عزیزم شوکت کی جانب سے بھی کافی عرصے سے کوئی خیریت نامہ نہیں ملا۔ برادر غلام نبی کے ایک تازہ خط سے معلوم ہوا کہ وہ میٹرک میں کامیاب ہو گئے ہیں اور پشاور سے ایک اور خط کے ذریعے پتہ چلا کہ انہوں نے F.Sc میں داخلہ لیا ہے۔ انہوں نے کہاں؟ کس کالج میں، کن مضامین کے ساتھ داخلہ لیا ہے؟ اس کی تفصیلات کا مجھے انتظار رہے گا۔ آخر میں ایک بار پھر آپ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے راضی برضاۓ ایزدی رہنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اس بات کا یقین رکھئے کہ جو رستم کی ہرکالی رات کے گزرنے پر امید و مسرت کی ایک نئی صبح اپنی تمام تر جلوہ تابانیوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوا کرتی

ہے۔ اس لئے حزن و ملال کو بھی بھی دل میں جگہ نہ دیجئے اور اپنے پائے استقبال میں لغزش نہ آنے دیجئے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنی رحمتوں سے نوازتا رہے اور زندگی کے ہر موڑ پر آپ کو کامیابی کی خوشیاں عطا کرے۔ میری جانب سے بھی دوست احباب اور عزیز و اقارب کو درجہ بدرجہ سلام عرض کریں۔ گھر کے بھی بچوں کے لئے بہت بہت پیار۔ میری صحت تا حال بالکل ٹھیک ہے اور ایام اسیری صبر و شکر کے ساتھ گزر رہے ہیں۔ میرے بارے میں فکر مندی اور پریشانی کی ضرورت نہیں کیونکہ جو کچھ مقدر بن چکا ہے اس سے مطمئن رہنا عزم و ایمان کی علامت بن چکا ہے۔ میرے لئے صرف اپنی دعائیں جاری رکھئے۔

خدا حافظ / والسلام / آپ کا ابو / محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۴ مقبول بٹ شہید کی اہلیہ رابعہ بیگم انتہائی صابر و شاکر خاتون تھیں۔ خاوند کی تحریر گرمیوں اور قید و بند کی زندگی نے انہیں قدم قدم پر مشکلات اور صدمات سے دوچار کیا لیکن رابعہ بیگم نے یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ وہ ماسٹر مقبول (ایبٹ آباد) کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اس عظیم خاتون نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ایبٹ آباد میں وفات پائی اور وچیں پیوند خاک ہوئیں۔ ۲۶۴ جاوید مقبول بٹ بی ایس سی آرزو انگریز پبلشر جامعہ زریعہ فیصل آباد کے طالب علم تھے۔ اسی تعلیمی سفر کو جاری رکھنے کی تلقین کی گئی۔ ۳۶۴ ترجمہ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (القرآن)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اکرم اللہ جسوال کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینئر جیل نئی دہلی/15 اکتوبر 1980ء

محترم جسوال صاحب

السلام علیکم

آپ کا عزیمت نامہ ملا۔ اہلیہ کی وفات پر آپ نے خلوص و محبت سے بھرپور جن ہمدردانہ جذبات کا اظہار کیا ہے ان سے میرے حوصلے کو تقویت پہنچی ہے۔ اس مشکل گھڑی میں آپ نے صبر و تحمل کی تلقین کر کے میرے تئیں جو حق و سچی نبھایا ہے اس کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ کائنات کی ہر شے فانی ہے اور زندگی و موت تو بہر حال اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اس ابدی حقیقت پر یقین اور اس سلسلے میں حزن و ملال سے بے نیازی ہمیشہ سے اہل حق کا شعار رہا ہے۔ تاہم زندگی میں کسی بھی رفیق سفر کی موت سے باہمی رشتوں میں جو انقطاع پیدا ہو جاتا ہے اس سے جذبات کو ٹھیس اور دل کو صدمہ ضرور پہنچتا ہے۔ یہ تو عمومی حالات کی بات ہے پر جس مخصوص صورت حال سے مجھے ذاتی طور پر سامنا ہے اس میں اس صدمے کی گہرائی کا دو چند ہونا ایک فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جیسے دوستوں اور یہی خواہوں کی جانب سے اظہار رفاقت سے میں اس صدمے کو برداشت کر سکا ہوں۔

آپ کے نامہ محبت سے جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے اسے نرم ترین الفاظ میں Desperate ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ Desperation ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جو محض مخصوص حالات میں انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ تنگ دماغی کے باعث اس خط میں ان کی تفصیل درج کرنا ممکن نہیں۔ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ انسانی تجربے کی روشنی میں عزائم کی تکمیل میں مسلسل رکاوٹوں کے باعث اس کیفیت کا پیدا ہونا عام حالات میں

فطری ہے۔ من حیث القوم ہمیں جن حالات کا سامنا رہا ہے اس میں اس کیفیت کی جوازیت بحث طلب ہو سکتی ہے مگر اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر مقاصد اعلیٰ و ارفع ہوں اور بنائیں مستقبل کی تعمیر و تزئین کا ایک واضح اور قابل عمل خاکہ (Blueprint) موجود ہو تو ہر نقش کہن کو ماننے اور بوسیدہ سڑکچر (Structure) کو زمین بوس کرنے کا عمل بجائے خود تعمیر نو کا ایک لازمی جز بن جاتا ہے۔ شکست و ریخت کا یہ جذبہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تعمیراتی ہوتا ہے۔ خواہ مدعیانِ استبلاشمنٹ Establishments سے بار بار تخریب کے نام سے ہی کیوں نہ پکاریں۔ آپ کے خط کے بین اسطور اس مثبت جذبے کو پڑھنے کی میری کوشش سے یقیناً آپ کو اتفاق ہو گا۔ جو Desperation یوں Chanalise ہوا اس کو غیر مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ انسانوں کی در بدری کا نہیں بلکہ ان کو مجتمع کرنے اور ظلم و جبر کی قوتوں کے مقابلے میں فتح و کامرانی سے ہم کنار کرنے کا باعث بنتی ہے۔

آپ نے گرد و پیش کے جن حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ انہیں جنگ زرگری کی بدترین مثال ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس اکھاڑے میں شامل کبھی نہ صرف مال غنیمت کی ہوس میں مبتلا ہیں بلکہ کشور کشائی کے مذموم مقاصد کو نظریات اور اقدار کی پیروی (Service) کے دھج پر دوں میں چھپانے کی ماکام کوششوں میں بھی مصروف ہیں۔ ان کی اس کج فہمی پر صرف ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔ قتل و غارت، خون ریزی اور سب سے بڑھ کر پرندیدہ انسانی قدر کی پامالی کی اس صورت حال سے بقول آپ کے نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان کے اندر کا انسان بیدار ہو جائے۔ یہ کب اور کیونکہ ممکن ہو گا۔ اس سوال کا جواب وقت ہی فراہم کر سکتا ہے۔ انسانوں کا Contribution اس سلسلے میں صرف اس قدر رہتا ہے کہ وہ اپنا تاریخی کردار انجام دیتے ہیں اور یہی ان کی تسلی اور اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا تاریخی کردار انجام دینے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

طوالت سے بچنے کے لئے میں اب اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔ اگرچہ آپ کے بیان

کردہ کئی نکات پر اظہار رائے کو جی چاہتا ہے۔ یا زندہ صحبت باقی آپ کا یہ خیال درست ہے کہ قبل ازیں آپ نے جو ”طویل خط“ تحریر کیا تھا وہ مجھے نہیں مل پایا۔ تاہم آپ کے اس ماریسیدہ خط میں آپ نے جن خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہوگا ان کا اندازہ لگانا میرے لئے مشکل نہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے برادر ڈاکٹر صاحب کے تین چار خط مل چکے ہیں جن کے جواب باقاعدہ لکھ چکا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ خیریت کے یہ اطلاق نامے ان تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔ اس کا انہوں نے اپنے حال کے تعزیتی خط میں شکوہ بھی کیا ہے مگر اس سلسلے میں سوائے اظہار معذرت کے میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ ان تک اور دیگر سبھی دوست احباب تک میرا پر خلوص سلام ضرور پہنچائے گا۔ آپ اور دیگر رفقاء سے وابستہ خوشگوار یادیں ہی مجھے احساس تنہائی کے ان مضر اثرات سے بچائے رکھتی ہیں جن کا اسیری کے اس عالم میں پیدا ہونا بعید از امکان نہیں۔ سو امید کرتا ہوں کہ آپ اپنی دعاؤں میں مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ میری صحت بفضل ایزدی ٹھیک ہے اور باقی معاملات جوں کے توں ہیں۔ مزید کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں۔ محترم محمد زمان عباسی مرحوم ☆ کے انتقال پر ملال پر میری جانب سے ان کے پسماندگان سے ضرور اظہار تعزیت کیجئے گا۔ امید ہے کہ آپ گاہے گاہے یاد کرتے رہیں گے۔

والسلام / فقط آپ کا مخلص / مقبول احمد بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

✽ محمد زمان عباسی گڑھی ڈوپٹہ مظفر آبادس کے رہنے والے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محمد عارف کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/3 دسمبر 1980ء

عزیز محمد عارف/السلام علیکم

نومبر کی 24 تاریخ کو آپ نے جو خط حوالہ ڈاک کیا تھا وہ مجھے چند روز پیشتر ملا۔ یاد آوری کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آپ کا یہ اندازہ صحیح ہے کہ اس سے قبل آپ نے جو خط روانہ کیا تھا وہ مجھ تک پہنچ نہ پایا۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب قابل فہم ہونے کے باوجود تجری کرنا بے کار ہے۔ اس لئے کہ بقول کسی کے What cannot be cured must be endured ☆ اظہار ہے مجبوری کے اس عالم میں ہم ان لوگوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں جو انسانوں کے درمیان ربط و تعلق کے معصوم رشتوں میں بھی رکاوٹیں کھڑی کر کے اپنے ذوق حاکمیت کی تشفی کا ساماں بھجھ کرتے ہیں۔ بہر حال آپ کی اور آپ کی وساطت سے دیگر دوست احباب کی خیریت کی اطلاع پا کر دل کو تشفی ہوئی۔ امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ خلوص و محبت سے بھرپور جن جذبات کا آپ نے اظہار کیا ہے وہ میرے لئے ایک متاع بے بہا سے کم نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ دلوں کے جو رشتے ایسے جذبات سے مزین ہوں دنیا کی کوئی طاقت ان کو منانے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جسم و جان پر ہزاروں قدغنیوں کے باوجود یہ رشتے نہ صرف عالم فرقت میں بھی دلوں کو ایکسا تھ دھڑکنے پر مجبور کرتے ہیں بلکہ ظلم و جفا کی علمبردار قوتوں کی تاریک یلغاروں میں بھی اہل عزم و ایمان کے دلوں میں امید و اطمینان کی لازوال شمعیں روشن کرتے ہیں۔ جہاں ایسے رشتے قائم ہوں وہاں انسانوں کی پیدا کردہ رکاوٹیں اور بندشیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پس جو لوگ جسموں کو دار و رسن کی آزمائشوں سے دوچار کر کے نظریات کی آغوش میں پلنے والے ان رشتوں کو برہم خویش فغا کرنے کی مساعی میں مصروف رہتے ہیں ان کی کج فہمی پر

سوائے ماتم کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ جن امور کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔ جیل میں مطالعہ کے لئے موقع ضرور ملتا ہے اور اس سلسلے میں اصولاً پابندی بھی نہیں۔ مگر ریڈنگ میٹرل (پڑھنے کیلئے مواد) صرف جیل کی لائبریری سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس لائبریری سے گزشتہ برسوں کے دوران سوائے چند مستثنیات کے جو کتب فراہم ہوئی ہیں وہ صرف ایسے CRIME FICTION (جرم کی کہانیاں) تک محدود تھیں جسے مغرب میں trash (بے کار) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پھر چونکہ مجھے لائبریری تک ذاتی طور پر رسائی حاصل نہیں اس لئے میرے تولیدار Warden جو کچھ بھی انگریزی میں ملتا ہے مجھے لا کر دیتے ہیں اور وقت گزاری کے لئے میں اسے تو عموماً کر پڑھ ہی لیتا ہوں۔ ہندی مجھے آتی نہیں اور انگریزی یا اردو سے میرے یہ تولیدار نا بلد ہیں۔ پس انتخاب کتب میں ”زبان یا زمن ترکی و من ترکی نمیدانم“ والی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہی ہائیکورٹ کا دروازہ ایک رٹ درخواست کے ذریعے کھٹکھٹانے کے بعد مجھے گزشتہ جنوری سے انگریزی کا ایک روزانہ اخبار پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ جبکہ اس قبل اس Luxury سے مجھ کو محروم رکھا گیا تھا۔ خط و کتابت پر بھی اصولاً کوئی پابندی نہیں مگر سنسر کے طویل اور پیچیدہ مرحلوں سے گذرنا اس کا مقدر ہے اور بعض اوقات یہ مرحلے جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم ثابت نہیں ہوتے۔ جب تک Misa (ایک ہندوستانی قانون) ہندوستان میں نافذ رہا میری ملاقات بندی۔ پھر دلی انتظامیہ کی اجازت سے ہونے لگی مگر گزشتہ برس ہائیکورٹ نے اس شرط کو ختم کر دیا۔ اب ملاقات عام قیدیوں کی طرح ہوتی ہے اور سال بھر میں میرے برادر اصغر محترم غلام نبی بٹ صاحب کشمیر سے دو تین بار برائے ملاقات یہاں ضرور آتے ہیں۔ گزشتہ فروری میں برطانیہ میں رہائش پذیر میرے ایک دوست بھی جو مقامات مقدسہ کی زیارت کے سلسلے میں یہاں آئے تھے مجھ سے ملاقات کر گئے تھے۔ ۳۶۔ میری صحت بفضل ایزدی بالکل ٹھیک ہے اور باقی سبھی حالات جوں کے توں ہیں۔ بہر حال آپ جیسے دوست احباب کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے سہارے یام اسیری صبر

وشکر کے ساتھ گزار رہا ہوں۔ آپ کی دعائیں شامل رہیں تو امتحان و آزمائش کے اس مرحلے میں بھی حق تعالیٰ سے سرخروئی کی امید ہے۔ امید کرتا ہوں کہ میرے کبھی دوست احباب تک میری خیریت کی اطلاع اور سلام پہنچا دیں گے۔

والسلام/مخلص/محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۷ جس بیماری کا علاج ممکن نہ ہوا سے برداشت کرنا چاہئے۔ ۲۶۷ میرے دوست کی زبان ترکی ہے اور مجھے ترکی نہیں آتی۔ ۳۶۷ ملک غلام سرور بٹ صاحب سے ملنے برطانیہ سے دہلی آئے تھے۔ ان کی بٹ صاحب سے تہاڑ جیل میں ملاقات 18 جنوری 1980ء کو ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ارشاد محمود انصاری کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/12 دسمبر 1980ء

عزیز ارشد محمود انصاری صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط گزشتہ مہینے کے آخری ہفتے میں ملا تھا۔ جواب لکھنے میں بوجہ تاخیر ہوئی جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ تاہم یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ خیریت سے ہیں۔ اللہ کرے کہ آپ کے حوصلے بلند اور عزائم جواں رہیں۔ یہاں اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں کہ زندگی سے مایوس ہونا اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔ یہ تو پرلے درجہ کی بزدلی کی علامت ہے۔ جو لوگ نظریات اور مقاصد کے لئے زندگی کو وقف کرتے ہیں ان کے یہاں یاس و ناامیدی کا گزرنے نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی زندگی سراپا جستجو اور جدوجہد ہو کر رہ جاتی ہے۔ انہیں یہ غم نہیں ستا سکتا کہ منزل ماقی ہے

یا نہیں۔ انہیں تو خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ منزل کی جستجو میں ان کا کارواں رواں دواں ہے اور اسی کارواں کو رواں دواں رکھنے کے لئے وہ ستون دار کو چومنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اہل ایمان کے نزدیک زندگی اور اس کی کاوشوں کا مفہوم ہی یکسر الگ ہوتا ہے۔ وہ اسے امر و نفردا کے پیمانے سے نہیں ناپا کرتے۔ اس لئے حالات کی نامساعدگی اور انسانوں کی failings (ناکامیاں) ان کی زندگی میں حسرت و نومیدی کا زہر گھول نہیں سکتی۔ ان کے یہاں زندگی ایک مسلسل عمل کا روپ اختیار کرتی ہے جو کہ پیہم رواں اور ہر دم جواں ہوتا ہے۔ اور یوں وہ انسانی تاریخ کی تزئین و آرائش کا سامان بہم کرتے ہیں۔ یقیناً خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو انسانوں کے اس تقافلے میں شمولیت کی سعادت حاصل کر سکیں۔ پس ان کے لئے حزن و ملال کی گنجائش ہی کہاں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی تمام تر بے بضاعتی اور کمزوریوں کے باوصف اپنی اپنی بساط کے مطابق اہل ایمان کے اس گروہ میں شمولیت کی توفیق عطا فرمائیں۔ آپ نے عزیزم عظیم دت طاہر نعیم انصاری اور میر خالد محمود کی آرزو کشمیر میں گرفتاری کا ذکر کیا ہے ۱۶۱۔ طلباء اور نوجوانوں کی جائز سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے قید و بند کا سہارا لیا کسی بھی مہذب حکومت کو زیب نہیں دیتا اور ہر انسانیت دوست اس پر احتجاج کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ تاہم مجھے امید ہے اور یقین بھی کہ آزمائش کے مرحلوں (جن میں قید و بند کے مرحلے بھی شامل ہیں) سے گزر کر عی ہمارے نوجوان پودے ان مقاصد اور اقدار کی صحیح معنوں میں آبیاری (Service) کر پائے گی جنہیں ہم سبھی من حیث ان قوم پسندیدہ سمجھتے ہیں اور جن کا حصول ہماری جدوجہد کی منزل ہے۔ آزمائش کے یہ مرحلے ہی جدوجہد کی رفتار میں ہمیز کا کام دیتے ہیں۔ بفضل ایزدی میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور لیم اسیری صبر و شکر کے ساتھ گزرا رہا ہوں۔ باقی حالات جوں کے توں ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میرے سبھی دوست احباب تک میری خیریت کی اطلاع کے ساتھ ساتھ ان تک میرا پر خلوص سلام بھی پہنچا دیں۔ آپ اور آپ کے دوستوں کے لئے مکرر سلام۔

فقط آپ کی دعاؤں کی طالبہ محمد مقبول بٹ

۱۶۲ این ایس ایف کے یہ طلباء اور اولا کوٹ میں ایک کنونشن کا انعقاد کر رہے تھے۔ حیات خان اقطاع میر نے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ چنانچہ ان طلباء کو گرفتار کر لیا گیا۔

محمد عارف کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی / 16 جنوری 1981ء

عزیز محمد عارف سلمہ / السلام علیکم

آپ نے 21 دسمبر کو جو خط تحریر کیا تھا وہ گزشتہ ہفتے مجھے یہاں مل گیا۔ جوانی خط لکھنے میں
بوجہ تاخیر ہوئی اس لئے اس ضمن میں معذرت خواہ ہوں۔ قید خانے کی اس زندگی میں بعض
اوقات ایک عدد ایر و گرام بھی جوئے شیر لانے سے کچھ کم ثابت نہیں ہوتا۔ پس امید کرتا ہوں کہ
آپ اس تاخیر پر آزرہ نہیں ہوں گے۔ میں خود کو اس توصیف کا مستحق تصور نہیں کرتا جس کا اظہار
آپ نے کیا ہے۔ انسانوں کی تاریخ میں عزائم کی بلندی اور ایمان کی پختگی کی ایسی عظیم اور
لازوال مثالیں موجود ہیں جو رفتی دنیا تک انسانوں کے لئے منارہ نور ثابت ہوتی رہیں گی۔ یہ انہی
ممتاز و اعلیٰ قدروں کا کرشمہ تھا جس نے اسماعیل کو آدابِ فرزند کی سکھائے اور یہی وہا یہ حیات تھا
جس کے طفیل عیسیٰ علیہ السلام نے بخوبی وقت کے حاکموں کی صلیب کو چوم لیا تھا اور طائف کے
بازار میں لبو لبان ہونے کا وجود حضور پر نور ﷺ کے ماتھے پر حزن و ملال کی شکنیں نہ آنے پائی
تھیں۔ یہ تو خیر بہت عظیم اور لامثال ہستیاں تھیں۔ تاہم تاریخ عالم میں ان سے کم تر درجے کی
اور بھی بے شمار مثالیں موجود ہیں جہاں انسانوں نے مقاصد زندگی کی حصول یابی کیلئے وقت کی مقتدر
قوتوں سے نبرد آزمانی کے دوران زندگی کا نذرانہ تک پیش کیا ہے۔ ہم لوگ ان عظیم ہستیوں کی
ہمسری کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے تاہم اپنی تمام تر کمزوریوں اور بے بضاعتی کے باوجود ان کے نقش پا
پر گامزن ہونے کی مقدور بھرکوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان صاحبانِ عزم
و ایمان کے تتبع کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ان مقاصد کی آبیاری ہو سکے جن کے لئے ہم اپنی زندگی کو
وقف کر چکے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہم خدا کے بزرگ و برتر سے اور مانگ ہی کیا سکتے ہیں۔ رہا
سوال حالات کی نامساعدگی اور پیش آمدہ مصائب و مشکلات کا تو اس ضمن میں یہ جاننا ضروری ہے
کہ یہ سب کچھ اس راہ عمل کی ملزومات میں شامل ہیں جو اہل ایمان نے تاریخ کے ہر دور میں اپنے

لئے مختص کی ہیں۔ مقاصد جس قدر عظیم اور حصول مقاصد کے لئے لگن جس قدر گہری ہو اسی تناسب سے مصائب کا احساس آساں ہوتا جاتا ہے۔ جو لوگ عزم و ایمان کو زندگی کا شعار بناتے ہیں انہیں یقین ہوتا ہے کہ کم من فقه قلبہ غلبت فقه کثیرہ ۱؎ کی حقیقت ان کی کامیابی کی سب سے بڑھی اور روشن دلیل بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ وہ قدرت کے انصاف سے کبھی بھی مایوس نہیں ہوتے۔ یہ جان کر خوش ہوئی کہ آپ نے میری خیریت کا پیغام اور میرا پر خلوص سلام بردارم امان اللہ خان تک پہنچایا۔ ان کی خیریت کی اطلاع سے دل کو سکون حاصل ہوا۔ امید ہے کہ آپ ان تک اور دیگر سبھی دوستوں تک میری خیریت کی اطلاع کیساتھ ساتھ میرا پر خلوص سلام پہنچا دیں گے۔ ان سبھی دوست احباب کے لئے میری نیک خواہشات وقف ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ بھی اپنی دعاؤں میں مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ آپ نے عزیز م غلام نبی کے ساتھ اپنے سلسلہ مراسلت کا ذکر کیا ہے۔ میری جانب سے ان کو اور ان کے دیگر دوست و احباب کو سلام پہنچائے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ اتنی دور اور اس عالم میں ان کے لئے سوائے دعا کے اور کچھ بھی کیا سکتا ہوں۔ ان کے بارے میں میری معلومات مختصر ہیں تاہم اندریں حالات اس سے بڑھ کر جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔

میری صحت بفضل ایزدی بالکل ٹھیک ہے اور یام اسیری صبر و شکر کے ساتھ گزار رہا ہوں۔ باقی سبھی حالات جوں کے توں ہیں۔ یہ مختصر سا خط ان حالات و کوائف کے بیان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرے لئے ذاتی طور پر بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

والسلام/خدا حافظ/مخلص/محمد مقبول بٹ

نوٹ:- نیا سال شروع ہو چکا ہے اللہ کرے یہ سال آپ اور آپ کے دیگر متعلقین کے لئے خیر و برکت کی بھرپور نعمتیں اپنے جلو میں لائے۔ آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱؎ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر (القرآن)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ارشاد محمود انصاری کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی / 3 فروری 1981ء

عزیزم ارشد محمود

السلام علیکم

آپ کا خط گزشتہ ماہ کے آخری ہفتے میں ملا تھا۔ جواب میں تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ قید و بند کی زندگی میں انسان خواہش کے باوجود اپنی ہر منشا کو پورا نہیں کر سکتا، پس وقت پر جواب نہ لکھنے کو میری دانستہ غفلت پر محمول نہ کیجئے گا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بندشوں کا ذکر چھیڑ کر اپنی صفائی پیش کروں کیونکہ ایسی صورت میں یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میں آپ کو اپنی مشکلات میں شریک ہونے میں دعوت دے رہا ہوں۔ اپنے لئے تو بقول غالب احساس درد کو منانے کا بہترین طریقہ رنج سے خوگر ہونا ہے۔ مگر اس کے اظہار سے دوستوں کو رنجیدہ کرنا میرے نزدیک مناسب نہیں۔ اتنا ہی کیا کم ہے کہ فرقت اور بے بسی کے اس عالم میں بھی لوگ وفا و اخوت کے رشتوں کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح امیدوں کے اس چمن ہوا کی برہم آبیاری کئے جا رہے ہیں جسے بجا طور پر ہم اپنی مشترکہ میراث سمجھتے ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا مگر جن لوگوں کے مقاصد بلند، تمنائیں عظیم ہوتی ہیں وہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی فکر و عمل کو منفی اثرات سے دور رکھتے ہوئے زندگی میں پیش آمدہ تجربات میں مثبت پہلو کی تلاش کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا اور یاس و ناامیدی کی کیفیت کو قلب و ذہن پر سوار ہونے کی اجازت دینا اہل ایمان اور صاحبانِ عزم کے نزدیک بدترین گناہ ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کے الضالین میں سے شامل ہونے سے بچائے رکھے اور امید و عزم کی بھرپور مسرتوں سے نوازتا

رہے۔ آمین ثم آمین۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے میرا پورا میں میرے کبھی دوستوں اور رفیقوں تک میری خیریت کی اطلاع پہنچا دی ہے۔ ان سب تک میرا جوابی سلام پہنچا دیجئے گا۔ خصوصاً محترم انصاری صاحب (عبدالحق انصاری صاحب) صوفی صاحب (صوفی زمان) جی ایمیر صاحب، بشیر تبسم صاحب، برادر صابر صاحب، اور عزیزم اشفاق انصاری صاحب کو میری طرف سے خلوص و محبت سے بھرپور سلام بھیجئے گا۔ ان سب اور دیگر رفیقوں کیلئے میری دعائیں اور نیک تمنائیں ہمیشہ وقف رہیں گی۔ آپ نے محترم امان اللہ صاحب کی مکہ شریف میں مجوزہ آمد کا ذکر کیا ہے اگر ان سے آپ کی ملاقات ہوئی ہو تو ان کی خیر خیریت کی اطلاع جوابی خط میں ضرور دیجئے گا اور ان کی مصروفیات کا اگر ممکن ہو مختصراً ذکر بھی کیجئے گا۔ بفضل ایزدی میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور لیم اسیری پر صبر و شکر گزر رہے ہیں۔ باقی معاملات جوں کے توں ہیں۔ آپ کیلئے اور ان تمام نوجوانوں ساتھیوں کیلئے جن کا ذکر آپ نے خط میں کیا ہے میری طرف سے سلام۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کو اپنے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائیں۔ اتنی دوران کیلئے سوائے دعا کے اور کیا پیش کر سکتا ہوں۔

والسلام/ آپ کی دعاؤں کا طالب / محمد مقبول بٹ

✽ امیدوں کے چمن سے مراد ایک خوشحال اور خود بخود کشمیر ہے۔

اکرام اللہ جسوال کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل ہیل نئی دہلی/27 فروری 1981ء

محترم جسوال صاحب

السلام علیکم

وہ خط جو آپ نے 11 فروری کو بک پوسٹ کیا تھا ملا۔ اس سے قبل جو خط میری اہلیہ مرحومہ کی وفات پر بسلسلہ تعزیت آپ نے بھیجا تھا وہ بھی ملا تھا اور اس کا جواب بھی انہی دنوں تحریر کیا تھا جو غالباً آپ کو مل گیا ہوگا۔ غالباً کالفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اس کی وصولیابی کی اطلاع آپ کے اس خط میں درج نہیں۔ اگر اس دوران آپ نے کوئی دوسرا خط لکھا ہے تو یقیناً ”خدائی فوجداروں“ ☆ کی دست برد کا شکار ہو گیا ہے۔ قید و بند کے اس عالم میں ربط و تعلق کے اس معصوم رشتے میں اگر کوئی رکاوٹیں کھڑی کرنا ہی اپنا شعار بنائے تو اس کی کج فہمی پر سوائے ماتم کے اور کیا ہی کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اپنے لئے یہ احساس ہی کافی ہے کہ جبری فرقت کے اس دور میں بھی ہماری یادوں کے اٹانے کوئی ہم سے چھین نہیں سکا ہے اور حالات کی نامساعدگی ان کی تازگی کو کم نہیں کر سکی ہے۔ یقین کیجئے آپ کے ہر خط سے ان یادوں کی تازگی دوچند ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر میں آپ کی یاد آوری پر شکریہ ادا کروں تو اسے محض ایک رسم کی ادائیگی نہ سمجھئے گا۔ ”یہ دنیا بہر حال جہنم ہے“ ☆ اس خیال سے اتفاق ممکن نہیں۔ اپنی ہیبت ترکیبی کے لحاظ سے یہ دنیا محض چند عناصر طبعی کا ایک مجموعہ ہے۔ یقیناً اس دنیا میں ایسے وسائل کی کمی نہیں جو انسانیت کی فلاح اور معاشرت کی تزئین و آرائش کا باعث ہو سکتے ہیں۔ یہ وسائل نہ ہوتے تو انسان ستاروں پر کند ڈالنے کا سوچ بھی نہ سکتا۔ اس کے باوجود یہ بھی برحق ہے کہ اسی دنیا میں ایسے دور آتے ہیں جب زندگی عذاب بن جاتی ہے اور انسانیت چلتی پھرتی لاشوں کا ایک غول ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر اس میں قصور کس کا

ہے؟ جب انسان خود ہی مقدروں کی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے اور پسندیدہ اصول و اخلاق کے علی الرغم اپنی ہی حس کو پابند سلاسل کرنے کی ٹھان لے تو سوائے محکومی اور پستی کے انسانوں کے حصے میں اور آئی کیا سکتا ہے۔ افغانستان ہو یا کشمیر یا دنیا کا کوئی اور خطہ جہاں بھی یہ کیفیت ہوگی وہاں درد و کرب ہی انسانوں کا مقدر بن جائے گا۔ با ایں ہمہ یہ اہل حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ Thesis کا ایک ☆ Anti-Thesis اور ہر Climax کا ایک ☆ Anti-Climax بھی پیدا ہو جاتا ہے اور فلسفے کی زبان میں یوں ایک جدلیاتی عمل ہمیشہ رواں رہتا ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ظلم و عدوان کے کسی بھی دور کو اس کے علمبرداروں کی فراوانی و مسائل کے باوجود ثبات حاصل نہیں ہو سکا۔ اس لئے کہ صنم کدہ جہاں نے ہر دور میں اپنے ابراہیم کو تلاش کیا ہے اور اسے پالیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دہشت صلیب کے باعث انجیل آگئی کے اوراق کھلنے نہ پائیں اور انسانیت اس کی ضیاء پاشیوں سے محروم رہے۔

آپ نے میرے کیس کی تفصیل اور حقیقت دریافت کی ہے۔ ان دونوں کا بیان اس مختصر خط میں ناممکن ہے۔ اجمالا یوں ہے کہ میری سزائے موت کی توثیق کشمیر ہائی کورٹ نے اکتوبر 1975 میں میری عدم حاضری اور عدم پیروی کے دوران کردی تھی اور جب 1976ء میں میں نے سپریم کورٹ میں پیدل لیو برائے اپیل کی عرض دائر کر دی تو اسے زائد المیعاد ہونے کے باعث خارج کر دیا گیا۔ پھر میری ☆☆ Mercy petition حسب قاعدہ ریاستی کورٹ کے پاس بھیج دی گئی مگر اس کے مندرجات ان کی طبع نازک پر گراں گزرے اور وہ اسے مسترد کر بیٹھے۔ اب یہی پینشن صدر ہند کے پاس مئی 1977ء سے زیر غور ہے اور تاہنوز اس پر کوئی فیصلہ صادر نہیں ہوا ہے۔ ویسے یہاں کی سپریم کورٹ نے اپنی ☆☆ Rulings میں یہ قرار دیا ہے کہ سزائے موت کی توثیق و تکمیل صرف ☆☆ Exceptional حالات میں کی جانی چاہیے اور قتل کے مقدمات میں صرف عمر قید کی سزا کو Rule تصور کیا جائے۔ ان روئس کی روشنی میں ☆☆ s Condemned Prisoner کی رٹ درخواست پر سپریم کورٹ نے ان کی

سزائے موت عمر قید میں بدل دی ہے۔ عدالتی چارہ جوئی کے اس طریقہ کار پر زکیر خیر خراج کرنا پڑتا ہے اور فی الحال میرے بس سے باہر ہے۔ اس لئے صدر ہند کی حس انصاف پر تکیہ کئے ہوئے اسیری کے ایام گزرا رہا ہوں۔ عزیزان ریاض احمد اور عبدالحمید دونوں سرینگر میں ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں پر بشمول میرے ان کے خلاف ایک عدویس کسی سپیشل جج کی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس کیس میں Chief Accused ہونے کے باوجود سرکاری طور پر تاحال نہ تو مجھے اس کی کوئی اطلاع دی گئی ہے اور نہ ہی ٹرائل کورٹ میں مجھے تاحال نوٹیشن کیا گیا ہے۔ یہ کیس میری Absentia ۱۲۶ میں چل رہا ہے جبکہ میں سرکار کی تحویل میں ہوں۔ مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔ بفضلِ ہیز دی میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور آپ جیسے دوستوں کی دعاؤں کے سہارے وقت بخیریت گزرا رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اور دیگر سبھی احباب خیریت سے ہوں گے۔ گزشتہ اکتوبر میں برادرم ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر فاروق حیدر) کا ایک خط ملا تھا اس کے بعد ان کی جانب سے خاموشی رہی۔ نہ معلوم میرا جوابی خط انہیں ملا بھی کہ نہیں۔ بہر حال آپ کی وساطت سے راولپنڈی اور دیگر مقامات پر سکونت پذیر سبھی دوست و احباب کو میری جانب سے خلوص و محبت سے بھرپور سلام۔ فقط

آپ کی دعاؤں کا طالب
محمد مقبول بٹ

نوٹ: ایک عرصہ ہوا کہ محترم علوی صاحب اور جی ایم میر صاحب کی خیریت کی اطلاع نہ مل پائی۔ اگر ممکن ہو تو ان کے احوال سے مجھے ضرور مطلع کریں۔

۱۶۶ "خدا کی فوجدار" یعنی خفیہ انجمنی کے لوگ ۲۶۶ جسوال صاحب نے اپنے خط میں دنیا کو جنم لکھا تھا۔ ۳۶۶ وہ قیدی جنہیں سزائے موت سنائی گئی ہو ۶۶ بڑا طرم ۶۶ غیر موجودگی۔ ۴۶۶ دعویٰ مقدمہ ۵۶۶ عروج ۶۶ رحم کی اپیل ۶۶ فیصلے ۸۶ غیر معمولی

غلام سرور کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی / 27 فروری 1981ء

برادر غلام سرور صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط ملا، یادآوری کا شکریہ۔ آپ سے ملاقات کے بعد میں خود بھی آپ کو یاد کرنے کے لئے کئی بار سوچتا رہا مگر میرے پاس آپ کا پتہ نہیں تھا۔ برادر ام اصغر صاحب نے بھی کوٹلی سے ایک خط تحریر کیا تھا۔ میرے جوابی خط کے بعد وہ اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔ یوں یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ بہر حال اب جبکہ یہ رشتہ شروع ہو چکا ہے مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی وقتاً فوقتاً یاد کرتے رہیں گے۔ بھلا دوستوں کے مابین مراسلت میں احساس کمتری کی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے۔ اس میں ذرہ بھی شک نہیں کہ جو لوگ توکل باللہ کو ذراہ بنا کر کارزار زندگی میں حق کی علمبرداری کو اپنا شعار بناتے ہیں وہ صبر آزما امتحانوں سے گزرنے کے باوجود اپنے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنے دیتے۔ وسائل کی کمی اور حالات کی نامساعدگی کے باوجود ان کے عزائم جواں رہتے ہیں اور یقین کے ساتھ کہ کم من ھۃ قلبیۃ غلبۃ ھۃ کثیرۃ ۱۰ ۱۱ وہ اپنی مخصوص راہ عمل پر گامزن رہتے ہیں۔ پھر اس بشارت امیز وی کے ہوتے ہوئے کہ ولا تھننوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین ۲۰ دنیا کی کوئی طاقت ہے جو انہیں مال کا رکامیابی اور سرخروئی سے روک سکتی ہے۔ پس یہ غلط ہے کہ اس گلشن ہستی میں تنگی داماں کا کوئی علاج نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان خود ہی چند کلیوں پر قناعت نہ کر بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور عنایتوں کا سلسلہ ایک بحر بیکراں ہے۔ انسان جہد و ایمان پر قائم رہے تو بڑے سے بڑا اعجاز بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس یقین کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے یاس و ناامیدی کا کوئی مقام نہیں اور نہ ہی

آزردہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے۔

آپ نے جس خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے اس کے لئے شکریہ۔ حق تو یہ ہے کہ خلوص و محبت کے ان باہمی رشتوں کی استوری ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اسی سرمایے کی بدولت آزمائش کی یہ لکڑیاں اپنی تمام تر مشکلات کے باوصف آسان ہوتی جا رہی ہیں۔ ان رشتوں کو جس قدر مضبوط اور پائیدار بنایا جائے راہ سفر کی صعوبتیں اتنی ہی کم ہوتی جائیں گی۔ پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ توقعات پوری ہو سکیں جن کو ہم سبھی حضر جان بنائے بیٹھے ہیں۔ یاد رکھیں دلوں کی گہرائیوں سے اٹھنے والی پُر خلوص دعائیں با رگاہ خداوندی میں ضرور مستجاب ہوتی ہیں۔ آخر اس ذات باری سے بڑھ کر دلوں کا حال جانے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ میری اہلیہ مرحومہ کی وفات پر آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ میرے حوصلوں کی تقویت کا باعث بنے ہیں۔ کل نفس ذائقة الموت ﴿۳۶﴾ انسان فانی ہے اور موت سے کسی کو مغر نہیں۔ بحر حال مجھے اس سلسلے میں دکھ صرف اس بات کا ہے کہ سفر زندگی کے آخری مراحل میں مرحومہ کے تئیں وہ ذمہ داریاں پوری نہ کر سکا جو کہ میرا حق تھیں۔ یہ اللہ کی رضامندی اس میں کون کیا کر سکتا ہے۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور یام امیری صبر و شکر کے ساتھ گزار رہا ہوں۔ باقی حالات جوں کے توں ہیں۔ آپ اور آپ کی وساطت سے دیگر سبھی دوست احباب کیلئے میری جانب سے خلوص و محبت سے بھرپور سلام۔

فقط آپ کی دعاؤں کا طالب محمد مقبول بٹ

﴿۱۶﴾ ترجمہ: ہاں اچھوٹی جماعتیں غالب آتی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے (البقرہ ۲۳۹)

﴿۳۶﴾ ترجمہ: اور ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی سر بلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو (آل عمران ۱۳۹)

﴿۳۶﴾ ترجمہ: ہر جی کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے (القرآن)

ارشدمحمود انصاری کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل ہیل نئی دہلی/29 مارچ 1981ء

عزیزم ارشدمحمود انصاری صاحب/ السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ 17 مارچ کو ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میں نے آج تک آپ کے کبھی خطوط کا باقاعدگی سے جواب دیا ہے۔ بچپلی بار کچھ ناگزیر وجوہ کی بنا پر جوابی خط لکھنے میں تاخیر ہوئی تھی اور اس کے لئے میں نے آپ سے معذرت بھی کی تھی۔ میری کوشش یہی ہے کہ کبھی دوست احباب کے خیریت ناموں کا بروقت جواب دوں کیونکہ اس سلسلے میں میری جانب سے تاخیر کے باعث حلقہ احباب میں تشویش کا پیدا ہونا قابل فہم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جبری فرقت کے اس عالم میں نامہ و پیام کا یہ مختصر سا سلسلہ نہ صرف ہماری یادوں کو زندہ رکھنے کا واحد ذریعہ ہے بلکہ باہمی قربت کے احساس کو قائم رکھنے اور خلوص و محبت کے جذبات کے اظہار کے توسط سے ہماری امیدوں اور حوصلوں کو تقویت پہنچانے کا بھی باعث ہے۔ یقین رکھیے اس ضمن میں میری جانب سے کوتاہی نہیں ہوگی۔

آپ کی تشویش بجا ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلا نا چاہتا ہوں کہ زندگی اور موت پر صرف اس قدر مطلق کو اختیار حاصل ہے جبکہ نہ صرف ہم بلکہ یہ ساری کائنات مخلوق ہے۔ یہ محض ایک مفروضہ نہیں بلکہ میرے لئے نہ صرف علم و وجدان بلکہ زندگی میں پیش آمدہ تجربات کا بھی نچوڑ ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں حق کا ساتھ دینے والے زندگی کا ایک الگ اور منفرد مفہوم رکھتے ہیں۔ اس مفہوم کا بیان اس مختصر سے خط میں ممکن نہیں تاہم میں یہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جس بازی کے لئے ہم زندگی داؤ پر لگا چکے ہیں اس کی نوعیت ایسی ہے کہ ہار کر بھی بازی میں مات نہیں۔ درحقیقت اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ انسان کامل شعور کے ساتھ زندگی کے مقاصد کی

ڈاکٹر فاروق حیدر کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم
سینٹرل جیل نئی دہلی / ☆۱.....

برادر م فاروق حیدر صاحب
السلام علیکم

کچھ عرصہ قبل آپ کا ارسال کردہ کپڑوں کا پارسل ملا تھا ☆۲۔ پھر چند روز پیشتر آپ کا محبت نامہ بھی ملا۔ دونوں کے لئے آپ کا شکریہ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ فرقت کے اس طویل دور میں آپ مجھ سے وابستہ یا دوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ یادوں کے اس سہارے سے اسیری کے یہ لام تنہائی صعوبتوں کے باوجود آسان ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کا شکوہ بجا ہے کہ ایک عرصہ سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ یہ بات نہیں کہ آپ کی یاد ذہن سے محو ہو گئی تھی اور یہ بھی نہیں کہ لکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ اسیری کے دور میں بھی متعدد ایسے تجربات سے واسطہ پڑتا ہے جو یقیناً قابل ذکر ہوتے ہیں ☆۳ مگر یہ بھی تجربات عام طور پر تلخ ہوا کرتے ہیں پھر آپ کو کیا معلوم کہ اس زنداں خانے میں ☆۴ Top Security Prisoner ہونے کے باعث میرے ان تجربات کی ترشی فزوں تر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک طویل عرصہ سے ان صبر آزما حالات کا مقابلہ کرتے کرتے اب ان کی تلخی کا احساس بھی ماند پڑ چکا ہے اور مصائب و مشکلات کے اس دور میں مسکراتے رہنا اپنی (فطرت ثانیہ) Second Nature بن چکی ہے۔ پر میں یہ نہیں چاہتا کہ ان تجربات کے تذکرے سے آپ جیسے حساس دوستوں کے احساس درد میں اضافہ کروں۔ اپنا رجحان طبع اب بقول کسی فلمی شاعر کے کچھ ایسا ہوتا جا رہا ہے کہ ہم ”جرم محبت کی سزا پائیں گے تنہا“ رسی دھروں کی خطائیں تو ان کا گھمبے سودھے۔ بایں ہمہ مجھے اعتراف ہے کہ آپ کو اپنی خیریت سے مطلع کرنے میں میری جانب سے تساہل ہوا ہے اور اس کے لئے میں

آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ تاہم یہاں یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے جتنے بھی خطوط آج تک ملے ہیں ان کا ہر وقت جواب دے چکا ہوں۔ کیونکہ خط ملنے کے بعد جواب لکھنے میں تساہل کے لئے میرے ذہن کو کوئی وجہ آج تک نہیں سوچھی ہے۔ پس مامہ و پیام کے اس سلسلے کو اگر آپ جاری رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو میری خیر و عافیت کی اطلاع نہ ملتی رہے۔ اس سلسلے میں آپ مجھ سے زیادہ بہترین پوزیشن میں ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ پشاور تشریف لے گئے تھے اور وہاں ہمارے سبھی لواحقین سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ محترم چچا جان کی ضعیف امیری کے باعث مجھے اکثر تشویش رہتی ہے۔ پھر ان کی صحت بھی تو اچھی نہیں۔ ہر حال اس سلسلے میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کے حوصلوں کو قائم رکھنے میں مقدور بھر کوشش کریں گے تاکہ اس باب میں میرے ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ مجھ یقین ہے کہ آپ کے مشورے ان کے اس احساس بے چارگی کو دور کرنے میں کامیاب ہوں گے جس کا میری غیر موجودگی میں انہیں سامنا ہے۔ گزشتہ دو ماہ کے عرصے میں ان کی جانب سے مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ اس لئے یہ پتہ نہیں چل سکا وہ اپنے فوری مسائل کو حل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ انہیں فہمائش کریں کہ وہ مناسب وقتوں پر اپنے حالات و کوائف سے مجھے آگاہ کرتے رہیں۔ میری صحت بفضلہ ایزدی بالکل ٹھیک ہے اور لایم امیری صبر و شکر کے ساتھ گزارنے کی کوشش جاری ہے۔ باقی معاملات جوں کے توں ہیں۔ آپ کے خط سے دوسرے احباب کی خیریت کی اطلاع ملی۔ اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ میری جانب سے سبھی دوست و احباب کو نہ صرف میری خیریت کی اطلاع دیں بلکہ ان تک میرا پر خلوص سلام بھی پہنچا دیجئے گا۔ گزشتہ دنوں محترم جہاں صاحب کو بھی ایک خط ارسال کر چکا ہوں جو غالباً اب تک انہیں مل چکا ہوگا۔ آپ اور آپ کے اہل خانہ کو میرا خصوصی سلام، ننھے سلطان حیدر کے لئے بہت بہت پیار۔ اگلے خط میں عزا اور منزہ کی درس و تدریس کے بارے میں ضرور تحریر کیجئے گا۔ فقط والسلام

آپ کا بھائی / محمد مقبول بٹ

ملک غلام سرور کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/31 مئی 1981ء

محترم سرور صاحب
السلام علیکم

ایک طویل عرصے کے بعد آپ کا محبت نامہ ملا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ”دیار غیر“ زندگی کے معمولات کچھ اس نوع کے ہوتے ہیں کہ انسان ہر دم ہمدیم افرستی کا شکار رہتا ہے مگر جن حالات سے ہم لوگ دوچار ہیں ان میں نامہ و پیام کا یہ مختصر اور مومو سلسلہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری یادوں کے چراغ روشن رہتے ہیں بلکہ آزمائش کے اس دور میں ہمارے حوصلوں کو تقویت بھی ملتی ہے۔ اس لئے آپ کی یادآوری کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلے کو آئندہ بھی جاری رکھنے کے لئے اپنی مصروفیات کے باوجود وقت نکالتے رہیں گے۔ مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ زندگی میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونے کے لئے پرچار راستوں اور سنگاڑ چٹانوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ حالات کی ماساعدگی اور راہ سفر کی مشکلات کو بہانہ بنا کر اپنے پسندیدہ تصورات کو عملی شکل دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور خود کو حالات کی رو میں بہنے کی دانستہ اجازت دیتے ہیں وہ درحقیقت خود اپنی زندگی کے ساتھ ایک بہت بڑی مافسانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اوارک و شعور کے باوجود محض حالات کی ماموافقت کے باعث جہد و عمل کی راہ پر ترک سفر ایک ایسا گناہ ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دامن زندگی کو اس گناہ کی آلودگی سے بچائے رکھے اور ہمیں اس قدر توفیق عطا فرمائے کہ ہم مقدر بھر

ایمان و عمل کے راستے پر گامزن رہ سکیں۔

ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به و اعف عنا و اغفر لنا و ارحمنا انت

مولانا فانصرنا علی القوم الکفرین۔ ☆ ۱ آئین

آپ نے خط کے ہمراہ 30 پونڈ کا جو بینک ڈرافٹ بھیجا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔ ابھی تک یہ کیش نہیں ہوا ☆ ۲ کیونکہ اسے کیش کرانے کے لئے جیل حکام کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ دنیا کے اس خطے میں سرکاری مشینری کس قدر سرعت کے ساتھ کام کرتی ہے؟ ویسے آپ کا خط کوئی ڈیراھ میڈینٹل مل گیا تھا مگر جواب لکھنے میں بوجہ تاخیر ہوئی جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور ایام اسیری صبر و شکر کے ساتھ گزرا رہا ہوں۔ مجھے کوئی ایک ماہ قبل وارڈ نمبر ۱۸ میں منتقل کر دیا گیا ہے جسے جیل کوزبان میں پچانسی کوٹھی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلے تنہائی تھی اور اب سزائے موت کے کچھ قیدیوں سے ملنے جلنے کا موقع مل رہا ہے۔ باقی حالات جوں کے توں ہیں۔ یہاں آج کل گرمی زوروں پر ہے اور ۲۴ گھنٹے سیل Cell میں بند رہنے کے باعث جسم بس ماہی بے آب کی طرح محسوس کرتا ہے۔ باقی خیریت۔

میری جانب سے تمام دوست و احباب کو سلام کہنا نہ بھولنے گا۔ پچھلے دنوں ہر اورم اصغر صاحب نے بھی کوٹلی سے ایک خط بھیجا تھا جس کا جواب جلد ہی لکھنے والا ہوں۔

والسلام / خدا حافظ / خیر اندیش

محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۴ ترجمہ:- اے ہمارے پروردگار! ہم پر وہ جھجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر۔ تو ہی ہمارا مددگار ہے۔ تو ہماری مدد فرما تو ہم کو ظار پر۔ (البقرہ ۲۸۲) ۲۶۴ کبھی کبھار کوئی دوست مقبول بٹ شہید کو پیسے بھیجتا تو جیل حکام جان بوجھ کر بینک ڈرافٹ کیش کروانے میں لگی مالا تاخیر کر دیتے۔

راجہ مظفر خان کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی / 5 جون 1981ء

ڈیئر مظفر راہ

السلام علیکم

ایک طویل مدت کے بعد آپ کی خیریت کی اطلاع ملی۔ یہ بات تو خیر نہیں کہ آپ کی یاد ذہن سے محو ہوئی تھی یا یہ کہ آپ سے تعلق خاطر کمزور پڑ گیا تھا۔ تنہائی اور جبری فرقت کے اس عالم میں آپ جیسے اہل خلوص و وفا شعار دوستوں اور عزیزوں سے وابستہ یادیں میرے حوصلوں کی تقویت کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خلوص و محبت کے جو رشتے ہمارے درمیان برسوں سے قائم چلے آ رہے ہیں اور جن کی آبیاری ہم خون جگر سے کرتے رہے ہیں۔ اس قدر پختہ اور لازوال ہیں کہ حالات کی نامساعدگی اور با مخالف کے تند و تیز طوفان ان کی استوری میں کوئی رخنہ پیدا کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ کے محبت نامے سے ان یادوں کی تازگی دو چند ہوئی جنہیں اسیری کے عالم میں اب بھی سینے سے لگائے بیٹھا ہوں۔ پس اگر میں اسی ضمن میں آپ کا شکریہ ادا کروں تو اسے محض ایک ادائیگی رسم پر محمول قرار نہ دیجئے آپ نے چاہت کے باوجود کچھ زیادہ نہ لکھنے کے سلسلے میں جس مجبوری کا اظہار کیا ہے ☆ اس کا مجھے بھرپور احساس ہے۔ بایں ہمہ آپ کو یہ بتانا پسند کروں گا کہ دلوں کی باتیں جاننے کیلئے ڈھول پیٹنے کی ضرورت نہیں۔ جذبات و احساسات کی ایک منفرد زبان ہوا کرتی ہے۔ انہیں سمجھنے کیلئے لمبی چوڑی تحریروں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ آپ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے ہیں اور جو اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے شوق و یقین اور اس سے وابستہ جہد و عمل میں متواتر اضافے کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ توفیق فرمائے۔ آمین۔ آپ کو چونکہ بیت اللہ سے قرب کا شرف حاصل

ہے اس لئے بھی مجھے بھروسہ ہے کہ آپ ذوقِ یقین اور شوقِ عمل کی نعمت سے مالا مال ہوتے رہیں گے۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں سے صدیوں قبل انسانوں کو جسم و روح کی آزادی و بالیدگی کے سدا بہار پیغام سے نوازا گیا تھا۔ اس پیغام کی انقباضی ☆ ۲ Inspiration سے اہل خلوص و وقار اب بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ جہالت، تاریکی اور جبر و غلامی کی علمبردار قوتوں سے نبرد آزما ہونے اور انہیں سرنگوں کرنے کے لئے ایمان و عمل کی شاندار روایتوں کو قائم کرنا ہی تو اس عظیم اسوہ حسنہ کی ☆ ۳ Essence ہے جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے قریبی رفقاء کا رد و بیعت کر چکے ہیں۔ ☆ ۴ مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے عزیزوں اور رفیقوں کی دعائیں اور جذبہ عمل، دار و رسن کی اس آزمائش میں ہم سبھی کو سرخروئی سے ہمکنار کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ اپنی کوتاہی کا احساس ہی انسان کی عظمت و دلالت کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ اس پر شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ احساس نہ ہو تو جہد و عمل کا صحیح تعین ناممکن بن جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ انسان کا ایمان اور جذبہ عمل قائم رہے تو ہزار نامیوں اور Set Backs کے باوجود مال کا حصول مقصد کی مسرتیں اس کا مقدر بن جایا کرتی ہیں اور پھر بقول کسی شاعر کے

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا گر جیت گئے تو کیا کہنا گر ہارے بھی تو بازی مات نہیں اس پر قرآن کی یہ بشارت ہمارے لئے کیا کم ہے کہ ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کستم لا تعلمون۔ ☆ ۵ پس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے کی سعادت سے نوازے، تاکہ ہم اس بشارت کے مستحقین میں شامل ہو سکیں۔ سچائی کے منکر سرنگوں ہوں اور اہل حق فتح و نصرت سے ہمکنار۔ بفضل ایزدی میری صحت بالکل ٹھیک ہے اور ایام اسیری صبر و شکر کے ساتھ گزرا رہا ہوں۔ حالات و شرائط اسیری جوں کے توں ہیں۔ البتہ ایک ماہ قبل مجھے زنداں خانے کے وارڈ نمبر 18 سے وارڈ نمبر 16 میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس وارڈ کو ذلیل کی زبان میں پھانسی کوٹھی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ برسوں کی تنہائی کے بعد اب اس نئے وارڈ

میں کچھ اور قیدیوں سے ملنے جلنے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ، یقیناً میری اسیری کے بارے کچھ زیادہ جاننے کے خواہشمند ہوں گے۔ مگر اس مختصر سے ایروگرام میں ان تمام حالات و کوائف کا بیان ممکن نہیں۔ پھر اسیری کا رنج و الم تو اب فطری سا لگ رہا ہے اور بقول غالب:

رنج سے خوگر ہو نساں تو مٹ جاتا ہے رنج

میری جانب سے آپ کو اور آپ کی وساطت سے تمام دوست و احباب اور عزیزوں کے لئے خلوص و محبت سے بھرپور سلام۔ امید ہے کہ آپ گاہے گاہے یاد کرتے رہیں گے تاکہ باہمی یادوں کی تازگی کو جاری رکھا جاسکے۔

خدا حافظ / آپ کا مخلص / محمد مقبول بٹ

☆ احساس کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔ دیا ر غیر کی کال کو ٹھہری میں مفید ایک شخص آزاد فضاؤں میں بسنے والے دوستوں کی مجبور یوں کا بھی کتنا احساس رکھتا ہے۔ ۲۶ روح ۳۶ جوہر ۴ مقبول بٹ شہید کی فکر کا سرچشمہ وہی مقام تھا جہاں سے شرف انسانیت کی وہ عظیم صدا بلند ہوئی تھی جس نے آزادی اور حریت فکر کا حقیقی تصور دیا یعنی خانہ کعبہ۔ ۵۵ نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو تم ہی سر بلند رہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔

(آل عمران 139)

اکرام اللہ جسوال کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

سنٹرل جیل نئی دہلی/17 جون 1981ء

محترم و مکرم جسوال صاحب

السلام علیکم

گزشتہ ماہ کی 17 تاریخ کو جو محبت نامہ آپ نے حوالہ ڈاک کیا تھا وہ کچھ عرصہ قبل ملا تھا۔ مگر جوہ جواب میں تاخیر ہوئی جس کے لئے معذرت کا طلب گار ہوں۔ میری جانب سے خیریت کی اطلاع ملنے میں تاخیر پر آپ اور دیگر دوست و احباب کو جو تشویش ہوئی ہے وہ نہ صرف قابل فہم ہے بلکہ خلوص و محبت کے اس رشتے کی نمایاں علامت بھی ہے جو برسوں سے ہمارے درمیان قائم چلا آ رہا ہے۔ اور جس کی آبیاری ہم بھی خون جگر سے کرتے آئے ہیں۔ یقین کیجئے اس ضمن میں بعض اوقات میری جانب سے تاخیر ارادتا نہیں بلکہ کوائف اسیری کی مجبوریوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ دوست احباب کے سبھی خطوط کا جواب دیا جائے اور اس سلسلے میں اب تک کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات میرے یہ جوانی خطوط راستے ہی میں غائب ہو جاتے ہیں اور اس طرح نامہ و پیام کے اس معصوم سلسلے میں ایک طرح کا تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ حالات موجودہ سوائے اس کے اور کیا کیا جاسکتا ہے کہ "What Can not be cured must be endured" جس مرض کا کوئی علاج نہ ہو اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے۔ تاہم آپ یقین رکھئے کہ آپ سے وابستہ یادیں گردشِ یام کی طویل ماساعد گیوں کے باوجود میرے ذہن و قلب میں تازہ و تازہ ہیں اور ان کی تازگی میرے صبر و حوصلہ کی تقویت کے لئے ہمیشہ کی طرح سب سے بڑا باعث بنی رہے گی۔ میرے تئیں آپ نے جس وابستگی اور خلوص و محبت سے بھرپور جذبات کا

اظہار کیا ہے۔ یہ میرے لئے گراں بہا سرمایہ ہے۔ پبلک لائف میں کسی بھی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز یا سرمایہ افتخار نہیں ہوتا کہ ہم سفروں اور رفقاء کار سے اس کی وابستگی غرض مندی اور وقت کی مصلحتوں اور تقاضوں سے بے نیاز ہو کر شعوری ہم آہنگی، خلوص و وفا شعاری اور محبت و ایثار کی عظیم انسانی قدروں کی بنیادوں پر استوار ہو۔ آپ جیسے دوستوں کے دلوں کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ”بے ساختہ“ دعائیں نہ صرف اس بے لوث افس و محبت کی زندہ علامتیں ہیں جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں بلکہ امتحان و آزمائش کے اس دور میں ہماری سرشاری کے لئے رحمت ایزدی کو Invite کرنے کے لئے بھی کافی ہیں۔ یقین رکھئے جہاں عزائم جواں، حوصلے بلند اور جذبہ عمل موجود ہو وہاں لبوں پر آئیوالبی دعائیں دراصل ان انگلوں اور تمناؤں کی آئینہ دار ہوتی ہیں جنہوں نے ہمیشہ انسانی تحریک و عمل کی نہ صرف ترقین و آرائش کی ہے بلکہ رسائی منزل کے لئے سامان بھی فراہم کیا ہے۔ پس آپ دعاؤں کے اس سلسلے کو جاری رکھئے تاکہ رحمت ایزدی جوش میں آئے اور مشکلوں کا یہ دور جلدی آسان ہو جائے۔ آمین۔

میری صحت بفضل ایزدی بالکل ٹھیک ہے۔ احوال و کوائف اسیری جوں کے توں ہیں۔ اس لئے صبر و شکر کیساتھ وقت گزاری کا عمل جاری ہے۔ کچھ عرصہ قبل مجھے وارڈ نمبر 18 سے وارڈ نمبر 16 میں منتقل کر دیا گیا ہے جسے ذیل کی زبان میں ”پچانسی کوٹھی“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے یہ فرق ضرور ہوا ہے کہ پہلے تنہائی تھی اور اب کچھ ساتھی قیدیوں سے ملنے جلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس طرح وقت قدرے ”مصرفیت سے کٹ“ رہا ہے۔ آئندہ خط لکھتے وقت Ward No:16 کا حوالہ نہ بھولنے گا۔ میری جانب سے آپ کو اور آپ کی وساطت سے سبھی دوست احباب کو پر خلوص سلام۔ امید ہے کہ آپ اپنے احوال و کوائف سے گاہے گاہے مطلع کرتے رہیں گے۔ والسلام

آپ کی دعاؤں کا طالب / محمد مقبول بٹ

محمد عارف کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/20 جون 1981ء

عزیز محمد عارف صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ 2 جون موصول ہوا۔ بس یوں سمجھے کہ دل پر ایک بجلی سی گر گئی۔ مرحوم صوفی زمان صاحب جنہیں مرحوم کہتے ہوئے دل کو دھکا سا لگتا ہے کی وفات حسرت آیات پر جتنے بھی آنسو گرائے جائیں کم ہیں۔ اہل خلوص و وفا کے اس عظیم پیکر کی تصویر آنکھوں کے سامنے یوں آرہی ہے جیسے ابھی بھی وہ مجھ سے ہم کلام ہوں۔ اس عالم فانی میں کسی بھی ذی روح کو موت سے مفر نہیں۔ قدرت کے اس اعلیٰ قانون کے سامنے سر تسلیم خم کئے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ مرحوم تو اس دنیا سے چلے گئے مگر ان سے وابستہ یادیں ایسی ہیں جنہیں تادم زیست فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مرحوم کی وفات میرے لئے ذاتی طور پر ایک عظیم صدمہ ہے۔ انہیں مجھ سے کس قدر محبت تھی اور میرے تئیں ان کے خلوص اور وفا شعاری کی گہرائی کس قدر عمیق تھی اس کا اندازہ شاید صرف مجھے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بات میرے لئے مزید صدمے کا باعث ہے کہ جبری فرقت کے اس عالم میں مرحوم صوفی صاحب کے سفر زندگی کے آخری لمحوں میں ان سے حق رفاقت نبھانے کے فرض کی ادائیگی سے محروم رہا۔ بقول کسی شاعر کے سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی ☆ ۲ بایں ہمہ حزن و ملال کی اس المناک کیفیت کے باوجود جو اس مردِ حر کی وفات سے ہماری صفوں میں فطری طور پر پیدا ہو گئی۔ ہمیں یاس و ناامیدی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ مرحوم انسانوں کی اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے جن کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر اقدام نظریات و تصورات سے متحرک ہوتا ہے۔ یہ لوگ محض زندہ رہنے کے لئے نہیں بلکہ ان تصورات اور آدرشوں

کی تکمیل کے لئے زندگی وقف کرتے ہیں جنہیں وہ بجا طور پر انسانوں کی پسندیدہ میراث قرار دیتے ہیں۔ یہ انہی مردان حق آگاہ کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے کہ انسانیت زندگی کے اصل مفہوم سے آشنا ہوتی ہے اور اصلاح و فلاح کا وہ عمل جاری رہتا ہے جس سے نہ صرف انسان اپنے پسندیدہ عزائم کی تکمیل کرتا ہے بلکہ زندگی کو حسن و خیر کی قدروں سے مزین کر کے قلب و روح کی طمانیت کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ انسانوں کی اس قبیل کے بارے میں کلام الہی کا ارشاد ہے کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر ☆ ۳ یقیناً جو لوگ زندگی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے وقف کر دیتے ہیں ان سے بڑھ کر کسی کا اسوہ کیونکر قابل تقلید ہو سکتا ہے۔ دعا کیجئے اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں تاکہ حق شناسی اور تکمیل مقاصد کے لئے جہد رواں کے ان چراغوں کی روشنی بجھنے نہ پائے جنہیں مرحوم صوفی صاحب اور ان کی قبیل کے لوگوں نے زندگی بھر خون جگر سے روشن رکھا۔ آئیں۔ اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا چاہت ہو سکتی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر مرحوم کے لواحقین اور دیگر متعلقین سب تک میرے جذبات تعزیت و ہمدردی اس المناک موت کے سلسلے میں پہنچا دیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اپنے برگزیدہ بندوں کے پہلو میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر و تحس اور یہ صدمہ جانکاہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ میرے معاملے میں سرینگر انتظامیہ کی طرف سے صدر ہند کو کی جانے والی سفارش کا جو ذکر آپ نے کیا اس سے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی ☆ ۴ دراصل وہاں جس گروہ کو حادثات و قحط نے اقتدار کی گدی پر متمکن کر دیا ہے اس سے خیر و فلاح کی توقع ہی عبث ہے۔ یہ محض وقتی رد عمل نہیں بلکہ میری Considered Opinion ہے۔ اس Opinion کی بنیاد وہ غیر جانبدار تجزیہ ہے جو میں کئی برسوں سے کرتا آیا ہوں مگر اس کی تفصیلات کا بیان اس مختصر سے ایر و گرام میں ممکن نہیں۔ ان کو تاہ اندیشوں کو کون سمجھائے کہ ”شہادت ہے مطلوب و مقصود و مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی“۔ جہاں صرف مال غنیم اور کشور کشائی منزل ٹھہرے وہاں عدل و انصاف کی توقعات

رکھنا خوش فہمی نہیں بلکہ فہمی کی دلیل ہوتی ہیں۔ میں ان دونوں میں سے فی الوقت کسی کا بھی شکار نہیں ہوں۔ اس بات سے بالکل بے نیاز ہو کر کہ کون کیا سفارش کرتا ہے اور کون کیا فیصلہ دیتا ہے میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عزم و ایمان کو قائم رکھنے کے لئے مجھے مقدر و رکھ تو فیض عطا فرمائے اور جس امتحان و آزمائش سے میں دوچار ہوں اس میں میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ مجھے یقین ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمتیں جاری رہیں تو مارنمر دو میں گلزار پیدا ہوگا اور اگر اسے میری شہادت ہی منظور ہوئی تو یہ جام بھی ستون دار پر مردانہ وار مسکراتے ہوئے نوش کرنے میں مجھے تامل نہیں ہوگا۔ ☆☆ بس پریشانی اور گھبراہٹ کی اس سلسلے میں کوئی گنجائش نہیں۔ آپ بس میری ثابت قدمی کے لئے رب اعزت کی بارگاہ میں دعا کیجئے۔ کبھی دوست و احباب اور بالخصوص جناب امان اللہ خان کو میرا پر خلوص سلام۔

خدا حافظ

والسلام خیر اندیش / محمد مقبول بٹ

کچھ عرصہ قبل مجھے وارڈ نمبر 16 میں منتقل کر دیا گیا ہے جسے جیل کی زبان میں ”پھانسی کوٹھی“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلے تنہائی تھی اب کچھ ساتھ والے قیدیوں سے مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ آئندہ خط پر پتہ لکھتے وقت وارڈ نمبر 16 کا حوالہ نہ بھولنے گا۔ (مقبول بٹ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶ صوفی محمد زمان 25 مئی 1981 کو فوت ہوئے۔ وہ میرپور کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار محاذ رائے شماری کے انتہائی مخلص اور بے لوث کارکنوں میں ہوتا تھا۔ ۲۶ اصل مسرع یوں ہے۔ اک دیا اور بچھا اور بڑھی تاریکی ۳۶ ترجمہ۔ تم بہترین امت ہو جو ظاہر کی گئی ہو لوگوں کی (ہدایت و بھلائی) کے لئے تم حکم دیتے ہو۔ نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان رکھتے ہو فائدہ پر (آل عمران ۱۱۰) ۳۶ سری مگر انتظامیہ نے صدر ہند کو لکھا تھا کہ مقبول بٹ کو رہا نہ کیا جائے بلکہ پھانسی دے دی جائے۔ ۵۶ مقبول بٹ شہید نے اپنا عزم پورا کر دکھایا جب انہیں تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو انہوں نے چہرے پر مکمل سکون کے ساتھ مردانہ وار چل کر پھانسی کے پھندے کو چوم لیا۔

میاں غلام سرور کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی / 17 اگست 1981ء

برادر میاں غلام سرور صاحب / السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ 27 جولائی چند روز قبل موصول ہوا۔ یاد آوری کے لئے
شکریہ۔ یقین کیجئے آپ کے محبت نامے اور اس سے منسلک اخباری تراشوں کو پڑھ کر میری خوشیاں
عید کے اس مبارک موقع پر دو چند ہو گئیں۔ نہ صرف اس لئے کہ آپ نے جس خلوص و محبت کا
اظہار کیا ہے وہ بجائے خود میرے لئے ایک دولت گراں مایہ ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وطن کے اس
حصے سے جس پر حوادث زمانہ نے حکومت ہند کو تسلط و غلبہ سے نوازا ہے کسی فرزند وطن کا میرے نام
اس طویل دور اسیری میں یہ پہلا خط ہے۔ اگر آپ اسے محض خیال آفرینی قرار دیں تو میں یہ کہوں
گا کہ آپ کا خط میرے لئے وطن سے دور اس زندان خانے میں حیات تازہ کا ایک امید افزا پیغام
لے کر آیا ہے۔ اس لئے مندرجات سے قطع نظر میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ یہ خط وطن کی ان
ہواؤں اور فضاؤں سے گزر کر میرے پاس پہنچا ہے جن کی تشنگی دار رو سن کی اس طویل آزمائش میں
میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ آپ غالباً اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک انسان کے دل و دماغ
پر تب کیا گزرتی ہے جب اس کی خواہش کے علی الرغم محض حالات کے جبر کے تحت وطن اور اہل و
وطن سے اس کے رابطہ و تعلق کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہوں۔ درد و غم کا جو انسان اس حالت میں
نشوونما پاتا ہے کی شدت ان لوگوں کے معاملے میں اور بھی بڑھ جاتی ہے جنہوں نے وطن اور اہل
وطن کی عظمت و سر بلندی اور آزادی کے خواب دیکھے ہوں اور ان خوابوں کی تعبیر کے لئے خود کو
وقف کر رکھا ہو۔ ایسے حالات میں درد کی یہ شدت ستم کشوں اور ستم زدوں کے باہمی تعلق کو بگاڑ کر
کس حد تک لے جاسکتی ہے۔ اس کا اظہار مشہور فلسفی جین پال سارتر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"The end of communication is the beginning of all violence, where communication stops, there remains only beating, burning and hanging."

(رابطوں کے منقطع ہو جانے سے تشدد کی بنیاد پڑتی ہے، جہاں رابطہ منقطع کیا گیا وہاں مارنا جلانا اور لٹکانا ہی باقی رہتا ہے۔) ذاتی طور پر وطن اور اہل وطن سے متعلق اپنی امنگوں کی تکمیل کے لئے جدوجہد کے دوران سچائی کے منکرین کے ہاتھوں Beating and Burning (جانے اور مارنے) کے مرحلوں میں سے گزر چکا ہوں۔ اس دوران میرے حوصلوں کو پست کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اب ان کے پاس صرف Hanging (لٹکانے) کا عمل باقی رہ گیا ہے۔ جسے وہ اب آزمانا چاہتے ہیں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کی اس گھڑی میں میرے عزم و ایمان کو قائم رکھے اور مجھے صبر و استقامت سے نوازے، تاکہ امتحان کے اس آخری مرحلے میں میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ آپ کا خلوص و محبت برحق مگر میں خود کو یقیناً اس تعریف و توصیف کا مستحق نہیں سمجھتا جس کا اظہار آپ نے اپنے نامہ گرامی میں کیا ہے۔ جبر و غلامی اور ظلم و عدوان کی علمبردار قوتوں سے معرکہ آراء ہونا انسانیت کا سب سے بڑا شرف ہے۔ دیواستبداد کی جمہوری قباہت کو تارنا کر کے اس کی Monstrosity (انسانیت سوزی) کو نگاہ کرنے کے لئے محکموں کی کو منظم وصف آراء کرنے کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ بنی نوع انسان کی تاریخ۔ خود ہماری اپنی قومی تاریخ کا یہ روشن باب صدیوں سے منور ہے۔ تحریک آزادی کی شمع کو روشن رکھنے کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے پروانوں کی ہمارے یہاں نہ تو پہلے کمی رہی ہے اور نہ آئندہ رہے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس صبر آزما جدوجہد کے دوران کئی بار ایسے مرحلے آئے جب خارجی عوامل کے دباؤ کے تحت کچھ اپنے ہی لوگوں کی مصلحت کو بھی یا پھر چند حلال آزمائشوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہمیں۔

”یہاں گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا“

کی صورت حال کا سامنا رہا ہے۔ مگر قوموں کی زندگی میں ایسے عارضی دور آتے ہی رہتے ہیں۔ انہیں ہرگز دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ قوموں کی زندگی کی اصل روح وہ پائیدار اور تابندہ جذبہ آزادی ہے جو اس کے فرزندوں کو بقول رسول اللہ ﷺ ”ہر جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کا اعلان“ کرنے کا ولولہ عطا کرتا ہے اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ ”یہ بہترین جہاد ہے“۔ آزادی کے اس عظیم جذبے سے سرشار ہو کر ہمارے عوام نے جہاد آزادی کے جس دھارے کو وجود بخشا ہے میں نے خود کو کبھی بھی اس سے الگ نہیں سمجھا ہے۔ اس دھارے کو روکاں دواں رکھنے کے لئے اپنی بے بضاعتیوں اور کمزوریوں کے باوصف میں نے حقیقی المقدوران ذمہ داریوں کو نبھانے کی سعی کی ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میرے شعور و ضمیر نے مجھے جھجھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اپنے ضمیر کی آواز پر حق و باطل کی اس کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ میں سچائی کی علمبردار قوتوں کے ساتھ خود کو Identify (شناخت) کرتے ہیں انہیں نہ تو صلے کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی ستائش کی تمنا۔ حق و باطل کی اس صبر آزما جنگ میں جو اپنی نوعیت کے باعث ہمیشہ طویل المیعاد ہوتی ہے خلیب و فر از آتے رہتے ہیں۔ وقت کا گزرا اور حالات کی ماساعدگی اس شدت کو متاثر تو کر سکتے ہیں مگر اس کو ختم (terminate) نہیں کر سکتے۔ اس جنگ کو اس تمام تر شدت کے ساتھ جاری رکھنا اہل حق کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں تغافل ایک ایسی کیفیت پر منتج ہوتا ہے جس میں انسانیت نہ صرف اپنے وجود کے اصل مفہوم و مدعا سے ہی عاری ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ زندگی کی ترقین و آرائش اور افراد و قوم کو شرف عروج کی معراج تک لے جانے کے لئے کی جانے والی ان مساعی جہیلہ کی رفتار بھی مدہم پڑ جاتی ہے جو ابتدائے آفرینش سے ہی انبیاء علیہم السلام کی سنت، صلحا کا مسلک اور انسانی تاریخ کو مت سے موڑ عطا کرنے والے عظیم انقلاہیوں کا شعار رہا ہے۔ انسانیت کے محسنوں کی اس قبیل میں شامل ہرگز یہ ہستیوں کی ہمسری کا دعویٰ ہمارے لئے چھوٹا مہمہ بڑی بات کے مترادف ہوگا۔ مگر اتنا ضروری ہے کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ہم ان کے اسوۃ کو اپنے لئے مشعل راہ بنا سکتے ہیں اور جب تک ظلم و ستم

کی سیاہ رات کے سائے ہمارے اوپر منڈلاتے رہیں ستون دار پرسروں کے چراغ روشن کرتے چلیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ شعور و ایمان کی پختگی کے ساتھ میدان جہد و عمل میں تواضع و بالحق ۱۶ اور تواضع بالصدر ۲۶ کی عظیم روایت کے امین بنی انسانیت کو خسرو عدوان ۳۶ کے عبرتناک انجام سے بچا سکتے ہیں کیونکہ یہ مشیت ایزدی ہے۔ جہد و عمل میں یہ قدریں پلے بندھی ہوں تو کسم من فدا قلبا غلبہ فدا کثیرۃ ۴۶ کا اعجاز اپنی تمام تر بنا کیوں کے ساتھ ظہور پذیر ہو کر اہل حق کو سرخروئی کی منزلوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ دعا کیجئے کہ خدائے عظیم ہمیں اہل حق کی اسی قبیل میں شمولیت کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ خط قدرے طویل ہو گیا ہے اور ممکن ہے کہ جذبات اور خیالات کی رو میں جو کچھ تحریر کر چکا ہوں، اس سے آپ بور (تک) ہی ہوں مگر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس زنداں خانے میں سوائے جذبات و خیالات کے میرے پاس اور سوغات ہی کیا ہے جو کسی بھی یاد کرنے والے کو پیش کی جاسکے۔ ضروری نہیں آپ کو یہ سوغات پسند ہی آئے مگر میرے حق اظہار کا احترام آپ کو یقیناً ہوگا، اس لئے کہ یہ احترام ہی انسانوں کی روشن خیالی (Enlightenment) کی سب سے بڑی علامت ہے۔ آپ نے میری سزا میں تخفیف کرنے کے لئے نجی طور پر کوشاں ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان کوششوں کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کی ان مساعی کی بنیاد یہ مغروضہ ہے کہ جن ”جرائم“ کا مجھے قصور وار گردانا گیا ہے ان کا ارتکاب میرے سیاسی عقائد کا نتیجہ تھا۔ یہ ”جرائم“ کیا تھے؟ ان کی تحقیقات کیسے ہوئی؟ انہیں بنیاد بنا کر میرے خلاف کن حالات میں کس نوعیت کا ”مقدمہ“ قائم کیا گیا؟ اس ”مقدمے“ کے نام پر قانون و انصاف کی دھجیاں کس طرح اڑائی گئیں اور اس پورے مائلک (ڈرامے) میں کن کن لوگوں نے کیا کیا رول ادا کیا؟ اور اس کے نتیجے میں ”سزا“ کے نام پر مجھے صفحہ ہستی منانے کیلئے کیا کیا ریشہ دوانیاں ہوئیں؟ یہ سب فی الوقت ہمارے عوام کیلئے ایک MYSTERY (معمہ یا راز) ہیں۔ اس داستان کو بیان کرنے کے لئے ایک کتاب درکار ہے اور یہ مختصر سا خط اس کی

تفصیل کا قائل نہیں ہو سکتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب میں اپنے عوام کی عدالت میں اس نام نہاد مقدمے کی ساری حقیقت بیان کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔ اس عدالت کا جس کا ابھی مجھے انتظار ہے۔ اس ضمن میں فیصلہ صحیح اور معقول ہوگا۔ فی الحال میں صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر مقامی انتظامیہ سمجھتی ہے کہ اس نام نہاد مقدمے میں قانون و انصاف کے سبھی تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے تو وہ اس کی ساری کاروائی کو منظر عام پر کیوں نہیں لاتی۔ اس ”مقدمے“ کی فائلوں کو کسی کنواری لڑکی کے پیٹ میں موجود ناجائز حمل کی طرح عوام سے کیوں پوشیدہ رکھا جا رہا ہے۔ یہ کاروائی آج تک قوم کا شیر پوشیدہ ہی ہے۔ آپ کے خط سے منسلک اخباری تراشوں کو پڑھ کر مجھے اس صدائے احتجاج کا اندازہ ہوا ہے جو میری ”سزا“ پر مجوزہ عمل درآمد کے خلاف عوامی سطح پر بلند کی گئی ہے۔ اس کے لئے میں ان سبھی عوامی رہنماؤں، سرکردہ شخصیتوں، اداروں و ران سے وابستہ کارکنوں کا ممنون و احسان مند ہوں جو اس سلسلے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان سب تک اظہار تشکر کا میرا پیغام ضرور پہنچا دیجئے گا۔

یہاں میں اس طویل خط پر اظہار رائے ضروری سمجھتا ہوں جو سرینگر نامنر میں اسی اخبار کے ایک سابق شمارے میں آپ سے متعلق اس اخبار کے مدیر محترم کے ریمارکس کے جواب میں آپ کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ آپ نے ایڈیٹر موصوف کے ان ریمارکس پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ آپ کے خط کی ہر سطر درمیں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اصد احترام یہ عرض کروں گا کہ میرے معاملے میں آپ کے نجی احساسات اور مساعی اپنی جگہ برحق اور ان کے لئے میں خلوص دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے معاملے کا سب سے اہم پہلو یعنی اس کا پبلک پہلو آپ کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ اس قسم کے معاملات کے پبلک پہلو کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کرنے کی آپ پر تہمت تو نہیں لگائی جاسکتی مگر جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے آپ کی اپنی صوابدید کے مطابق اس سلسلے میں خاموشی کے ساتھ کام کرنے کو آپ نے زیادہ موزوں سمجھا ہے۔ ایک پبلک ورکر ہونے کے حوالے سے اگر ایڈیٹر موصوف اس سلسلے میں آپ

سے گلہ مند ہیں اور وہ اس کا اظہار کرتے ہیں تو آپ کو رنجیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی دل میں ملال کو جگہ دینی چاہیے۔ اس لئے کہ ہر اس شخص سے جو پاپک ور کر ہونے کا مدعی ہو، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ظلم اور نا انسانی کے خلاف کھلے بندوں اور عوامی سطح پر صدائے احتجاج بلند کرے۔ پس اس معاملے میں فریاد کی کامظاہرہ کیجئے۔ میری صحت بفضلِ ایزدی بالکل ٹھیک ہے اور سزائے موت کی اس کوٹھری میں جسے قیدیوں کی زبان میں ”پھانسی کوٹھی“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جہاں مجھے اس برس مئی کے آخری ہفتے میں منتقل کیا گیا تھا لحات اسیری یا یوں کہئے لحات زندگی صبر و شکر کے ساتھ گزرا رہا ہوں۔ چونکہ مجھے تاحال اس سیکورٹی وارڈ میں واپس نہیں بھیجا گیا جس میں مجھے گذشتہ پانچ برس سے مقید رکھا گیا تھا، اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ سرکار نے میری ”سزا“ پر عمل درآمد کے فیصلے پر تاہنوز نظر ثانی نہیں کی ہے۔ اس لئے حالات جوں کے توں ہیں۔ دیکھئے اب کے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔۔۔ آخر میں ایک بار پھر آپ کی یاد آوری کا شکریہ۔ مجھے امید ہے کہ مراسلت کا یہ سلسلہ جو آپ نے رسمی شناسائی نہ ہونے کے باوجود شروع کیا ہے آئندہ بھی جاری ہے گا اور آپ کا ہے گا ہے مجھے یاد کرنے کی تکلیف ضرور کیا کریں گے۔ آپ کو اور آپ کی وساطت سے سبھی اہل وطن کو میرا خلوص بھر اسلام۔

فقط آپ کی دعاؤں کا طلب گار / محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶۴ جو ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہیں (سورہ العصر) ۲۶۴ جو ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے رہیں (سورہ العصر) ۳۶۴ نقصان اور خالص ظلم۔۔۔۔۔ مقبول بٹ شہید نے قرآن حکیم کی سورہ العصر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حق کو قبول کرنا اور اس راہ میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا دونوں باتیں داعیانِ حق کے لئے ضروری ہیں اور یہی لوگ انسانیت کو عبرتِ ناک انجام سے بچا سکتے ہیں۔ ۶۴ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غلبہ حاصل کر گئیں (القرآن)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ملک غلام سرور کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/ 15 اگست 1981ء

محترم غلام سرور صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ اور دیگر سبھی دوست و احباب خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا خط مورخہ 23 جون اور برادر مرمان صاحب کا نوازش نامہ مورخہ 29 جون عید الفطر کی ساعت سعید پر ایک ساتھ ملے۔ آپ حضرات کا یاد آوری کے لئے شکریہ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کاروبار کو ترقی دے اور جن مقاصد کی حصول یابی کے لئے آپ دیر غیر میں مصروف جہد ہیں ان کی تکمیل کے لئے وہ ذات باری آپ کو زیادہ سے زیادہ توفیق و استطاعت سے نوازے۔

آپ نے سپریم کورٹ میں ”سزا“ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کے بارے میں جو مشورہ دیا ہے اس کی صورت یہی ہے کہ اس سلسلے میں ایک رٹ درخواست دائر کر دی جائے۔ یہ تو میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا کہ اس کا فیصلہ کیا برآمد ہوگا مگر میرا خیال ہے کہ کوشش Worth Trying (انتہائی کوشش) ہے۔ میرے برادر اصغر جولائی کے وسط میں مجھ سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ بھی اس موضوع پر تبادلہ خیال ہوا تھا۔ میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں سرینگر میں اپنے چند وکیل دوستوں سے مل کر ابتدائی کارروائی کریں۔ مگر آپ کو کیا بتایا جائے کہ ابھی تک میرا دستخط شدہ وکالت نامہ بھی ان تک نہیں پہنچنے پایا ہے۔

خیر آمد برسر مطلب۔ آپ نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کرنے کے لئے اخراجات کو پورا کرنے کی جو پیشکش کی ہے اس کے لئے میں آپ کا ممنون ہوں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا ہی کہ دنیا کے اس خطے میں سوائے انسان کے ہر شے گرانی کی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس قانونی

کاروائی پر جس کا ہم سوچ رہے ہیں۔ 15 اور 20 ہزار کے درمیان خرچہ اٹھے گا۔ یہاں کی سپریم کورٹ کا کوئی بھی سینئر وکیل 3 ہزار سے کم فی پیشی وصول نہیں کرتا۔ پیپر ورک اور اسسٹنٹوں کے خرچے الگ ہوتے ہیں۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر سپریم کورٹ یا صدر ہند نے میری موجودہ ”سزا“ میں کٹوتی کر بھی لی تو اس کے بعد سرینگر میں میرے خلاف (پس پردہ) Behind the back جو مقدمہ برسوں سے زیر سماعت ہے اس کو بھی عدالت عالیہ میں چیلنج کرنا ہوگا۔ اس پر بھی یقیناً اچھا خاصہ خرچہ اٹھے گا۔ آئندہ کی اس قانونی لڑائی کے لئے جس کا میں نے اشارنا ذکر کر لیا ہے اچھے وکلاء کی خدمات درکار ہوں گی۔ اس لئے اگر آپ سے ممکن ہو تو فی الحال آپ کم سے کم 20 ہزار روپے کا انتظام کر کے یا تو برادر مر غلام نبی کے نام پر بھیج دیں اور اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہیں تو جیل کے پتے پر میرے نام بذریعہ بینک ڈرافٹ یا جو بھی آپ مناسب صورت سمجھیں ارسال کر دیں۔ آپ کی طرف سے جواب ملتے ہی اس سلسلے میں مزید اقدام ممکن ہوگا۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی اور طریقہ کار مناسب ہے تو اس سے مجھے مطلع کریں۔ اس لئے کہ باہر کی دنیا سے میرا ربط و تعلق واجب ہے۔

برادر مر غلام صاحب نے گذشتہ دسمبر میں لکھے گئے کسی طویل خط کا ذکر کیا ہے۔ یہ تو مجھے تاہنوز نہیں ملا ہے اور نہ اب اس کے ملنے کی توقع ہے۔ نمبر دار صاحب کی وفات پر میری جانب سے ان کے سبھی لواحقین اور پسماندگان سے اظہار تعزیت کیجئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جو رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر و شکر کی نعمت سے نوازے۔ والدہ محترمہ کو میرا سلام اور پروین بھابی کے لئے بھی سلام۔ ننھی منی کے لئے میری جانب سے بہت بہت پیار۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ تاہنوز میں وارڈ نمبر 16 میں ہی مقید ہوں۔ گمان غالب یہی ہے کہ میری ”سزا“ پر مجوزہ عمل درآمد کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند ہوئی ہے اس کے پیش نظر فی الحال اس معاملے کو اتواتو میں ڈال دیا گیا ہے۔ آگے جو فیصلہ منظور ہوگا۔ میں نے خود کو کوئی ذنی طور پر ہر قسم کی (صورت حال) Situation کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ اور آپ سے اس دعا کا تمنا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کے

ان آخری مرحلوں میں میرے صبر و ثبات کو قائم رکھئے اور اس سلسلے میں مجھ سے کوئی لغزش نہ ہونے پائے۔

والسلام/ آپ کے دعاؤں کا طالب/ محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

راجہ محمد مظفر خان کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سینٹرل جیل نئی دہلی/ 15 اگست 1981ء

عزیز: مظفر راجہ سلمہ

سلام مسنون!

آپ کا نامہ محبت مورخہ 27 جولائی چند روز قبل عید الفطر کی سامیت سعید کے موقع پر موصول ہوا۔ یاد آوری کے لئے شکریہ۔ میرے بارے میں آپ کی پریشانی اور تشویش برحق مگر آپ کو یہ حقیقت کبھی بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ جس منزل کی طرف ہمارا مختصر سا کارواں جادہ پیا ہے اس کی حصول یابی ایثار و قربانی کی اعلیٰ و ارفع روایتوں کی متقاضی ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں جس میں ہم نے خود کو کامل شعور و تدبیر کے ساتھ صف آراء کر رکھا ہے، جانوں کا نذرانہ پیش کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیائے آزادی کے لئے مجنوں کا جنون اتنا ہی ضروری ہے جتنا حفظ جان کے لئے گردش خون۔ انسانیت کو بھسم کرنے والے ظلم و جبر کے انگاروں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آتش نرو میں بے خطر کودنے کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ صلیب کو بوسہ دئے بغیر انجیل آگہی کے اوراق کھلنے پائیں۔ وہ لوگ جو چپائی اور شرف انسانی کا شعور رکھنے کے باوجود جادہ حق میں پیش آنے والی صعوبتوں اور آزمائشوں سے گھبرا جاتے ہیں، جن کے قدم اس راہ عمل میں ڈگمگا جاتے ہیں۔ دراصل اس لگن اور عشق کی رسوائی کا سامان فراہم

کرتے ہیں جس کے وہ بظاہر مدعی ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو خدا کی کتاب میں مغضوب علیہم ☆۱ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم میں سے کسی کو بھی انسانوں کے اس گروہ میں شامل نہ کرے۔ آمین۔ حق شناسی اور خدا پرستی کا دعویٰ رکھنے والوں کے لئے بہترین زندگی وہ ہے جو سچائی کا شعور حاصل کرنے اور اس شعور کی روشنی میں انفرادی و اجتماعی زندگی کی تزئین و آرائش میں صرف ہو اور بہترین موت وہ ہے جو ظلم و جہالت سے انسانوں کو نجات دلانے کے لئے کی جانے والی جنگ میں پیش آئے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مرنے کے بجائے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ انسان سچائی کے منکرین سے برسر پیکار ہوتے ہوئے اپنے مقاصد زندگی کے لئے تختہ دار پر جان کا نذرانہ پیش کرے۔ جہاں فکر کا یہ انداز ہو وہاں نہ تو صلے کی طلب ہوتی ہے اور نہ ہی ستائش کی تمنا۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ آپ اور آپ جیسے دیگر دوستوں، عزیزوں اور ساتھیوں کا بے پایاں خلوص اور لا زوال محبت نفسا نفسی کے اس عالم میں بھی مجھے حاصل ہے۔ اس امتیاز کے ہوتے ہوئے اور کس چیز کی تمنا کی جاسکتی ہے؟

آپ نے میرے اخراجات ڈاک کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں لہذا اس بارے میں فکر مند نہ ہو جائیں۔ چونکہ آپ نے خدا کا واسطہ دیا ہے ☆۲۱ اس لئے اس ضمن میں طریقہ کار کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ آپ جیل خانے میں میرے پتے پر سپر انٹنڈنٹ جیل کی معرفت بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کے ذریعے جب چاہیں اور جتنا چاہیں پیسہ بھیج سکتے ہیں۔ ڈرافٹ ایسے بینک کے ذریعے آتا چاہیے جس کی یا تو دلی میں شاخ ہو یا کسی دوسرے بینک کے ساتھ اس کا کاروباری لین دین ہو۔ بفضل ایز دی میری صحت ٹھیک ہے اور نامہ تحریر میں بدستور وارڈ نمبر 16 سی میں مقید ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری ”سزا“ پر مجوزہ عمل درآمد کے خلاف وطن کے طول و عرض میں بلندی جانے والی صدائے احتجاج کے پیش نظر ”وقت کے حاکموں“ نے فی الحال اس معاملے کو انٹوائس ڈالنا موزوں سمجھا ہے۔ دیکھئے آگے یہ

اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ آزمائش کے ان آخری مرحلوں میں مجھے استقامت کی دولت سے نوازے اور اس قدر توفیق عطا فرمائے کہ میرے پائے ثبات میں کسی قسم کی لغزش نہ آنے پائے۔

والسلام/ آپ کے خلوص و محبت کا طلب گار / محمد مقبول بٹ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

۱۶ھ جن پر خدا کا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے، ”قرآن حکیم میں غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کے الفاظ آئے ہیں جہاں ایمان والوں کو مغضوب اور ضالین کے راستے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ۱۶ھ ۲ روپہ مظفر خان نے بٹ صاحب کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھا تھا کہ اگر آپ کو پیسے بھیجتا ہوں تو طریقہ کار کیا ہوگا۔ اسی لئے بٹ صاحب نے طریقہ کار کی وضاحت کی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ملک محمد سرور کے نام
بسم اللہ الرحمن الرحیم

زندہاں دہلی/ 20 جون 1982ء

برادر سرور صاحب

السلام علیکم

کافی عرصے کے بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ یہ بات نہیں کہ آپ کو بھول گیا تھا مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ آپ تک خیریت ناموں کی رسائی کچھ محذوش ہی بنادی گئی تھی۔ وہ کہاوت آپ نے سنی ہوگی، جس میں باسی کڑھی میں بال بال آنے کا ذکر ہے۔ آپ نے قانونی چارہ جوئی کے لئے 22 ہزار کی رقم کیا بھیجی کہ اس کی وصولی کے سلسلے میں ”خدائی فوجداروں“ کی خاموشی اور غشٹی کڑھی میں ایک دم گرم گرم بال آگیا۔ معاملہ چونکہ بالکل دائرہ قانون کے اندر تھا اس لئے وہ دستبرداشت نہ کر سکے البتہ رخنہ اندازی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ پہلے تو بینک ڈرافٹ

سپرائنڈنٹ کی معرفت Safe Custody کے نام پر اپنے پاس ضبط کر لیا اور چیک کیش کرانے میں لیت و لعل کرتے رہے۔ جب چھ ماہ ہونے کو آئے تو میں نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کرانے کے ساتھ ہی بھوک ہڑتال شروع کر دی تب جا کر مارچ ۸۳ء کے وسط میں وہ اسے کیش کرانے پر رضا مند ہوئے۔ چیک کیش کرنے کے بعد رقم کی ادائیگی کا سوال آیا تو پھر تال منول شروع کر دی مگر اس دوران میں نے دکھا کی ایک ٹیم کو Engage کر لیا اور رقم کی ادائیگی کے لئے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کر دی۔ اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔ ابتدائی تیاری کے لئے دس ہزار کی رقم دکھا، کوڈے چکا ہوں اور دہلی سے میرے ایک وکیل ریکارڈ کا جائزہ لینے کے سرینگر گئے ہوئے ہیں وہ اس ماہ کے آخر تک واپس آئیں گے اور اپنے ہمراہ ضروری دستاویز کی نقول وغیرہ بھی لائیں گے۔ تب تک سپریم کورٹ کی موسم گرما کی تعطیلات بھی ختم ہو جائیں گی۔ پھر مناسب مشورہ کر کے رٹ درخواست دائر کر دی جائے گی۔ ویسے میرے دکھا، خاصے پراسید ہیں اور وہ اس قانونی لڑائی کیلئے مختلف انواع چارہ جوئی کے لئے رضا مند ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو جولائی کے وسط تک ضروری تفصیلات سے مکمل آگاہی دینے کی پوزیشن میں ہو سکوں گا۔ لندن سے جناب زیر صاحب نے پچاس پونڈ کا ایک انٹرنیشنل منی آرڈر بھیجا تھا وہ مل گیا اور کیش بھی ہو گیا البتہ آپ نے گذشتہ برس 540/- روپے کا جو بینک ڈرافٹ نمبر ODC-1069052 مورخہ 16 April 1981 سٹیٹ بینک آف انڈیا کے نام پر ارسال کیا تھا وہ تاحال کیش نہ ہو سکا۔ اول تو اس کی معیاد گزر چکی ہے۔ یعنی یہ Lapse ہو گیا ہے۔ دوم یہ کہ ”ضبط کرنے والوں“ کو اب یہ اپنی فائلوں میں مل ہی نہیں رہا ہے۔ اس لئے کہ اس دوران یہاں کے ”تحویلدار“ بدل چکے ہیں۔ آپ اپنے بینک حکام سے بات کریں اگر وہ اس ”گمشدہ“ ڈرافٹ کی جگہ دوسرا ڈرافٹ ارسال کر سکتے ہیں یا رقم کو کسی اور انداز میں منتقل کر سکتے ہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ ویسے میں براہ ذیل حکام پر اسے Trace کرنے کے لئے دباؤ جاری رکھوں گا۔ آپ حیران ہوں گے کہ 18 دسمبر کا لکھا ہوا آپ کا خط مجھے مارچ کے آخر میں مل گیا وہ بھی شاید اس لئے کہ روکنے

والوں کی نظروں سے بچ گیا ورنہ حال یہ ہے کہ گزشتہ اکتوبر کے بعد سے اب تک میرے نام آنے والے سبھی خطوط ”خدائی فوجداروں“ کی ”کرم فرمائیوں“ کی نذر رہ چکے ہیں کیا خوب ”بال“ آیا تھا۔ یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ برادرِ مہم ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کے برادرِ اکبر ملک آفتاب صاحب اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ لا اللہ وانا الیہ راجعون۔ میری جانب سے انہیں تعزیت کا پیغام ضرور پہنچائے گا۔ ویسے میں براہِ راست انہیں خط لکھ کر اس سلسلے میں اظہارِ تعزیت کروں گا مگر کیا معلوم کہ ان تک یہ پہنچ بھی پائے؟ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جو اررحمت میں جگہ دے اور ان کے سبھی پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میری صحت بفضلِ ایزدی بالکل درست ہے اور یامِ اسیری صبر و شکر کے ساتھ گزار رہا ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ جس قانونی چارہ جوئی کا ہم آغاز کر رہے ہیں اس کے خاصے سیاسی مضمرات ہیں۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ اسے مناسب طور اور پوری استعداد کے ساتھ تمام وسائل یکجا کر کے بھرپور طریقہ سے منظم کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے آپ کو کچھ اور Contribution کرنا پڑے۔ اس کے بارے میں میرے دکھلاء کے سرینگر سے یہاں آنے اور مجھ سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی میں آپ کو تفصیل سے بتا سکوں گا۔ جب تک آپ ذاتی طور پر اس کے لئے تیار رہیں۔ آپ سے انشاء اللہ براہِ رابطہ قائم رہے گا۔ سبھی دوست احباب اور عزیز واقارب تک میرا پر خلوص سلام پہنچائے گا۔

والسلام / آپ کی دعاؤں کا طالب / محمد مقبول بٹ

۱۶۷ یہ وکلاء شہیدِ خوبہ عبدالغنی کون المی وکیٹ اور پیارے لال ہنڈ وائی وکیٹ تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر فاروق حیدر کے نام بسم اللہ الرحمن الرحیم

تہاڑ جیل دہلی / 8 ستمبر 1983ء

براہم فاروق حیدر صاحب / السلام علیکم / کافی مدت کے بعد وسط اگست میں آپ کا وہ خیریت نامہ ملا جو ماہ جولائی کے آغاز میں آپ نے سپرد ڈاک کیا تھا۔ خط کیا تھا مختصر نویسی کا ایک ماہر نمونہ۔ کل ملا کر چالیس الفاظ پر مشتمل 4 عدد جملے جن میں سے دس الفاظ صرف القاب و آداب اور سلام و خیریت کی نذر ہو گئے تھے۔ یقیناً ماننے طبیعت عیش کرانچی۔ شاید آپ نے سوچا ہو کہ اختصار کے باعث اس خط کا ”سفر“ بھی مختصر ہی رہے گا۔ مگر آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ”یار لوگ“ اللہ سے بھی عشق کی ایک ادا سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ پس الفاظ یا مین السطور کوئی کام کی بات معلوم کر سکیں۔ بہر حال ڈیڑھ ماہ بعد ہی سہی پھر بھی یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ آپ کا نامہ محبت وصول تو ہوا۔ خط کو رجسٹر کر کے بھیجنے کا تکلف بے جا ہے اسلئے کہ ملنے تو کبھی کبھی محترم حصول صاحب کے ”بک پوسٹ“ خط بھی مل جایا کرتے ہیں۔ پس وہ خطوط جن کا مقدر ہی مقدروں کے خداؤں کی قربان گاہ پر بھیجت چڑھنا ہوتا ہے، انہیں ڈاک کی رجسٹری جیسے مراسم کی روانگی کیسے بچا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں بالکل خیریت سے ہوں اور آپ کی اور دیگر دوست و احباب کی خیریت کے لئے دست بدعا، شرمندہ ہوں کہ طویل عرصے سے آپ کو اپنی خیریت کی اطلاع نہ دے سکا۔ اس میں کچھ مجبوریوں اور کچھ مصلحتوں کا دخل رہا۔ بہر حال امید کرتا ہوں کہ اس ضمن میں آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ یہاں کی سپریم کورٹ میں قانونی چارہ جوئی کے لئے ہماری مساعی کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا ہے۔ 12 اگست کو عدالت کے ویژن بیج نے چیف جسٹس کی سربراہی میں ہماری وہ رٹ درخواست منظور کر لی جس میں ہم نے ریاستی حکومت اور ہائی کورٹ کے نام پر ہدایت جاری کرنے کی التجا کی تھی کہ وہ ان

مقامات کا ریکارڈ برائے معائنہ و ملا حظہ فراہم کرے جن کی پاداش میں رواں اسیری اور ”سزا“ جاری ہے۔ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ☆ ۲ Aggrieved party ہونے کے باوصف اس ریکارڈ کو خود ہم سے پوشیدہ رکھنے کے لئے State نے کیا کیا عذر تراشے ہیں اور گزشتہ دو برس سے اس سلسلے میں لیت و لعل کر کے ہماری کوششوں کو کس طرح ☆ ۳ Frustrate کیا ہے۔ بہر حال ہماری جدوجہد جاری ہے اور غریب ہی اس سلسلے میں اگلا قدم ریکارڈ کے معائنے کے بعد اٹھایا جائے گا۔ جب یہ مرحلہ آئے گا آپ کو ضروری معلومات فراہم کروں گا۔ پروگرام یہ ہے کہ ریکارڈ کے معائنے کے بعد ضروری دستاویزات حاصل کر لی جائیں اور پھر مقدمے کی کارروائی کی قانونی جوازیت کو چیلنج کیا جائے۔ ہمارے دکا کا خیال ہے کہ کیس خاصا مضبوط ہے۔ اپنی کاوش جاری رہے گی۔ نتیجہ بہر حال اللہ پر چھوڑ رکھا ہے۔ آپ سے اس ضمن میں دعاؤں کا طلب گار ہوں۔ میری جانب سے تمام دوست و احباب کو نلوں و محبت سے بھرپور سلام۔

والسلام/آپ کا بھائی/محمد مقبول بٹ

نوٹ: اگر شوکت کا F.Sc کا نتیجہ آیا ہو تو اس کی اطلاع ضرور دیجئے گا۔ کچھ عرصہ قبل منزہ بیٹی کا ایک خط ملا تھا۔ ☆ ۴ نہ معلوم جوانی خط ان تک پہنچا کہ نہیں۔ بہر حال سچی اہل خانہ کو میری طرف سے سلام۔ بچوں کے لئے بہت بہت پیار (مقبول بٹ)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆ ۱ خلیل حکام اور بھارتی ایجنسیاں ☆ ۲ وہ فریق جسے دکھ اور رنج پہنچا گیا ہو۔ ☆ ۳ کام ہٹا، بے اثر کیا ☆ ۴ افسوس کہ منزہ کے نام مقبول بٹ شہید کا خط دستیاب نہ ہو سکا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خواب گر

بہت طویل تھی شب ہر طرف اندھیرا تھا
فصیل جبر نے ہر ذی نفس کو گھیرا تھا
عروج ظلم سے چنگیزیت پشیمان تھی
و قار آدمی کا خاک پر بسیرا تھا
اس زمین پر وہ خواب گر ہوا پیدا
کہ جس کی آنکھ میں اک مٹلی سویرا تھا
ردائے قید کو دی فوقیت جو پھولوں پر
فراز دار پر قائم رہا، اصولوں پر
سفیر جادہ منزل اُسی ڈگر پر چلا
قدم قدم ہے جہاں آگ کے گولوں پر
اس کا سخن طلوع صبح کی بشارت تھی
ندائے رفتہ کو آئندہ کی بصیرت تھی
وہ بے سپر کہ بہت جس کے عزم کے آگے
غروب وقت کی تقدیر میں ہزیمت تھی
طویل نیند سے خاک وطن کی بیداری
اُسی کے دست ہنر ساز کی کرامت تھی
چراغِ آرزوئے حریت جلا کے گیا
حسین خواب نئی نسل کو تھا کے گیا! بشیر الحسن

شہید بابائے قوم محمد مقبول بٹ کے بارے میں چند ہستیوں کے احساسات و جذبات۔

۱۔ میں مقبول بٹ کی سزاے موت کی منسوخی کیلئے جرم کی درخواست نہیں کرتا بلکہ صدر ہند کو یا ددلا رہا ہوں کہ بھارت کی آزادی کی جدوجہد میں کسی بھارتی لیڈر گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد یا سبھاش چندر بوس یا خود بھارتی صدر کو برطانوی آقاؤں نے موت کی سزا نہیں دی تھی۔

(آزادی فلسطین کے سربراہ شہید یاسر عرفات)

۲۔ مقبول بٹ نہ تو دہشت پسند ہے اور نہ ہی قاتل بلکہ وہ ایک عظیم حریت پسند ہے اور اپنے وطن کی آزادی کیلئے لڑ رہا ہے۔ حریت پسندوں کو پھانسی پر لٹکا نا مہذب اقوام کا شیوہ نہیں ہے۔

(لیبیا کے صدر جناب کرنل قذافی)

۳۔ آج کشمیری قوم اپنے عظیم قائد و رہنما سے محروم ہو گئی ہے۔ مقبول بٹ شہید کی موت مرا ہے۔ مٹر بٹ کی موت سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ مشکل سے ہی دھرا ہوگا۔ (صدر پاکستان شہید جنرل محمد ضیاء الحق)

۴۔ کشمیری حریت پسند مقبول بٹ ضمیر کا قیدی ہے جو اپنے وطن کی آزادی کیلئے ہر سر پیکار ہے۔

(ایم۔ سی۔ این۔ بی۔ سی۔)

۵۔ شہید مقبول بٹ کی عظیم قربانی کا اعزاز ہے کہ عالمی سیاست کے افق پر کشمیری عوام کے وقار اور اعتبار کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ (جی ایم میر۔ این ایل ایف)

۶۔ بیشتر لوگ زندگی ہی میں مر جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھی مقبول بٹ ان سچے اور کھرے انسانوں میں سے ایک ہیں جو تختہ دار کو چوم کر شہادت کا اعلیٰ رتبہ حاصل کر کے ہمیشہ پوری کشمیری قوم کی دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ کشمیری آنے والی نسلیں اپنے محسن اور شہید قائد پر صدیوں فخر کرتی رہیں گی۔ (ایڈوکیٹ عبدالخالق انصاری)

۷۔ پھانسی پر لٹکا نے سے شہید محمد مقبول بٹ کی آواز کو دبا نا بھارت سرکار کیلئے ممکن نہیں۔ یہ پھانسی ان کی رسوائی اور کشمیری آزادی کا باعث ہوگی۔ (مرحوم صوفی محمد اکبر)

فکر مقبول سے چند اقتسابات

”میں ایک بات بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ جو لوگ اپنی کوشش سے دو وقت کی روٹی بھی نہیں کما سکتے وہ کسی قوم کو آزادی کی منزل سے کیسے ہمکنار کر سکتے ہیں“

”انقلابی جدوجہد کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ جو بہت فطری ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان پر چلتے رہیں تو بالآخر کامیابی آپ کی ہوگی۔ اگر کہیں خلاف ورزی ہو یا ان سے انحراف ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اسی صورت میں شامل حال ہوتی ہے جب آپ صحیح مقصد کے لئے صحیح راستہ اختیار کریں اور اس پر مسلسل چلتے رہیں۔“

سرینگر کی ایک عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔
”تمہارے نزدیک کسی قوم کو غلام بنالینا اچھا فعل ہے۔ جبکہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں اور میں غاصب اور مملہ آؤر قوم کے خلاف جدوجہد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو تمہیں گوارہ نہیں۔ اس سے مزید میرے پاس کچھ نہیں“

”انسان کا ایمان اور جذبہ عمل قائم رہے تو ہزار کامیوں اور حوصلہ شکنی کے باوجود حصول مقصد کی مسرتیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔“

گجراٹ خواہ کس میں عدالتی کارروائی کے دوران بطل حریت نے کہا۔
”میں نے نہ کوئی سازش تیار کی ہے اور نہ ہی سازشیوں کے کسی گروہ میں شامل رہا ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں فرسودگی، دولت پسندی، استحصالی، ظلم، غلامی، اور منافقت کے خلاف بغاوت کا مرکز بن گیا ہوں۔“

”میں نے زندگی کے ہر موڑ پر سچ و انصاف کا ساتھ دیا ہے اور ظلم و استیصال کے خلاف جنگ میں مصروف عوام کی نہ صرف حمایت کی ہے بلکہ اس جنگ میں مظلوم عوام کا نقیب اور مدعی رہا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے لئے یہ رول متعین کیا ہے، اسلئے کہ میں اسے انبیاء علیہم السلام کی سنت اور انقلاہیوں کا شیوہ تصور کرتا ہوں“

”جب ہر زندہ چیز کو ایک دن مرنا ہے تو پھر اس سے کیا ڈرا۔ میں ہونٹوں پر مسکرا بیٹھیں لیے چٹائی کا سامنا کروں گا۔ زندگی سے بہت پیار کیا ہم موت سے بھی محبت نہایتیں گے۔ ہمیں بڑے دل اور ذلیل دشمن سے بڑے بڑے سلوک کی توقع رکھنی چاہئے۔“

”آزادی کی قومی تحریکوں کو عدالتی فیصلوں کی مدد سے اگر روکا جاسکتا تو دنیا کی شاید ہی کوئی قوم آزاد ہوتی۔“

محمودی کو پرامن طور پر برداشت کرنا، مجموعی زندگی کا عظیم ترین جرم ہے۔ ”جدوجہد کا میدان یقیناً ایک کسوٹی ہے، جو حق کے طلبہ داروں اور باطل پرستوں کو ہی نہیں بلکہ منافقین کو بھی اصل مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔“

”آزادی سے ہمارا مطلب کشمیر کی دھرتی سے غیر ملکی تسلط کا خاتمہ ہی نہیں بلکہ بھوک، افلاس، بیماری اور معاشی و سماجی ناہمواری کو شکست دینا بھی ہے۔ ہم ایک دن یہ آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔“

”ہم دوستوں کی اعانت کے متمنی ہیں، لیکن ایسی جو باہمی عزت و تقار کی بنیاد پر استوار ہو ہم دوستی چاہتے ہیں، کسی کی بالادستی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔“

”میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام کیا ہو سکتا ہے کہ حالات کی ماساعدگی اور وقت کا تبر نہ

صرف یہ کہ ان شمعوں کو بجھانے میں ماکام رہا جنہیں ہم نے خون دل سے روشن کیا، بلکہ ان جلتی شمعوں سے اور بھی کتنے ہی چراغ روشن ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب ان چراغوں کی روشنی سارے وطن کو منور کرے گی اور نتیجتاً وہ کیفیت برپا ہوگی جسے ہم بجا طور پر آزادی کا چراغاں کہہ سکیں گے۔“

”حق پرستی اور حق شناسی کا دعویٰ رکھنے والوں کے لئے بہترین زندگی وہ ہے جو سچائی کا شعور حاصل کر لے اور اس شعور کی روشنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی ترقی و آرائش میں صرف ہو۔“

”کچھ ”جرم“ ایسے ہیں جن کا ارتکاب اہل عزم و ایمان کے لئے باعث صداقت رہتا ہے ان میں یقیناً جرم ضعیفی شامل نہیں جس کی سزا مرگ و مافات ہوتی ہے۔ البتہ بغاوت کا وہ جرم ضرور شامل ہے جو غلاموں میں سوز یقین پیدا کرتا ہے۔ اس جرم کے ارتکاب پر اظہارِ اندامت نہیں اظہارِ مسرت کیا جانا چاہیے۔“

”اپنی زندگی کی آخری خواہش کے طور پر اپنے نظریاتی ساتھیوں سے کہوں گا کہ حالات خواہ کتنے ہی بدترین کیوں نہ ہوں وہ ثابت قدم رہیں اور مشترک مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے رہیں۔“

”بسترِ مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے بجائے حد درجہ بہتر ہے کہ انسان سچائی کے منکرین کے خلاف برسرِ پیکار رہ کر اپنے مقاصد کیلئے تختہ دار پر جان کا نذرانہ پیش کرے۔ حق کے مقابلے میں باطل تو تیں بظاہر کتنی ہی طاقتور تو تھا کیوں نہ ہوں آخر کار انہیں شکست ہی ہوتی ہے اور سچائی اپنا وجود منوا کر ہی رہتی ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت میرے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ صحیح راہ پر آگے بڑھتے چلتے جائیں اور ادھر ادھر نہ بھٹکیں۔ اگر آپ نے اصلی راہ چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلنا شروع کر دیا اور اس طرح اصولوں سے انحراف کیا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت کی توقع نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت صرف اس صورت میں شامل حال ہوتی ہے جب آپ صحیح مقصد کے لئے صحیح راستہ اختیار کر کے اس پر مسلسل چلتے جائیں۔

ایک اصولی بات کی وضاحت کر دوں کہ انقلابی جدوجہد کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں جو بہت فطری ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان پر چلتے رہیں تو بالآخر کامیابی ہوگی، اگر کہیں ان کی خلاف ورزی ہو یا ان سے انحراف ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ اگر ہمیں بھی کوئی ماکامی ہوئی تو اس میں یقیناً ہماری کوتاہیوں کا دخل ہوگا۔

مذہب کو نظر انداز کر کے سماجی زندگی کی تمام اخلاقی بنیادیں منہدم ہو جائیں گی۔ میرا مذہب ہی مطالعہ اگرچہ بہت تھوڑا ہے مگر پھر بھی اس نے میری شخصیت کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

جہاں آدمی کے اصول اور نظریہ کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں انجام کی پروا کئے بغیر آزمائش کے ہر دور سے خندہ پیٹنی کے ساتھ گزرنے میں بھی ایک طرح کی راحت ملتی ہے

جب تو منزل کی جانب چلتے چلتے تھک جاتی ہے اور سنانے کے لئے آرام کرتی ہے تو فکر کی منزل سے دور ہو جاتی ہے۔ اُن میں صرف زبان دانی اور ایک دوسرے کی مخالفت کا رواج بڑھ جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆